۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء

۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں جن مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اور اپنے جہادی عمل اور انقلابی کلام سے ملک میں بغاوت کی آگ پھیلائی۔ انگریزوں کی فرعونی طاقت سے مقابلہ کیا۔ اور اس کی پاداش میں گولیوں کا نشانہ بنے، پھانسی پر چڑھائے گئے۔ ان شہیدوں کے حالات اس کتاب میں درج ہیں۔

از

مولانا امداد صابری

مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی

بار اوّل — اکتوبر ۱۹۵۹ء

تعداد — ۱۰۰۰

قیمت

چھ روپے ۹۴ نئے پیسے

فہرست مضامین

ضمیمہ

معنون

میں "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" کو اپنے سیاسی رہبر حضرت مولٰینا نورالدین بہاریؒ کے نام سے معنون کرتا ہوں۔ جن کی سیاسی بصیرت خوددارانہ و مجاہدانہ اور مصائب و آلام سے بھری ہوئی زندگی، بے لوث خدمات، اور بے مثل قربانیاں اپنی نظیر آپ تھیں۔ ان ہی مقدس و بابرکت انسان کی رہنمائی میں میں نے سیاسی زندگی شروع کی۔ اور جو کچھ سیکھا ان سے سیکھا اور حاصل کیا۔ ان کی پدرانہ سلوک و محبت رہ رہ کر یاد آتے ہیں۔ ان کی یاد زندگی کے آخری لمحہ تک باقی رہے گی۔

میں اللہ رب العزت سے ملتجی ہوں کہ مجھکو بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

امداد صابری

معاونین و ناشر کا شکریہ

دہلی کے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور و معروف اور کہنہ مشق جناب فیروز محمد خاں (فیروز آرٹسٹ) کا میں بیحد ممنون ہوں کہ اُنھوں نے اپنے دادا میجر پیر محمد خاں کے کاغذات میں سے تاریخی اور نہایت نایاب تصویریں مولانا امام بخش، خان بہادر خاں، مولانا کفایت علی کافیؔ اور کالے خاں گولنداز، مولوی فیض احمد رسوا بدایونی اور مولوی نسیم اللہ نسیمؔ کی عنایت فرمائیں، جس سے کتاب کی اہمیت اور زینت بڑھی۔

فیروز صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ دہلی کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد فتح محمد خاں دہلی کے مشہور بلڈنگ انجینیر تھے میرٹھ کا گھنٹہ اُنہی کی یادگار ہے۔

اسی کے ساتھ میں محمد یوسف صاحب جامعی مدیر شاہراہ اور مالک مکتبہ شاہراہ کا احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" کی پہلی جلد اپنے مصارف سے شائع فرمائی۔ میں نے اِس پہلی جلد کے تمام حقوق بلا معاوضہ بلئے جناب محمد یوسف صاحب کو دیئے ہیں۔ وہ ہی آئندہ بھی اِس کتاب کو چھاپنے کے مجاز ہیں۔

یہ بھی حق تلفی نہیں بلکہ زیادتی ہوگی کہ میں سید شبیر الدین صاحب اشرفی منیجر مکتبہ شاہراہ دہلی کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے اس کتاب کی کتابت و طباعت اور خاص طور پر جبکہ کاغذ بہت ہی کمیاب ہو کاغذ کی فراہمی کی کوشش فرمائی وہ قابلِ تحسین ہے۔ خدائے تعالیٰ اس کام کا اجر دے گا۔

امداد صابری

۱۸ نومبر ۱۹۵۹ء

محلہ چوڑیوالان ۔ دہلی

حضرت مولٰنا نور الدین بہاری مرحوم و مغفور

مولٰنا نور الدین بہاری جیسا نڈر، حق گو، بے غرض مخلص انسان پیدا ہونا مشکل ہے۔ فی زمانہ تو خلوص حق گوئی اور خودداری کا فقدان ہوتا جا رہا ہے۔

حضرت مولٰنا نور الدین بہاری کی پیدائش سنہ ۱۹۰۵ء میں ضلع مونگیر (بہار) کے گاؤں موہنی میں ہوئی۔ آپ نے کانپور میں ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی، معقیلات کی تعلیم خاص معقولات مولٰنا ماجد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جینپور ضلع علی گڑھ میں حاصل کی تھی۔ آپ کا شمار دار العلوم دیوبند کے نہایت ممتاز و لائق طلباء میں تھا۔ علم حدیث و تفسیر آپ نے علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ سے حاصل کیا تھا۔

دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے اپنے گاؤں کے قریب ایک اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو ملازمت سے مستعفی ہو کر قومی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ تحریک خلافت میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ایک عرصہ تک امارتِ شرعیہ بہار سے وابستہ رہے مولٰنا ابو المحاسن محمد سجاد مرحوم کی معیت اور رفاقت میں اس ادارہ کی نمایاں خدمات انجام دیں۔

مولینا مرحوم جہاں رہے وہاں شمع انجمن بن کر رہے۔ آپ نے بنگال کے ایک مقام سیواڑہ (بیر بھوم) میں قیام کیا اور ایک دینی درسگاہ قائم کی۔ اور مسجد تعمیر کرائی۔ اور اس علاقہ کے لوگوں کو ایسا فیض پہنچایا کہ وہاں آج تک ان کی اور ان کے کارناموں کی یاد تازہ ہے۔ یہ مدرسہ ابتک قائم ہے اور اس مدرسہ کا نام اپنے بڑے صاحبزادہ کے نام پر ضیاء العلوم رکھا تھا سیواڑہ کے عوام و خواص ان کی قابلیت، خلوص اور خودداری زندگی کے واقعات عقیدت سے بیان کرتے ہیں۔

مولینا مرحوم دہلی میں ۱۹۲۰ء میں تشریف لائے۔ اور سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے۔ مگر ان کی سیاسی فہم و بصیرت، علمی لیاقت اور قوت خطابت کی دھاک ۱۹۳۰ء میں لوگوں کے دلوں پر بیٹھی۔ اسی سال آپ کو گرفتار کرکے اٹک جیل میں بھیج دیا گیا۔ چھ ماہ کی سزا اسی جیل میں پوری کی۔

۱۹۳۲ء میں حضرت مولینا نور الدین بہاری تحریک سول نافرمانی میں گرفتار ہو کر دو سال کے لئے سزایاب ہوئے اور نیو سنٹرل جیل ملتان بھیج دئیے گئے۔ آپ کے جیل کے ساتھی حضرت العلامہ مفتی کفایت اللہ صاحب مولینا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی۔ لالہ دیش بندھو گپتا۔ لالہ شنکر لال مسٹر آصف علی مرحومین " کشور رکھنہ وکیل۔ مولینا احمد سعید صاحب دہلوی مولینا عبد السلیم صدیقی۔ مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی۔ دیوداس گاندھی تھے

جب ۱۹۳۰ء میں کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی اور جمعیتہ العلماء ہند نے بھی اس تحریک میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ تو۔

جمیعۃ نے دہلی میں قانون شکنی کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ ہر جمعہ کو جمیعۃ کا ڈکٹیٹر بعد نماز جمعہ جامع مسجد سے ایک جلوس لے کے روانہ ہوتا تھا۔ اور راستہ میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں پولیس اُسے گرفتار کر لیتی اور باقی جلوس کو لاٹھی چارج کر کے منتشر کر دیتی تھی۔

مولٰنا عبدالحلیم صاحب صدیقی نے ایک جمعہ کو اعلان کیا کہ ان کی گرفتاری کے بعد جمیعۃ کے ڈکٹیٹر مولٰنا نورالدین صاحب بہاری ہوں گے مولٰنا عبدالحلیم صاحب صدیقی کی گرفتاری کے بعد جمیعۃ کے ڈکٹیٹر مولٰنا نورالدین بہاری دہلی تشریف لائے۔ مولٰنا مرحوم کو دہلی پہنچنے پر دہلی حکومت نے ایک نوٹس تعمیل کرایا کہ وہ ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر دہلی کی سرحد سے باہر نکل جائیں۔ ورنہ ڈھائی سال کی قید اور ایک ہزار روپے جرمانہ کی سزا کے مستحق ہوں گے مولٰنا نورالدین بہاری اس نوٹس کو لے کے دہلی میں کہیں اِدھر اُدھر ہو گئے پولیس کی ضد اور ارادہ تھا کہ مولٰنا کو جمعہ کی نماز سے قبل ہی گرفتار کر لے اور مولٰنا مرحوم اس کوشش میں تھے کہ اُن کی تقریر بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں ہو۔ اور جلوس حسب دستور ضرور نکلے۔ یہ مسئلہ حکومت اور جماعت کے وقار کا سوال بن گیا۔ اتنے میں جمعہ کا دن آ گیا اور مولٰنا نورالدین بہاری مرحوم اللہ اکبر کے گونجتے ہوئے نعروں میں جامع مسجد کے مکبّر پر نمودار ہوئے۔ دہلی کے باشندوں نے مولٰنا کی تقریر بڑی دلچسپی سے سُنی۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے بقول مولٰنا مظہر سعید صاحب ران پر ہاتھ مارتے ہوئے یہ فرمایا۔

"دہلی کے ڈپٹی کمشنر نے مجھے دہلی سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ اس کی

حقیقت میری نظروں میں ایک پتوے زیادہ نہیں ہے۔ میں آج دہلی میں موجود ہوں، اور اس حکم کو اس طرح مسل کے میں نے پھینکدیا تھا جیسے کوئی پتو کو مسل کے پھینکدیتا ہے۔"

اس کے بعد مولینا مرحوم ایک جلوس کے ساتھ جامع مسجد سے روانہ ہوئے۔ یہ جلوس چاندنی بازار، حوض قاضی ہوتا ہوا جب لال کنویں پہنچا تو پولیس نے جلوس کو روکا اور لاٹھی چارج کیا۔ اس میں مولینا کے معمولی ضرب آئی۔ جلوس منتشر ہوگیا۔ مولینا کو گرفتار کر کے جیل بھیجدیا گیا۔ مولینا مرحوم کو دو سال کی سزا ہوئی۔

زمانہ اسیری میں مولینا صاحب کی رفیقۂ حیات کی انتقال کی خبر جیل میں آئی۔ جیل کے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ پیرول پر رہا ہونے کیلئے درخواست دیدیجئے تاکہ آپ بچوں کی دیکھ بھال کا انتظام کرآئیں۔ آپ نے فرمایا میں خود حکومت سے درخواست نہیں کرونگا۔ اگر خود بخود یہ مجھکو پیرول پر رہا کریگی تو چلا جاؤنگا۔ بچوں کا اصل محافظ اللہ ہے۔ جیل میں جب آیا تھا تو بچوں اور بیوی کو اللہ کی حفاظت میں چھوڑ آیا تھا۔ بیوی کو اللہ نے اپنے پاس بلالیا، ان کی مرضی۔ بچوں کی حفاظت بھی انہی کے سپرد ہے۔ جس طرح چاہیں رکھیں۔ پرورش کرائیں۔"

مولینا مرحوم نے سزا کے دن زیادہ تر نیو سنٹرل جیل ملتان میں گذارے آپکے اس جیل کے ساتھی حضرت العلامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، مولینا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی۔ لالہ دیش بندھو گپتا صاحب۔ مسٹر

آصف علی صاحب مرحوم - لالہ جگل کشور صاحب وکیل - مولینا احمد سعید صاحب دہلوی، مولینا عبدالحلیم صاحب صدیقی، مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی، دیو داس گاندھی، فرید الحق انصاری، پنڈت نیکی رام شرما، مولینا عارف ھسوی، مولینا عطاءاللہ شاہ بخاری، منشی عبدالقدیر صاحب، مولینا اسمٰعیل سنبھلی، مولوی مظہر علی اظہر وکیل وغیرہ حضرات تھے۔

دو سال سزا کاٹنے کے بعد آپ ملتان جیل سے ۱۹۳۲ء کے آخر میں دہلی تشریف لائے۔ آپ نے بیری والے باغ باڑہ ہندو راؤ میں سکونت اختیار کی اور بیری والے باغ کی مسجد میں تفسیر قرآن بیان کرنا شروع کی۔

دہلی میں کیا ہندوستان کے مفسروں کا دستور تھا اور ہے کہ وہ مسجد کے مہتموں سے ماہانہ تنخواہ وصول کرتے تھے اور کرتے ہیں۔ کوئی اس زمانہ میں سو روپے ماہانہ لیتا تھا کوئی ڈیڑھ سو۔ کوئی دوسو میں اللہ کے کلام کو فروخت کرتا تھا جب حضرت مولینا نورالدین نے اس مسجد میں تفسیر بیان کرنا شروع کی تو مہتمم مسجد نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ کو تفسیر کے سلسلہ میں کیا پیش کیا جائے۔ آپ نے فرمایا۔ میں کلام اللہ بیچنا نہیں چاہتا۔ سلف صالحین کا یہ دستور نہیں تھا اس سے علماء کی توہین اور علم کی تذلیل ہوتی ہے۔ میں کچھ نہیں لونگا۔ جب مولینا کی اس عالمانہ بے نیازی کا دہلی میں چرچا ہوا۔ تو دہلی کے مفسروں میں بل چل مچی۔ اُنھوں نے اپنی جھینپ اور خلاف شرع طریقے کو دبانے اور مٹانے کے لئے مسجدوں کے مہتموں اور متولیوں کے ذریعہ زور ڈلوایا کہ مولینا تفسیر قرآنی کا معاوضہ لیں۔ متولیوں نے بیحد اصرار کیا۔ مگر مولینا اس بات کے لئے

تیار نہیں ہوئے۔

حضرت مولینا نورالدین کو زکوٰۃ خیرات اور نذرانے اور عطیوں سے بھی بڑی نفرت تھی۔ وہ اپنی کمائی کی آمدنی سے گذارا کرنے کے عادی تھے۔ اگر کوئی ان کو زکوٰۃ خیرات اور نذرانے کے روپے دینا چاہتا تھا تب اس کو بری طرح دھتکار دیا کرتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایک پنجابی جو زمیندار اور پرہیزگار اور خدا پرست ہیں اور آج کل پاکستان میں سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ غالباً حاجی ذکریا ان کا نام ہے۔ انھوں نے مولینا کو ایک مرتبہ تقریباً پانچ ہزار روپے دینے چاہے اور دیتے وقت کہا کہ یہ روپے زکوٰۃ خیرات کے مد کے نہیں ہیں میری خواہش ہے کہ آپ ان کو قبول کرلیں۔ شاید میری آخرت میں کام آجائیں مولینا صاحب حاجی ذکریا کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ آپ نے ان سے کہا۔ حاجی صاحب میں اپنی زندگی اپنی کمائی کی آمدنی سے گزارنی چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے مجھکو یہ روپے دیدئیے تو میں جو کام کرنا چاہتا ہوں اس میں سستی آجائیگی اور میں نذرانوں کا عادی بن جاؤں گا۔ میں یہ گوارا نہیں کرسکتا۔ حاجی ذکریا نے بہت اصرار کیا طرح طرح سے سمجھایا۔ لیکن مولینا نے وہ رقم لینا گوارا نہیں کی۔

مولینا نورالدین بہاری بیری والے باغ کے مکان کی ایک بیٹھک میں جوتے کا کاروبار کرتے تھے۔ ایک مفسر قرآن کا یہ ذریعہ معاش دیکھکر لوگ تعجب کرتے تھے۔ اور ان کی بے نیازی کا ہر شخص معترف، مداح، اور بیحد متاثر تھا۔

شیخ محمد یامین مرحوم اسی محلہ میں رہتے تھے لکھپتی حیثیت کے مالک تھے روزانہ مولانا مرحوم کا وعظ سنتے تھے۔ اور مولانا کے کارخانہ میں بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ مولانا کا کام معمولی تھا۔ شیخ صاحب نے مولانا سے کہا کہ اس کارخانے کو بڑے پیمانے پر چلائیے۔ اور جو کچھ مجھ سے خدمت ہو سکے گی میں اس کے لئے حاضر ہوں شیخ صاحب نے مولانا مرحوم سے کئی مرتبہ سرمایہ لگانے کا اشارہ کیا۔ یہاں تک بھی جتا دیا کہ میری کارخانے میں شریک ہونے کی خواہش نہیں ہے۔ جو روپیہ لگے گا اس کا طلبگار بھی نہیں ہونگا۔ لیکن مولانا نے انکی باتوں پر توجہ نہیں دی۔

شیخ محمد یامین صاحب کو معلوم تھا کہ امداد صابری سے مولانا کے گہرے تعلقات ہیں اور مولانا ان کی بات کو ٹالتے نہیں۔ شیخ صاحب مجھ امداد صابری کے پاس آئے اور انھوں نے چھ ہزار روپے مجھکو دیئے کہ آپ مولانا کو اپنے طور پر دیدیجئے۔ کہ وہ اپنے کاروبار میں لگائیں۔ میں مولانا کے پاس گیا۔ اور مولانا سے عرض کیا کہ یہ روپے حاضر ہیں۔ کارخانے کے کام کو بڑھائیے۔ اگر نفع ہوگا تو خیر۔ نقصان کی صورت میں کوئی مطالبہ نہیں کیا جائیگا۔ مولانا مسکرائے اور کہا۔ تم کو کس نے آلہ کار بنایا ہے۔ جاؤ اس کو روپے جاکر دیدو۔ مجھے زیادہ سرمائے کی ضرورت نہیں ہے۔ جتنی مجھکو ضرورت ہوتی ہے اس کاروبار سے خدا کا فضل ہے مل جاتا ہے۔ اور میں اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پال لیتا ہوں۔ اس لئے مجھے مزید سرمایہ کی ضرورت نہیں ہے میں مولانا سے کہتا رہا کہ مجھکو کسی نے آلۂ کار نہیں بنایا ہے کیا آپ میری حیثیت

سے واقف نہیں ہیں کہ میں یہ رقم آپ کی خدمت میں پیش نہیں کر سکتا۔ اتنا گیا گذرا آپ مجھکو سمجھتے ہیں۔ مولینا نے بڑی متانت سے فرمایا۔ صابری میں تم سے اتنی غلط بات کی امید نہیں رکھتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم کو کس مخلص ہمدرد نے روپے دیئے ہیں۔ ان کی نیت بخیر ہے۔ ان کی مہربانی کا شکریہ ادا کرنا۔ مولینا کو میں نے کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔ جو واقعہ تھا من وعن سنا دیا۔ مولینا نے فرمایا۔ مجھ سے شیخ صاحب بہت عرصہ سے اس بات کی خواہش کرتے تھے لیکن میں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اور نہ ضرورت سمجھی، اس لئے میں نے روپیہ نہیں لیا۔

قرآن مجید اس کائنات کی سب سے عزیز متاع ہے اس کا صحیح مقام انسانوں کا قلب و دماغ ہے جہاں سے عمل اور حرکت کی لہریں اٹھتی ہیں۔ اس سے قومیں زندہ کی جاتی ہیں۔ اور امتیں گرمائی جاتی ہیں۔ یہ وہ دستاویز انقلابی ہے اور یہ وہ منشور جہاں بانی ہے جو سرکشوں کے لئے دعوت بغاوت ہے۔ اس کے الفاظ تیر ہیں جو منکرین کے سینہ کو چھلنی کرتے ہیں۔ اس کا مفہوم طاغوت اور شیطانوں کے فریب کاریوں کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں کے حوصلے بڑھاتا ہے۔ اور ان کے دل سے ماسوا اللہ کا سارا رعب اور مقابل کا خوف نکالتا ہے۔ چنانچہ مولینا نورالدین بہاری قرآن پاک کی تفسیر اسی شان کے ساتھ فرماتے تھے اور اس کے انقلابی نکات اسی انداز سے بیان کرتے تھے کہ سننے والوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جاتے تھے۔ اور حکومت برطانیہ کے ظالمانہ طریقے کے

خلاف جذبات بھڑک اُٹھتے تھے۔ مولیٰنا کی تفسیر بیان کرتے وقت کافی سی آئی ڈی کے آدمی موجود رہتے تھے۔ جو اُن کی روزانہ کی تقریر کے مفہوم سے افسران کو مطلع کرتے تھے۔ حکومت بظاہر تفسیر قرآنی کو منع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن باطن اس کو وہ کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں مولیٰنا کو حکومت نے چھ ماہ کے لئے جلا وطن کر دیا تھا۔ مولیٰنا دہلی والوں سے انتہائی وابستہ ہو گئے تھے چنانچہ انھوں نے غازی آباد کی ایک مسجد میں قیام کیا۔ غازی آباد دہلی سے بہت قریب ہے۔ مولیٰنا کے پاس دہلی والے روزانہ آتے جاتے تھے۔ اور وہیں بیٹھ کر مولیٰنا دہلی والوں کے لئے پروگرام بنا کر بھیجتے تھے۔ غازی آباد کی مسجد میں بھی مولیٰنا نے تفسیر کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ دہلی والوں کی طرح غازی آباد کے لوگ بھی مولیٰنا کی تفسیر کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ اور تفسیر سننے کے لئے قرب و جوار کے دیہات کے لوگ جوق در جوق آتے تھے۔

مولیٰنا مرحوم جب غازی آباد سے جلا وطنی کے ایام گذارنے کے بعد دہلی میں تشریف لائے، تو اس وقت سی۔ آئی۔ ڈی میں محمد صادق ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مامور تھے۔ افسران سے مولیٰنا کو معلوم ہوا کہ جہاں آپ کی تفسیر حکومت برطانیہ کے لئے ننگی شمشیر ثابت ہو رہی تھی وہاں یہاں کا وہ طبقہ جو تفسیر قرآنی کے نام پر لوگوں سے تنخواہیں بٹورتا تھا اُن میں ایک ذات شریف کے ڈپٹی محمد صادق صاحب سے تعلقات تھے۔ اُنھوں نے اپنی دکان کو چمکانے اور مولانا کے کاروبار کو ختم کرنے کے لئے ڈپٹی صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی، کہ مولیٰنا کو تھوڑے عرصہ کے لئے دہلی سے باہر بھیج دیا

جائے۔ چنانچہ ڈپٹی محمد صادق نے اس ثقہ صورت کی بات بھی رکھی۔ اور مولینا کو دہلی سے چھ مہینے کے لئے جلاوطن ہونے کا حکم تعمیل کرا دیا۔ اس شازشی واقعہ کا مولینا کے دہلی کے احباب کو پوری طریقے سے علم ہے کہ وہ کون سے مفسر قرآنی ہیں۔

مولینا نورالدین بہاری مرحوم نے غازی آباد سے دہلی میں آنے کے بعد اپنا سابقہ کاروبار شروع کیا۔ لالہ شنکر لال آنجہانی نے دہلی میں کانگریسی ورکروں کی ایک جماعت بنائی تھی۔ اس کا دفتر دریبہ کلاں میں تھا جس کے کرتا دھرتا لالہ شنکر لال اور مولینا نورالدین بہاری تھے۔ اس زمانہ میں لالہ دیش بندھو گپتا کے گروپ کا کانگریس پر قبضہ تھا۔ دوسرا گروپ لالہ شنکر لال صاحب کا تھا۔ جو حقیقتًہ دہلی میں کانگریس کو جنم دینے والوں میں تھا۔ اس کانگریسی ورکروں کی جماعت کے ذریعہ لالہ شنکر لال گروپ نے ۱۹۳۶ء میں صوبائی ضلع کانگریس کمیٹی کا الیکشن لڑا ممبر سازی کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس میں مسلمان ممبر یا کام کرنے والے انگلیوں پر گننے کے قابل تھے۔ چنانچہ مولینا نورالدین بہاری کے علاقے باڑہ ہندو راؤ میں مسلمان کانگریس کے ممبر ڈیڑھ ہزار کے قریب بنے اور جامع مسجد کے علاقہ میں جس میں راقم الحروف امداد صابری نے ممبر سازی کی تھی تین ہزار سے زیادہ تعداد تھی۔ غیر مسلم علاقوں اور خاص طور پر دیہات میں جہاں سابقہ کانگریسی جھانکتے بھی نہ تھے ممبر سازی کی گئی۔ کانگریس کے اغراض و مقاصد بتائے۔ ہزاروں کی تعداد میں دیہات میں بھی ممبر بنے اور اس طرح دیہات میں مسلمانوں میں نئے کام کرنے والے کافی تعداد میں پیدا ہو گئے۔

اس محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ لالہ شنکر لال صاحب کا گروپ برسر اقتدار
آگیا۔ دہلی کانگریس پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ لالہ شنکر لال صاحب صوبہ کانگریس
کمیٹی کے صدر، اور مولینا نور الدین بہاری ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر، لالہ
رادھا رمن ضلع کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری اور راقم الحروف امداد صابری
سکریٹری منتخب ہوا۔ صوبے اور ضلع کی ورکنگ کمیٹی کے ممبران مولینا
میمع اللہ قاسمی صاحب، مولینا عبد اللہ فاروقی، چودھری حکم سنگھ، گوپال پرشاد
خورشید احمد کاظمی، ہر سروپ شرما، بابو رام ورما، بہال سنگھ وغیرہ منتخب
ہوئے۔ اور ۱۹۳۶ء کے انتخاب میں مولینا نور الدین صاحب صدر اور
راقم الحروف جنرل سکریٹری منتخب ہوا جن کی وجہ سے حقیقتاً دہلی کی سیاست
میں ایک جان آئی۔ کانگریس کے جلسوں میں دیہاتی لوگ اور شہری مسلمان
کثرت سے آنے لگے۔ دیہات میں باقاعدہ گاؤں وار شاخیں کھلنے لگیں
شاندار جلسے ہونے لگے۔ دیہاتوں پر لگان کی وصولی یابی جس ظالمانہ طریقوں
سے ہوتی تھی اس کے خلاف جلسوں میں تجویزیں منظور کی جاتی تھیں جس کے
جواب میں دہلی کے ڈپٹی کمشنر صاحب کا جس گاؤں میں دورہ ہوتا اس کے دوسرے
روز کانگریس کی میٹنگ ہوتی اور ڈپٹی کمشنر صاحب کے گمراہ کن پروپگنڈہ کا
اثر زائل کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے علاقوں میں بھی تیزی کے ساتھ کام شروع
کیا گیا۔ میونسپل کمیٹی عوام پر زیادتیاں کرتی اس کے خلاف جلسے کئے
جاتے۔ جلوس نکالے جاتے اور میونسپل کمیٹی پر مظاہرے ہوتے تھے جس
میں دہلی کے تمام طبقے شریک ہوتے تھے۔ ان کاموں کے لئے کانگریسی

کارکنوں نے اصلاح میونسپل کمیٹی قائم کی تھی۔ میونسپل کمیٹی پر ڈپٹی کمشنر اور ان کے حامیوں خان بہادر عبداللہ، حاجی رشید احمد اور خان بہادر حبیب الرحمٰن کا قبضہ تھا۔ ان کا ساتھ کانگریس کے ممبران بھی کافی سے زیادہ دیتے تھے یہ ممبران لالہ دیش بندھو گپتا کی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ جو ضلع کانگریس کمیٹی اور صوبہ کانگریس کمیٹی کی ہدایات پر عمل نہیں کرتے تھے۔ لیکن کانگریسی کہلاتے تھے ان سے بھی مقابلے ہوتے تھے۔ جلوس زیادہ تر جامع مسجد کے علاقے سے نکالے جاتے تھے۔

مولینا نورالدین بہاری جماعتی ڈسپلن پر بہت زور دیتے تھے۔ اس لئے کہ وہ خود ڈسپلن کے پابند تھے۔ ذرا سی غلطی پر جواب طلب کر لیتے تھے۔ وہ اس معاملہ میں پارٹی بازی سے بہت اونچے تھے۔ اگر اپنے آدمی سے غلطی ہو جاتی تھی تو اس کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ بلکہ سخت باز پرس ہوتی۔

مولینا مرحوم روزانہ کی آمدنی خرچ کا حساب لیا کرتے تھے۔ شام ہوتی اور انھوں نے حساب دیکھا، اور اس پر اپنے دستخط کئے اور لقایا رقم خود سنبھلواتے اور تالا لگا کر کنجی مجھکو دیدیا کرتے تھے۔

ایک روز مولینا مرحوم نے حساب دیکھا۔ رقم گنی تو ان میں دس روپے کم تھے۔ ریزگاری روپے اور نوٹ بار بار گنے۔ لیکن رقم پوری نہیں ہوتی تھی دس روپے کا فرق پڑتا تھا۔ مولینا مرحوم کو مجھ پر بڑا اعتماد تھا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ آپ نے رقم وصول کی اور تجوری کو کھلا چھوڑ دیا۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ اس سے جماعت کی ساکھ کو دھکا لگتا ہے۔ مولینا

مرحوم یہ الفاظ فرما رہے تھے کہ ان کے ہاتھ میں میٹنگوں کی کارروائی کا رجسٹر آیا اس کو انھوں نے کھولا تو اس میں دس روپئے کا نوٹ رکھا ہوا تھا انھوں نے خود اس میں سے نکالا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

انگریزوں نے دہلی کے ساتھ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد انتقامی سلوک کیا تھا۔ اور دہلی کے صوبہ کو جس میں یو پی کے علاقے اور ہریانہ صوبہ شامل تھا۔ تقسیم کر دیا تھا۔ جہاں دہلی بنانے کے مطالبے کو منوانے کے لئے صوبہ کانگریس کمیٹی نے ۱۹۳۰ء میں ایک احتجاجی دن منایا تھا جس میں ہڑتال کرنے کا بھی پروگرام تھا۔ ہڑتال کو ناکام کرنے کے لئے حکومت نے عوام میں خوف و ہراس پھیلانے کے لئے سبزی منڈی پر تقریباً صبح کے وقت تین سو کے قریب کانگریسی لیڈروں اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ شہر میں جوش پھیل گیا۔ ہڑتال کامیاب ہوئی جس سے حکومت کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ مطالبہ خوفناک شکل اختیار نہ کر لے۔

دہلی کے چند مسلمانوں کی سرکاری ٹولی نے شیوسندر کی تحریک کو جو بڑی یہ تحریک خالص فرقہ وارانہ تھی۔ اس میں کچھ مسلمان اور ہندو کانگریسیوں نے بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ مولینا نے جب سنا تو فوراً ان سے جواب طلب کیا کچھ نے معافی مانگی۔ کچھ نے اکڑ دکھائی۔ مولینا نے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی۔ اور کانگریس سے ایک ایک دو دو سال کے لئے نکال دیا۔

مولینا نورالدین بہاری فرقہ پرستی کے سخت ترین دشمن تھے۔ اور اس کو قوم اور ملک کے لئے انتہائی تباہ کن سمجھتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ فرقہ وارانہ

فسادات اور جھگڑے فرقہ پرست لیڈر اور رہنما کراتے ہیں اپنے اقتدار کے لئے عوام میں فرقہ وارانہ جذبات کو ابھار کر قتل و غارت گری کا باعث بنتے ہیں۔ اس کا مقابلہ قوم پرست طبقہ کو کرنا چاہیئے۔ اور فرقہ پرستوں کی قلعی عوام میں کھولنی چاہیئے۔

چنانچہ مولینا نورالدین بہاری نے جب سنا کہ کمرہ نیل کے مندر اور بلیماران کے مسلمانوں میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ دونوں طرف سے پتھراؤ کیا جا رہا ہے تو مولینا نورالدین بہاری نے دفتر میں جو لوگ موجود تھے ان کو بلا کر کہا چلو اب وقت ہے عوام کو سمجھانے کا اور فساد جھگڑے کو ختم کرانے کا۔ اس جھگڑے کو روکو۔

چنانچہ مولینا نورالدین بہاری، رام دھارمن، چودھری حکم سنگھ، پنڈت ہرسروپ شرما، خورشید احمد کاظمی، راقم الحروف امداد صابری، رانگے لال، گوپال پرشاد، شریمتی ستیہ وتی، مولانا ادریس وغیرہ نیچے اترے۔ اور کمرہ نیل کے ہندوؤں اور بلیماران کے مسلمانوں کو جو پتھراؤ کر رہے تھے جا کر سمجھایا کہ تمہارے لڑنے سے ملک اور قوم کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ شیو مندر کا جھگڑا مہا دہلی کی تحریک کو ختم کرنے کے لئے حکومت نے پیدا کیا ہے۔ اور حکومت ۷ جولائی کی ہڑتال سے بوکھلا گئی ہے۔ اس لئے سرکار پرستوں کے ذریعہ یہ فتنہ برپا کیا گیا ہے۔ اس سے تم کو بہت نقصان ہوگا۔ یوں گھنٹے تک لوگوں کو سمجھایا۔ اس سمجھانے کے دوران میں لالہ رام دھارمن موجودہ ممبر پارلیمنٹ کا سر پھٹا۔ مولینا نورالدین کے سینہ پر آ کر پتھر لگا۔ راقم الحروف امداد صابری کے پاؤں میں پتھر سے سخت چوٹ آئی۔ لیکن ہم لوگوں نے

چوٹ لگنے اور زخمی ہونے کی پرواہ نہیں کی۔ ان کو سمجھانے کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جھگڑا ختم ہوا۔ اور شیو مندر کی تحریک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

آج کے موجودہ زمانہ کے سیاستی، اور ۱۹۴۷ء کے بعد کے پیدا کردہ کانگریسی خواہ وہ کانگریس کمیٹی صوبہ دہلی کے صدر رہے ہوں یا سکریٹری اور ورکنگ کمیٹی کے ممبران ہوں، فرقہ پرستی کو ختم کرنے کے بجائے اس کو ہوا دیتے ہیں۔ اور جھگڑے کے دوران میں اگر جو طبقہ مظلوم ہوتا ہے اس کے خون سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان میں چودھری بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں فرقہ پرستی شباب پر ہے۔ اور کانگریسی عوام کے دلوں میں قابل ملامت سمجھے جاتے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں بجلی کمپنی دہلی پونے تین آنے یونٹ کے بجائے پانچ آنے یونٹ کرنا چاہتی تھی جس سے عوام کو بہت زیر بار ہونا پڑتا تھا۔ اور بجلی کمپنی جو انگریزوں کی ملکیت تھی وہ بجلی سے کافی روپیہ پیدا کر رہی تھی۔ کمپنی کو ایک یونٹ دفتر وغیرہ کے اخراجات سمیت زیادہ سے زیادہ تین پیسہ میں پڑ رہا تھا جس کے وہ پونے تین آنے لینے پر بس نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اضافہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اصلاح میونسپل کمیٹی جس کا صدر راقم الحروف امداد صابری اور جنرل سکریٹری حمید الدین ممبر مرحوم تھے۔ اس کمیٹی نے بجلی کے نرخ کے اضافہ کے خلاف آواز اٹھائی۔ بلکہ مطالبہ یہ کیا کہ نرخ کم ہونا چاہیئے۔ بجلی کمپنی کے اہتمام میں ٹرام وے بھی چل رہی تھی۔ عوام کی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے

سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ۷ جولائی کو ٹرمیوے کا بائیکاٹ کیا جائے اس میں کوئی سواری نہ بیٹھے۔ چنانچہ ۷ جولائی کا دن آیا۔ اس دن مولینا نورالدین بہاری کو صبح ہی آٹھ بجے کانگریس کمیٹی کے دفتر سے گرفتار کرلیا۔ اسی وقت اخبار وطن دہلی نے اپنا ایک ضمیمہ شائع کیا۔ اس روز کیا ہوا۔ ہڑتال کیسی کامیاب رہی۔ وہ وطن اخبار کی زبانی سن لیجئے۔ اس کی تین سرخیاں تھیں۔

(۱) "مولینا نورالدین بہاری کی گرفتاری۔ دہلی میں ٹرمیوے کا بائیکاٹ۔

(۲) پولیس نے کانگریس کے دفتر میں جاکر مولینا کے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنادی اور بلا وارنٹ گرفتار کرلیا۔

(۳) شہر والوں نے ٹرمیوے کا بائیکاٹ کردیا۔ بائیکاٹ کمیٹی کے ساتھ پولیس کا جلوس تھا۔ تانگے والوں کا زبردست انتظام۔

دہلی ۷ جولائی۔ آج ٹرمیوے بائیکاٹ کا دن ہے صبح ہی سے بائیکاٹ کمیٹی نے کانگریسی جھنڈوں اور والنٹیروں کے ساتھ شہر میں گشت شروع کردیا۔ جلوس میں مولینا امداد صابری صدر اصلاح میونسپل کمیٹی، بھال سنگھ، شریمتی ستیہ وتی دیوی، مسٹر مکند لال جوہری، مسٹر مادھو سروپ شرما، دیگر اصلاح میونسپل کمیٹی، اور مقامی کانگریس کے لیڈر اور والنٹیر شریک تھے۔ یہ جلوس شہر کے بڑے بڑے بازاروں سے ٹرمیوے بائیکاٹ کی تلقین کرتا ہوا اور قومی نعرے لگاتا ہوا گذرا۔ جلوس کے آگے پیچھے پولیس تھی۔ جن کے ہاتھ میں لٹھ تھے۔

صبح آٹھ بجے کے قریب پولیس نے کانگریس کمیٹی کے دفتر پر چھاپہ

مارا۔ اور مولینا نورالدین بہاری کو گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے وقت پولیس نے وارنٹ دکھلانے سے انکار کر دیا۔ اور مولینا کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کر کوتوالی لے گئی۔ پولیس کی بھاری تعداد چاروں طرف تعینات تھی۔

اصلاح میونسپل کمیٹی کی طرف سے اہل شہر کی سہولت کے لئے تانگوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ سینکڑوں تانگوں پر سرخ جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ تانگوں کا نرخ ٹرامویز اسٹیشنوں تک ایک پیسہ سواری مقرر کیا گیا تھا۔ تانگوں کی باقاعدہ دیکھ بھال ہو رہی تھی۔ صبح صدر بازار میں تانگے والے ٹرامویز بائیکاٹ کی آوازیں لگا رہے تھے۔ کچھ لڑکے بھی جمع ہو گئے اور اُنھوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ دو چار پولیس والے آ گئے۔ اُنھوں نے تانگے والوں پر ڈنڈا بازی کی اور دس بارہ تانگے والوں کے نام لکھ کر ان کا چالان کر دیا۔ ٹرامویز کمپنی کے منیجر نے پولیس سے شکایت کی کہ مولینا نورالدین بہاری نے ایک تانگہ ٹرام سے ٹکرانے کی تلقین کی۔ جس پر پولیس نے انہیں زیر دفعہ ۱۴۳ گرفتار کر لیا ہے۔ شہر میں ہر طرف امن و امان ہے کسی جگہ ٹرام والوں اور پبلک کے آدمیوں کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ ٹرامویز خالی چل رہی ہے۔ اور ایک ایک ٹرام میں نصف درجن کے قریب پولیس کے سپاہی بٹھا دیئے گئے ہیں۔ باقی آدمیوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ٹرام کمپنی کے آدمی ہیں۔ ٹرامویز کے ساتھ لوگوں نے کمپنی کی بسوں میں بھی بیٹھنے سے انکار کیا۔ بہت سے ایسے افراد جن کے پاس ٹرامویز اور موٹر بسوں کے مستقل پاس ہیں وہ بھی آج تانگوں میں ہی سفر کرتے نظر آئے۔

شام کو اصلاح میونسپل کمیٹی اور کانگریس کمیٹی کی طرف سے ایک عام جلسہ ہوگا جس میں ٹرامو سے بائیکاٹ کے پروگرام پر کانگریسی لیڈروں کی تقریریں ہوں گی۔ اور مولینا نورالدین بہاری کو ان کی گرفتاری پر مبارکباد دی جائے گی۔

(وطن دہلی ۷۔ جولائی ۱۹۱۹ء)

مولینا نورالدین بہاری کی گرفتاری کی نوعیت عجیب و غریب تھی جو الزام پولیس نے مولینا پر لگایا تھا اس کے مرتکب مولینا سمیع اللہ قاسمی مالک کتب خانہ عزیزیہ ہوئے تھے۔ چونکہ مولوی سمیع اللہ اور مولینا نورالدین کی شکل و صورت میں کافی مشابہت تھی اور مولینا کے نام کی کافی شہرت تھی اور ہی نام لوگوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا تھا۔

ٹرامو سے کے ملازموں نے رپورٹ لکھواتے وقت مولینا نورالدین بہاری کا نام لیا۔ مولینا صاحب کا جب عدالت میں چالان ہوا۔ تب مولینا کو حقیقت معلوم ہوئی لیکن مولینا نے اپنی بریت کے لئے مولینا سمیع اللہ کا نام نہیں لیا۔ مولینا پر جرمانہ ہوا۔ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب نے جرمانہ کی رقم ادا کی۔

۱۹۳۹ء میں اصلاح میونسپل کمیٹی نے بناسپتی گھی کے خلاف مہم چلائی ۔ ۔ اس کا کہنا تھا کہ بناسپتی گھی میں وہ جراثیم ہیں جن سے کھانے والوں کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس کے کھانے سے لوگ بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔

اس پروپیگنڈے کا اسقدر اثر ہوا کہ گھی بنانے والی کمپنی کے دس روپے کے حصے کی قیمت چھ روپے ہو گئی۔ کمپنی والے بہت پریشان ہوئے۔

کمپنی والوں کو بھی معلوم تھا کہ امداد صابری پر مولینا نورالدین مرحوم کا بہت اثر ہے۔ وہ ان کے کہنے کو ٹال نہیں سکتا۔ چلو مولینا نورالدین کو راضی کرو۔ نہیں مانیں گے تو روپے کے جوتے سے ان کو تیار کر کے صابری پر دباؤ ڈلوائیں گے۔

چنانچہ کمپنی کا ایک با اثر آدمی مولینا مرحوم کے پاس پہنچا۔ اور اس نے اپنے مقصد کا اظہار کیا۔ مولینا نے میری طبیعت و عادت کا ذکر کیا۔ کہ وہ اس وقت تک نہیں مانے گا۔ جب تک بناسپتی گھی میں کوئی شناخت کرنے والا رنگ شامل نہیں کیا جائیگا۔ ان حضرت نے مولینا کو دس ہزار روپے کا لالچ دیا۔ کہ میں کانگرس فنڈ میں آپ کو دونگا۔ مولینا نے بری طرح اسکو دھتکار دیا۔ اس کے بعد یہ حضرت سردار دیوان سنگھ صاحب مفتون ایڈیٹر اخبار ریاست کے پاس پہنچے اتنی ہی رقم ان کو دینے کا وعدہ کیا سردار صاحب نے مجھ امداد صابری سے ذکر کیا۔ میں نے سردار صاحب سے عرض کیا۔ آپ اس وقت مقدمہ کی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ آپ یہ رقم لے لیجئے۔ میں بناسپتی کے خلاف پروپیگنڈہ بند کر دیتا ہوں لیکن میں اپنی پبلک لائف سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ اور اعلان کر دوں گا کہ میں پبلک لائف گزارنے کے قابل نہیں ہوں۔ چنانچہ سردار دیوان سنگھ مفتون نے اس گفتگو کا اس قدر اثر لیا کہ بناسپتی گھی کے خلاف اپنے اخبار میں لکھنا شروع کر دیا جس سے ان کو سو روپے ہفتہ کا نقصان ہوا۔ اس کمپنی کے اخبار میں جو اشتہار شائع ہوتے

تھے۔ سردار دیوان سنگھ نے ان کو شائع کرنا بند کر دیا۔

مولینا نورالدین بہاری مرحوم و مغفور مجسم ایثار و قربانی تھے۔ انھوں نے کم و بیش دس سال جیل میں زندگی گذاری ۱۹۴۲ء کی آخری جنگ آزادی کی تحریک میں مولینا ئے مرحوم پیش پیش تھے۔ بمبئی کے کانگریس کے اجلاس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اُنھوں نے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑو کی تجویز کی پُر زور تائید کی اور اس پر ایسی جامع و مدلل تقریر کی جس نے ہاؤس کو ہلا دیا تھا۔

۹۔ اگست کو مولینا مرحوم بمبئی سے اپنے دوستوں کے ساتھ دہلی روانہ ہوئے۔ فرید آباد اسٹیشن پر گرفتار کر لیے گئے۔ کچھ دنوں دہلی جیل میں رہے پھر ملتان جیل، انبالہ جیل اور اس کے بعد فیروزپور جیل میں بھیج دیئے گئے۔ اور وہیں سے ۱۹۴۵ء میں رہا ہوئے۔

مولینا نورالدین بہاری جب فیروزپور کیمپ جیل میں تھے تو حکومت نے ان کے خلاف فرد جرم عائد کی اور جواب مانگا۔ اور لکھا تمہاری میعاد نظر بندی کیوں نہ بڑھا دی جائے۔ اُنھوں نے اپنے جواب میں قرآن مجید کی چند آیتیں لکھی تھیں جس کا مفہوم تھا کہ ظالموں کا جو حشر ہوتا ہے وہ تمہارا بھی ہوگا۔ اور فرد جرم کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ اس فرد جرم میں جس قدر الزام لگائے گئے ہیں وہ سب درست ہیں جیل سے رہا ہونے کے بعد اس سے زیادہ جرم کروں گا۔ فیروزپور جیل میں مولینا کو پان نہیں ملتے تھے تو کسی درخت کی چھال سے گزارہ کر لیتے تھے۔

مولینا سنہ ۱۹۵۱ء میں بھوپال تشریف لے گئے اور بھوپال کی ایک دیہاتی بنجر زمین کو سبز و شاداب کیا۔ لیکن وہاں بھی آپ نے درس قرآن مجید نہیں چھوڑا ہفتہ میں ایک روز منگل کو بھوپال میں آکر تفسیر قرآن بیان فرمایا کرتے تھے۔ اور قرآنی نکات اور باریکیاں عام فہم اور سہل طریقہ سے لوگوں کے دلوں میں پیوست کر دیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے لوگ اس دن کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔

مولینا مرحوم ۲۴ ستمبر ۱۹۵۶ء کو دہلی میں تھے۔ اور میرے غریب خانہ پر تشریف لائے تھے۔ اور حسب دستور مولینا سمیع اللہ صاحب قاسمی کے ہمراہ انھوں نے مچھلی کھائی تھی۔ قطعًا یہ گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ مولینا اتنی جلدی ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

مولینا نورالدین بہاری بھوپال پہنچے۔ اور منگل کے روز آپ نے بھوپال میں درس قرآن دیا۔ اسی دن شام کو آپ نے سیفیہ انٹر کالج کی تقریب میں شرکت کی۔ وہیں سے آپ کی طبیعت یکایک خراب ہو گئی۔ حبس ریاح اور بلڈ پریشر کا دورہ پڑا۔ اور رات کو گیارہ بجے تک شدید تکلیف رہی۔ اس عرصہ میں ڈاکٹر سر سی۔ واستوا، حکیم لطافت حسین صاحب افسرالاطبا، اور کرنل وِنس سپرنٹنڈنٹ حمیدیہ ہاسپٹل نے معائنہ کیا۔ دوسرے دن مولینا کی خواہش پر حکیم محمد مختار صدیقی کا علاج شروع ہوا۔ طبیعت سنبھلی۔ جمعرات کی شب کو آپ دیوان گنج تشریف لے گئے تھے۔

۲۲-۲۳ ستمبر ۱۹۵۶ء کی درمیانی شب کو دو بجے رات تک نیند نہیں آئی تھی۔ باتیں کرتے کرتے لیٹ گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ آنکھ لگ گئی ہے۔ لیکن آدھے گھنٹے کے بعد ہی خرّاٹے کی آواز کے ساتھ منھ سے جھاگ آرہے تھے۔ اسی حالت میں تھوڑی دیر بعد فوت ہوگئے شام کو پانچ بجے آپ کی آخری رسوم ادا کی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون دہلی کے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے نامور مشہور تاریخ گو جناب مولوی نسیم صاحب دہلوی نے حضرت مولینا نورالدین صاحب بہاری کی حسب ذیل تاریخ وفات فرمائی[1]

تھے وہ اک مردِ مجاہد پیکرِ صدق و صفا | موت سے جنگی ہوئی خوردہ کلاں کو بیکلی
سالِ رحلت لکھ نسیمؔ دہلوی تاریخ گو | ولئے نورِ دین کے تاریک سب دہلوی

۱۳ ۷ ۶

امداد صابری

[1] عوامی رائے دہلی ۲۳ نومبر ۱۹۵۶ء

سببِ تالیف

تنبلا سے جنوری ۱۹۵۹ء میں عوامی رائے ہفتہ وار اخبار میرے چند مخلص احباب
لالہ رام لال صاحب ایم۔ اے آنریری ڈکمپنی اور ماسٹر بشیر احمد صاحب کے
مشورے اور اعانت سے جاری ہوا جس کی ادارت کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی
میں نے محسوس کیا کہ اس میں تاریخی اور دلچسپ مضامین کا سلسلہ شروع کیا جائے
اس کا عنوان کیا ہو۔ جب اس پر غور کیا جانے لگا تو خیال اور ذہن نے رہنمائی
کی کہ ان چند شعراء کا ذکر تذکروں میں دیکھا تھا جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی
میں حصہ لیا، شہید ہوئے اور جیلوں میں زندگیاں بتائیں تھیں ان ہی شعراء
کے حالات اخبار میں شائع کر دیے جائیں۔

ضرورت کی ماں ایجاد ہے کے مصداق "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" کا عنوان
قائم کیا۔ اس کی پہلی قسط کے بعد .... جب چھ، سات
قسطیں شائع ہو گئیں اس وقت فیصلہ کیا کہ اسی عنوان کے نام سے کتاب
شائع کی جائے۔ اور جن شعراء کے مختصر حالات و کلام شائع ہو چکے ہیں ان کے
مزید تفصیلی حالات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ مزید شعراء کی کھوج کی جائے اور
۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانہ کے شعراء کے تذکرے اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء
پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ دیکھی جائیں۔ اور جس شاعر کا جس ضلع و مقام سے

تعلق ہو اس ضلع کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔ اور ان کے خاندان کے لوگوں سے مل کر تصدیق اور مزید معلومات فراہم کی جائے۔ ہندوستان کے اکثر و بیشتر قدیم و جدید شعراء کی درباری اور مشاعروں کی خوشامدانہ مدح سرائی، بے جا و بے تُکی مبالغہ آمیز قصیدہ خوانی کی وجہ سے میری نظروں میں اس طبقہ کی کوئی عزت نہیں تھی۔ میرا یقین تھا کہ جس طبقہ میں خودداری کا مادہ اور قربانی دینے کا جذبہ نہ ہو اور اپنے ذاتی مفاد و نفع کے خاطر ملکی و قومی مفاد کو قربان کر دیتا ہو اور ملک کے دشمن عناصر کو قوت پہنچاتا ہو اس کو غدار ملک سمجھنا بیجا نہیں ہے۔

لیکن جب میرے سامنے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مخلص بے لوث محبان وطن، جاں نثاران قوم، مجسمۂ قربانی شہید و اسیر شعراء کے کارنامے آئے تو ان سے والہانہ محبت و عقیدت پیدا ہو گئی۔ میں نے ضروری نہیں بلکہ بڑا اہم فرض سمجھا کہ ایسے شعراء کے سبق آموز تاریخی واقعات، اور ان کے بغاوت کی آگ لگانے والے کلام پیام کو قلم بند کروں۔ اور ان کو عالم گمنامی سے نکال کر تاریخی اوراق کی زینت بناؤں۔

یہ کام میں نے جتنا آسان سمجھا تھا جب تحقیق و جستجو کے میدان میں پہنچا تو اسی قدر دشوار و مشکل پایا۔ اس لئے کہ انگریزوں کی یہ بے انتہا کوشش تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حالات منظر عام پر نہ آئیں اور تاریخوں میں مجاہدین کے بہادرانہ واقعات کبھی ذکر نہ آئے۔ بلکہ ان کو بھلا دیا جائے۔ جو شخص مجاہدین کی عزت کرتا اور ان کو اچھے الفاظوں سے یاد کرتا تھا اس کو باغی اور حکومت کا دشمن تصور کیا جاتا تھا۔ اسی بنا پر اس

دور کے مورخین و مصنفین انتہائی خوفزدہ تھے۔ اوّل تو یہ طبقہ ان کے ذکر سے
بہت دور بھاگتا تھا۔ ان کے ذکر کرنے کو مصیبت و آلام کو دعوت دینے کے مترادف
سمجھتا تھا۔ چنانچہ اسی طریقہ پر عمل کیا گیا۔ اور ان کے واقعات و حالات کو
حرفِ غلط کی طرح مٹایا گیا۔ اگر مورخین ان فداکارانِ ملک کا ذکر کرنے کی کبھی
جرأت بھی کرتے تھے تو ان کو چور، ڈاکو، بدمعاش، لچا، زانی ثابت کرنے کے
بعد سہمتے سہمتے قلم کو جنبش دیتے اور بچتے بچاتے الفاظوں کو توڑ مروڑ کر تحریر
کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تک گھروں تک میں محبّانِ وطن کو اچھے الفاظوں
سے یاد نہیں کیا جاتا تھا۔ گرچہ یہ اُن کی دل کی آواز نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ان
کے دلوں پر یہ نقش ہو گیا تھا کہ اگر ہم نے ان حضرات سے اپنی عقیدت مندی کا
اظہار کیا تو جو حشر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے
ساتھ کیا تھا۔ وہی سلوک ہمارے ساتھ بھی ہوگا۔

خاص طور پر وہ لوگ جن کے خاندان کے افراد یا بزرگوں نے یا خود
اُنھوں نے اس جنگ آزادی میں کچھ بھی حصّہ لیا تھا اس جنگ میں انگریزوں
کے معتوب ہوئے، جیلوں میں گئے تھے پھانسیاں پائی تھیں۔ یہ اُن
بزرگوں سے متعلق ہونا یا رشتہ کا اظہار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ اُن
کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ جو تھوڑی بہت یا زیادہ ان سے ہماری خاندانی
وابستگی ہے اس کا بھی ذکر کسی زبان پر نہ آئے۔ اور دلوں سے محو ہو جائے
تو بہتر ہے۔ اتفاقیہ طور پر اگر ان لوگوں سے ان کے بزرگوں کے بارے میں
کوئی شخص کسی قسم کی معلومات حاصل کرنی چاہتا تھا تو اس کو اس طرح

بتانے سے گریز کرتے جیسے ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہ بالکل ان کے حالات سے ناواقف ہیں۔

مولینا محمد حسین آزاد مصنف آب حیات کو ہی لے لیجیے۔ ان کے والد ماجد دہلی اردو اخبار، نکالتے تھے۔ جس میں اس جنگ آزادی کی خبریں آزادانہ طور پر شائع ہوا کرتی تھیں اور جب انگریزی فوج ہار جاتی تھی تو شادیانے بجائے جاتے تھے۔ یہ اخبار خاص طور پر بہادر شاہ ظفر سے عقیدت رکھتا تھا۔ مولینا محمد حسین آزاد اس اخبار کے مہتمم تھے۔ انھوں نے خود اس جنگ آزادی کی ابتدا میں جبکہ مجاہدین نے انگریزوں کا قلع قمع کر دیا تھا اور دہلی سے نکال دیا تھا۔ اس وقت ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کے دہلی اردو اخبار میں "تاریخ انقلاب عبرت افزا" کے عنوان کے ماتحت حسب ذیل غزل انگریزوں کی ہجو اور مذمت میں شائع کی تھی۔

کو ملک سلیماں و کجا حکم سکندر — شاہان اولی العزم و سلاطین جہاندار

کو سطوت حجاج، کجا صولت چنگیز — کو خان ہلاکو، کجا نادر خونخوار

کو رستم و سہراب، کجا سام نریماں — اس معرکہ میں کند ہے ایک ایک کی تلوار

ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ اک چشم زدن میں — ہاں دیدۂ دل کھول کے عبرت الابصار

ہے کل کا ابھی ذکر کہ قوم نصاریٰ — تھی صاحب اقبال و جہاں بخش و جہاندار

تھے صاحب علم و ہنر و حکمت و نصرت — تھے صاحب جاہ و حشم و لشکر جرار

اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کہ نکلی
آفاق میں تیغِ غضب حضرت قہار

سب جوہر عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے — سب ناخن تدبیر و خرد ہو گئے بیکار

کام آئے نہ کچھ علم و ہنر و حکمت و فطرت — یورپ کے تلنگوں نے لیا سب کو ہیں مار

یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا — ہے گردش گردوں بھی عجب گردش دوار

نیرنگ پہ غور اس کے جو کیجئے تو عیاں ہے — ہر شعبدہ تازہ میں صد بازی عیار

ہاں دیدۂ عبرت کو ذرا کھول تو غافل — ہے بند یہاں اہل زباں کے لب گفتار

آنکھیں ہوں تو سب کھل گئی دنیا کی حقیقت — مت کیجئو دلا اس کا بھروسہ کبھی زنہار

عبرت کے لئے خلق میں یہ سانحہ بس ہے — گر دے ہے خدا عقل سلیم و دل ہشیار

کیا کہئے کہ دم مارنے کی جائے نہیں ہے — حیراں ہیں سب آئینہ صفت پشت بدیوار

حکام نصاریٰ کا بدیں دانش و بینش
مٹ جائے نشاں خلق میں اس طرح سے یکبار

مولانا آزاد کے والد ماجد مولینا محمد باقر جو اپنے اخبار میں انگریزوں کی مخالفت میں خبریں شائع کرتے تھے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ان پر قتل ٹیلر کا الزام لگایا گیا۔ اور پھانسی پر چڑھا دیئے گئے۔ چنانچہ مولینا آزاد کی بھی تلاش ہوئی۔ یہ دہلی سے فرار ہوئے اور کافی دن پوشیدہ رہے۔ یہ بھلا کسی کتاب میں اپنے والد ماجد کی شہادت کا ذکر کیسے کر سکتے تھے یہ بھی مجرم بغاوت تھے۔ ان کے دل میں بھی چور تھا۔ انھوں نے آب حیات میں حضرت ذوقؔ کے حالات لکھے ہیں جس میں ان کے صاحبزادے خلیفہ محمد اسمٰعیل صاحب کا ذکر بار بار آتا ہے۔ خلیفہ اسمٰعیل مولینا آزاد کے گہری اور لنگوٹیئے یار غار تھے۔ اسی احتیاط کی وجہ سے ان کی شہادت کا

ذکر ہی نہیں کیا بلکہ ان کی شاعری کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا۔ اور
ان کا تخلص تک بتانے سے گریز کیا۔ حالانکہ مولینا آزاد نے میر تقی میر مرحوم
کے ذکر کے ساتھ ان کے صاحبزادے میر کلو عرش کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور ان
کا ایک مشہور شعر بھی نقل کیا ہے۔

میں نے اس یقین کے ساتھ کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل حضرت ذوق کے
صاحبزادے ہیں لازمی طور پر شاعر ہونگے ان کے تخلص اور کلام کا نمونہ
دئے بغیر عوامی رائے اخبار کی ایک قسط میں ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء
میں ان کا شمار کرا دیا تھا۔ اس کے بعد شعراء کے قدیم و جدید تذکروں کی
دشت گردانی کی کسی میں بھی ان کا ذکر نہیں پایا۔ تخلص کی کھوج کی تو
اس کا پتہ بھی نہیں لگا۔ ایک روز منشی ذکاء اللہ صاحب رحمتہ اللہ
علیہ کی تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند پڑھ رہا تھا۔ اتفاقیہ طور پر ایک صفحہ
پر نظر پڑی تو ذوق کے بیٹے فوق،، لکھا ہوا پایا جب تخلص کا علم ہوا تو
اس اتے پتے کے ساتھ دوبارہ تذکرے دیکھے تو بالکل خاموش تھے نہ نام
تخلص، نہ اُن کا کلام ملا۔ اسی طرح ایک مرتبہ بیٹھے بیٹھے ذہن میں آیا کہ اخبار
کوہ نور لاہور ۱۸۵۴ء کے فائل میں حضرت ذوق کی وفات کی خبر، ان کے حالات
زندگی کے ساتھ تاریخی قطعے بھی درج ہیں ہو سکتا ہے کہ ان میں حضرت فوق
کی کہی ہوئی کوئی تاریخ درج ہو — دیکھا تو اس میں فوق صاحب کے
تین قطعے دو فارسی کے اور ایک اردو کا موجود تھا۔ وہ نقل کئے۔ تحقیق
مکمل ہو گئی۔

مولانا فیض احمد رسوا بدایونی جیسی مشہور و معروف ہستی جن کے مجاہدانہ کارناموں کی بنا پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کی شہادت کے بارے میں کسی شخص کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی شہادت کو بھی مورخوں نے چھپانے کی کوشش کی۔ اور من گھڑت روایت ان سے منسوب کی چنانچہ اکمل التاریخ کے مولف نے یہ تحریر فرمایا ہے۔

"آپ نے زمانہ غدر میں آگرہ سے جب کہ ہر طرف ہنگامۂ جدال قتال گرم تھا ترک علائق کرکے راہِ حق میں قدم رکھا۔ اور جادۂ فنا تک پہنچ کر بقا جاوداں کا لطف اٹھایا۔ کسی کو پتہ نہیں کہ کہاں تشریف لے گئے"

لاپتہ ہونے کا فتویٰ ایک مورخ نے صادر فرمایا۔ دوسرے مورخ تذکرۂ علماء ہند کے مولف رحمان علی صاحب ان کو لاپتہ تو نہیں بلکہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں ان کی وفات کے ذکر کے ساتھ ان کی کتابوں کے نام گنوانے کے بعد کتابوں کے تلف ہونے کا اسی جنگ آزادی کے زمانہ میں ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ان کی شہادت کے واقعہ کو حذف کر جاتے ہیں انداز تحریر ملاحظہ ہو۔

"اکثر از آنہا (کتب) در فتنۂ عامۂ ہند ضائع شد وے رحمۃ اللہ در حدود سال دوازدہ صد و ہشتاد و چہار ہجری رحلت فرمودہ"

مولانا رسوا کے عزیز و اقارب بھی خوف زدہ تھے۔ اور ان سے اپنے

متعلق کا اظہار کرنے سے گریز کرتے تھے۔ ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء میں لالہ سری رام صاحب مؤلف
خمخانۂ جاوید نے ان کے عزیز و اقارب سے مولانا کے حالات زندگی اور
کلام طلب کیا۔ مگر بقول لالہ سری رام صاحب "باوجود اقراروں کے کچھ
اطلاع نہ ملی۔ مگر مجھے قاضی محمد خلیل صاحب کی بیاض سے کلام نقل ہوا"۔

اسی طرح مولانا بدر الاسلام صاحب مشہود عباسی بدایونی جن کی
غزل کا یہ شعر "سر کمپنی کا کٹ کے بکا پاؤنڈ کے نرخ میں" زبان زد خاص و
عام تھا۔ تذکرہ نویسوں نے ان کو بھی نظر انداز کیا۔ اور کسی نے بھی ان کے
حالات و کلام شائع نہیں کئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ان کے حالات و
کلام شائع کرتے تو جیلوں میں عمر رہنا پڑتا۔ اس لئے احتیاط فرمائی۔
"وہ دور اندیش تھے"۔

عام طور پر تذکرہ نویسوں نے اپنے بچاؤ کے لئے جو مجاہدین ۱۲۷۴ھ
مطابق ۱۸۵۷ء میں شہید ہوئے تھے ان کے متعلق صرف اتنے لکھنے پر
اکتفا کیا ہے کہ ۱۲۷۴ھ میں فوت ہوئے۔ مثال کے طور پر تذکرہ امیر مینائی
میں دو شاعروں کے حالات درج ہیں۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

شہید | میر شرف الدین ابن سید غیاث الدین رامپوری اخوندزادہ احمد علی
غفلت کے شاگرد تھے ساٹھ برس میں ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۷۴ھ
کو قضا کی۔ ان کا کلام تلف ہو گیا۔ تذکرۂ مصحفی سے ایک شعر درج کیا جاتا ہے:

لے کے دل پوچھتے ہو نام میرا — اس تجاہل کو ہے سلام میرا

خوشدل | منشی من بھاون لال، ولد لالہ بھگوانداس، ریاضی میں

اچھی بصیرت رکھتے تھے۔ زبان فارسی اردو، دونوں میں شعر کہتے تھے میاں احمد علی احمد کے شاگرد تھے، ۱۲۷۲ھ پندرہ شوال کو انتقال کیا۔ ے

زمیں بر فعت از چوں نشاط پیر انگشت   سپہر بخت زمیاں اشک بر رخسار

اسی طرح خم خانۂ جاوید، جلد پنجم میں ایک شاعر کا تذکرہ ہے۔

عزیز | منشی مہاراج سنگھ دہلوی شاگرد شاہ نصیر دہلوی کا تخلص، آپ نے اپنے استاد مرحوم کا پراگندہ کلام بڑی محنت سے جمع کر کے کلیات ترتیب دی تھا جسکے مرتب کیا تھا ایام غدر میں قضا کی، خود صاحب دیوان تھے۔ اپنے زمانہ کے اعتبار سے اچھے شاعر تھے۔ دیوان ان کا دستیاب نہیں ہوا جو دو چار شعر مختلف بیاضوں سے ہاتھ لگے درج ذیل ہیں۔

ہمارا صاف دل آئینہ رہ کبھی ہم سے   سدا ہماری طرف سے لے غبار رہا

لیکے لعد دل بھی جدا اپنے سے کبھی نہ دے   لے عزیز اس عزت پر سے کسطرح سونا ہے

بتائیے اب کیسے اندازہ لگایا جائے کہ ان حضرات کی موت فرنگیوں کی گولیوں سے ہوئی یا یہ اپنی موت آپ مرے۔ اب مقامی کتابوں کی تلاش کیجئے، اس دور کی تاریخ دستیاب نہیں ہوتی تو تیاسی گھوڑے دوڑا کر ان کو شہداء میں شامل کیجئے یا پھر تحقیقی اصول کے مطابق ان حضرات کو قابل ذکر نہ سمجھا جائے۔ ایسے شاعر کافی ہیں۔ ان تذکرہ نویسوں کی مہربانی کی وجہ سے ابتک حکیم محمد حسین ضیا اور سید اکبر زماں مجیبہ کا کلام فراہم نہیں ہو سکا شعرا کے تذکروں میں شعراء مجاہدین کے حالات بہت مختصر درج ہیں۔ بلکہ بعض کے نام اور تخلص کے علاوہ کچھ بھی پتہ نہیں لگتا ان کے حالات معلوم

کرنے کے لئے ان کے خاندان کے لوگوں سے خط و کتابت کی گئی۔ اندوں کے
پاس جانا بھی پڑا۔ مرزا عباس بیگ بریلوی کے جب اخبار عوامی رائے دہلی
میں بہت مختصر حالات شائع ہوئے تو یہ اخبار فرقان احمد صاحب عزم
بریلوی کے پاس جاتا تھا۔ اس شمارہ کو عزم صاحب کے پاس مرزا عباس علی
بیگ کے خاندان کے ایک شاعر ماسٹر لائق علی بریلوی نے دیکھا اور پسند
کیا۔ عزم صاحب نے مجھکو ایک خط لکھا تو اس میں ان کا ذکر کیا۔ میں نے
ماسٹر صاحب کا پتہ منگوا کر ان سے خط و کتابت کی۔ دو تین مرتبہ بریلی جانا
ہوا اور وہاں ان سے ملاقات ہوئی ۱۹۷۵ء کی ابتدا میں جبکہ ٹیچرس ریڈر
کے ڈیپوٹیشن کے سلسلہ میں مراد آباد، بریلی اور علی گڑھ میں دنگے فساد ہوئے
اور گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔ اس وقت حضرت محبوب ملت مولانا
عبد الوحید صدیقی صاحب بانی اخبار نئی دنیا دہلی کے ہمراہ میں بریلی
پہنچا۔ ماسٹر صاحب کے دولتکدہ پر بھی حاضری دی۔ انھوں نے مرزا
عباس صاحب کے صاحبزادے اور پوتوں کے حالات اور کلام عنایت
کیا۔ میرے جانے کی سی۔ آئی۔ ڈی کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے ماسٹر صاحب
کو تنگ کرنا شروع کیا۔ سوالات کی بوچھاڑ کی دفتر بلایا۔ بالآخر جب
انھوں نے میرے خطوط اور عوامی رائے کے پرچے دکھائے تو چھٹکارا
حاصل ہوا۔

مولانا فیض احمد بدایونی کے خاندانی حالات نہیں ملتے تھے
ان کی سخت ضرورت تھی۔ بدایوں جانے کا کئی بار ارادہ کیا۔ لیکن جلد ما

نہیں ہو پاتا تھا مراد آباد کے مشہور وکیل راحت مولائی صاحب کے اسمبلی کے الیکشن سے فارغ ہونے کے بعد ان کے ہمراہ بدایوں پہنچا جن کے ہاں ہم مہمان تھے ان سے مولوی فیض احمد بدایونی کا ذکر کیا کہ ہمیں آپ کے خاندان کے ان بزرگ سے ملنا ہے اور اُن کے حالات و کلام کی ضرورت ہے، میزبان صاحب سید بسطامی صاحب نے فرمایا۔ مولینا تو ہمارے بزرگ تھے ان کا قلمی دیوان اور ایک مثنوی اور بدایوں کی تاریخ جس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حالات درج ہیں وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ چنانچہ دیوان میں سے اشعار منتخب کئے۔ مثنوی اور تاریخ دیکھی۔ تاریخ میں سے بدایوں کے جنگ آزادی کے حالات نقل کئے۔

نواب تفضل حسین خاں صاحب ... فرخ آباد کی جنگ آزادی کے حالات و کلام حاصل کرنے کے لئے فرخ آباد بھی جانا ضروری تھا۔ صدیقی برادری کی آل انڈیا کانفرنس فرخ آباد جانے کا سبب بنی فرخ آباد پہنچا تو معلوم ہوا کہ محلہ گڈھی کہنہ میں نواب صاحبان کے خاندان کے افراد نواب فطنت اور نواب انور بخت رہتے ہیں۔ ان سے معلومات حاصل ہو سکتی ہے حکیم عبدالجلیل صاحب زبیدی کے ہمراہ نواب فطنت اور نواب انور بخت سے ملا۔ انور بخت صاحب نے نواب صاحبان کے خاندان کے حالات بتائے۔ اور شہیدان فرنگ کے فوٹو دکھلائے۔ اور فرخ آباد کی میونسپل بورڈ کی لائبریری میں لے گئے۔ جہاں تاریخ فرخ آباد قلمی مولفہ مفتی ولی اللہ صاحب فرخ آبادی، حیات السیر قلمی مولفہ علامہ مجلسی دہلوی اور لوح تاریخ قلمی مولفہ سید بہادر علی کا مطالعہ کیا

نواب ناصر خاں عرف صاحب ناصر شہید فرنگ کا کلام و حالات نقل کئے اور نواب غضنفر حسین خاں صاحب کا کلام تلاش کیا لیکن دستیاب نہیں ہو سکا دہلی چلا آیا۔ نواب نور بخت صاحبہ نے بڑی تلاش و جستجو سے نواب غضنفر حسین صاحب کا کلام اور مہاراجہ دلیپ سنگھ اور شہزادہ مظفر بخت کی غزلیں اور کیپٹن وزن کے جیل کے حالات بھی۔ وارثین فرخ آباد مولفہ راد ھارمن سکسینہ بیدل سے نقل کر کے روانہ کئے اور اپنے بزرگوں کی یاد تازہ کر کے مجھ پر احسان عظیم کیا۔

اسی طرح مرادآباد میں نواب مجو خاں کے خاندان کے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے نواب صاحب کے حالات کے ساتھ نواب شبر حسن خاں صاحب کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی شہادت کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ شاعر تھے ان کا تخلص عاجز تھا۔ چنانچہ دہلی میں آکر شعراء کے تذکرے دیکھے ان میں ان کا ذکر و کلام نہیں ملا۔ اسعد الاخبار آگرہ ۱۸۵۵ء میں ان کے دو قصیدے نظر پڑے۔ ان کو نقل کیا۔ گویا ایک اور شہید شاعر کا اضافہ ہوا۔

شعراء کے کلام و حالات کے ساتھ شعراء جن مقام و جگہ کی جنگ آزادی سے تعلق رکھتے تھے ان مقامات کے تاریخی واقعات و کیفیت معلوم کرنے کے لئے ہندوستان کی مختلف خاندانی و ذاتی اور پبلک لائبریریوں میں جانا پڑا۔ تاکہ ان مقامات کی تاریخی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

تاریخ صحافت اردو کی دوسری جلد کی ترتیب دینے اور مواد فراہم کرنے کے لئے کلکتہ کی نیشنل لائبریری اور ایشیاٹک سوسائٹی کو عرصہ سے دیکھنے کا متمنی تھا۔ اب جب اس کتاب کے مرتب کرنے کا وقت آیا تو

اور زیادہ کلکتہ وغیرہ جانے اور وہاں کی لائبریریوں میں کتابیں دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ خدا خدا کرکے بمشکل تمام اتنا پیسہ ہو گیا کہ میں کلکتہ بذریعہ ریل پہنچا۔ پہلے ایشیاٹک سوسائٹی گیا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد کے اخبارات اس میں دیکھنے کے لئے نہیں ملے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر سرکشی بجنور کے علاوہ کوئی اور کتاب بھی اس میں نہیں تھی۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے اخبارات کے کچھ فائل ملے ان کے اقتباسات اور سرکشی بجنور کے اقتباسات کی نقل کی۔ اس سوسائٹی کے لائبریرین مولانا مطیع الرحمٰن صاحب اخلاق سے پیش آئے۔ اور کتابیں دکھانے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔

اس کے بعد نیشنل لائبریری میں پہنچا۔ اس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے متعلق انگریزی میں کافی کتابیں ہیں۔ لیکن ان کتابوں میں مجاہدین پر جو زیادتیاں اس جنگ میں کی گئیں تھیں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے اور میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر کوئی مستند کتاب اس لائبریری میں نہیں ہے۔ البتہ مجھکو تذکرہ شعراء اسپرنگر، تاریخ شاہجہانپور، تاریخ تحفہ راجستھان، واقعات اظفری، تاریخ الہ آباد، اور تاریخ صوبہ بہار ضرور دیکھنے کے لئے ملیں۔ یہ لائبریری ہندوستان کی بڑی لائبریریوں میں شمار ہوتی ہے کثرت کے ساتھ اس میں مطالعہ کرنے والے اشخاص آتے ہیں سلسلہ وار کتابیں دیجاتی ہیں۔ اس لئے کتابیں دیر میں ملتی ہیں۔ کافی انتظار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس انتظار کی پریشانی کو مسٹر مقیط الحسن صاحب لائبریرین

اور سیکشن نے دور کر دیا تھا۔ مجھکو اپنے دفتر میں لے گئے۔ جو کتابیں بتاتا گیا
وہ جلدی نکال کر دیتے تھے۔ اس طرح بارہ تیرہ روز کا کام انھوں نے تین چار
روز میں نمٹا لیا تھا۔

بہادر شاہ ظفر علیہ الرحمۃ کے خلاف پروفیسر مزمدار نے کلکتہ کے ایک
انگریزی اخبار میں ایک مضمون شائع کرا دیا تھا۔ جس میں ان کو غدار ثابت
کیا تھا۔ جناب پروفیسر مہدی حسن صاحب مزمدار کی ان غیر معقول باتوں
کا جو اس نے انگریزی کتابوں کے گمراہ کن پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر
لکھی تھی جواب دینے کے لیے نیشنل لائبریری کلکتہ کی کتابوں کا مطالعہ
کر رہے تھے۔ حسن اتفاق اسی اثنا میں پروفیسر صاحب سے اسی لائبریری
میں میری ملاقات ہو گئی جب مطالعہ کی غرض و غایت معلوم ہوئی۔ اور
کلکتہ کی لائبریریوں میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے متعلق کتابوں کے
فقدان کا پروفیسر صاحب نے ذکر کیا۔ تو میں نے منشی ذکاء اللہ صاحب
مرحوم کی تالیف تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند، داستان غدر مولفہ
ظہیر دہلوی، اور تبصرۃ التواریخ مولفہ میر کمال الدین ان کو پیش کیں۔ جسکا
انھوں نے دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا جتنے دن میں کلکتے میں رہا تقریباً
اتنے دن پروفیسر صاحب سے لائبریری یا جسٹس سردار پرتاپ سنگھ صاحب
کے دولت کدہ پر ملاقات ہوتی رہی۔ اور میں پروفیسر صاحب سے استفادہ
حاصل کرتا رہا۔

میری خوش قسمتی جس کو تائید غیبی کہنا بے جا نہ ہوگا۔ پروفیسر

صاحب مذکور تحقیق کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے۔ اور نیشنل آرکیوز آف انڈیا کا ۱۸۵۷ء کی دہلی کی جنگ آزادی یعنی بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ کا فائل آپ نے بغور دیکھا۔ اتوار کے اتوار آپ میرے غریب خانہ پر تشریف لاتے تھے۔ اور جو مواد ہفتہ بھر میں حاصل کرتے اس کا ذکر مجھ سے فرماتے تھے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب نے دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانے کے صادق الاخبار، سراج الاخبار، دستور العمل انتظام فوجی و ملکی، اور بادشاہ ایران کا دو فرمان جنگ آزادی جو انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے علاوہ ہندوستان کے مختلف لوگوں کو روانہ کیا تھا ان کے فوٹو مرحمت فرمائے جن سے میری کتاب کی زینت میں بڑا اضافہ ہوا۔

یہ حقیقت ہے کہ جس کاوش جستجو، اور تحقیق کے ساتھ پروفیسر صاحب بہادر شاہ ظفر کی حالات زندگی لکھ رہے ہیں اور رسالہ نظر فی النفیس کا معقول اور مدلل اور دندان شکن جواب دینے کے لئے جو مواد فراہم کیا ہے اگر یہ کتابی شکل میں شائع ہو گیا۔ تو یہ کتاب بے مثل ہو گی جس کی انتہائی ضرورت ہے۔

کلکتہ سے فارغ ہونے کے بعد پٹنہ روانہ ہوا۔ قاضی عبد الودود صاحب بیرسٹر بار ایٹ لا کے ہاں مقیم ہوا۔ اور قاضی صاحب کی وساطت سے خدا بخش لائبریری میں پہنچا۔ یہاں اور بھی سہولت قاضی صاحب کی وجہ سے حاصل ہو گئی۔ کہ لائبریری میں کتابیں مطالعہ کرنے بعد قیام گاہ پر لیجاتا تھا۔ اس لائبریری میں بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے متعلق کتابیں نہیں ہیں صرف

ایک قلمی کتاب ظفر الظفر بنام فتح نامہ انگریز مؤلفہ کپتان الیگزنڈر ہیدلی اور ایک مطبوعہ رسالہ تاریخ بغاوت ہند آگرہ مؤلفہ مکند لال سب اسسٹنٹ سرجن ہے

فتح نامہ انگریز فارسی میں منظوم ہے جس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتح پر شادیانے بجائے ہیں اور جب بہادر شاہ ظفرؔ انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے اس وقت انگریزی افسروں نے کافی دیر تک بہادر شاہ کو طعنے دیئے تھے ان طعنوں کو اس کے مؤلف نے دہرایا ہے کلکتہ کے پروفیسر مزدار اور مسٹر سین جنہوں نے حکومت ہند کی ایماء پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر کتاب لکھی ہے اور بہادر شاہ کو غدار بتایا ہے یہ کتاب ان کیلئے دندان شکن جواب کی حیثیت رکھتی ہے۔

"۱۸۵۷ء کے مجاہدین شعراء" کے ترتیب دینے میں جو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں اور جن سے اس کتاب میں اخذ کیا گیا ہے وہ تو کافی ہیں لیکن ان کا زیادہ تعلق ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے نہیں ہے ان کے نام "سبب تالیف" کے آخری حصہ میں درج ہیں لیکن ۱۸۵۷ء کی کل جنگ آزادی یا کسی صوبہ یا ضلع کی جنگ آزادی پر جو کتابیں لکھی گئیں اور خاص طور پر مجاہد شعراء کی سیاسی زندگی اور کارنامے بیان کرنے کیلئے جن کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے ان کے متعلق میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے مؤلفین کے نقطۂ نگاہ اور پالیسی سے آگاہ کر دوں اور ان کتابوں میں کس قسم کا مواد ہے اس پر روشنی ڈالوں ان کتابوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند مؤلفہ مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی (۲) محاربۂ عظیم مؤلفہ منشی کنہیا لال صاحب (۳) رسالہ تاریخ بغاوت ہند آگرہ مؤلفہ مکند لال سب اسسٹنٹ سرجن (۴) داستان غدر مؤلفہ ظہیر دہلوی (۵) سرکشی بجنور مؤلفہ سر سید احمد دہلوی (۶) خیر خواہ

مسلمانانِ ہند مؤلفہ سر سید احمد دہلوی (۷) قیصر التواریخ مؤلفہ سید کمال الدین حیدر۔ (۸) کنز التاریخ مؤلفہ مولوی رضی الدین بدایونی (۹) مصائب غدر مؤلفہ [illegible] (۱۰) اخبار الصنادید مؤلفہ مولوی نجم الدین صاحب (۱۱) تاریخ الٰہ آباد مؤلفہ مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی (۱۲) تاریخ شاہجہانپور مؤلفہ صبیح الدین خلیل شاہجہانپوری (۱۳) فسانۂ غدر مؤلفہ خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی (۱۴) ثورۃ الہندیہ مولانا فضل حق خیرآبادی

ثورۃ الہندیہ کے علاوہ یہ سب کتابیں انگریزوں کی منشا اور ایما اور انکی پالیسی کے مطابق لکھی گئی تھیں۔ ان میں مجاہدین و جاں نثاران وطن کی قربانیوں اور شخصیتوں کو ارادۃً حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے مسخ کیا گیا ہے۔

منشی ذکاء اللہ صاحب اور کنہیا لال صاحب کی دونوں کتابیں ۱۸۵۷ء کی کل ہند جنگ آزادی پر مشتمل ہیں۔ قریب قریب بڑے شہروں اور علاقوں کے جنگ آزادی کے حالات ان میں درج ہیں۔ منشی کنہیا لال صاحب نے صرف جنگ کا ایک رُخ مجاہدین اور انگریزوں کے حالات وہ بھی انگریزوں کی مظلومیت کی داستان کے طور پر لکھے ہیں انگریزوں نے قبضہ حاصل کرنے کے بعد ہندوستان پر جو مظالم ڈھائے ہیں۔ اس کا بالکل ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کے برعکس منشی ذکاء اللہ صاحب مرحوم نے کسی حد تک خصوصاً دہلی کی جنگ آزادی کے دونوں پہلو اور پہلوؤں مجاہدین اور انگریزی فوج کا مقابلہ اور اس کے بعد انگریزوں کے قبضہ کرنے کے بعد ہندوستانیوں پر انگریزوں نے جو مظالم ڈھائے تھے اسکی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ منشی ذکاء اللہ صاحب کے بارے میں جو عمومی طور پر رائے قائم کرنا صحیح نہیں ہے

"ذکاء اللہ حد سے آگے بڑھ گئے۔ قوم کی جاں نثاری حب الوطنی پر تمسخر کے قہقہے لگائے ہیں۔ وطن کے شہیدوں کو ان خطابوں سے یاد کیا ہے کہ کوئی شریف آدمی رذیل سے رذیل انسان کو خطاب نہیں کرے گا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ منشی ذکاء اللہ صاحب کی مذکورہ کتاب کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد یہ رائے قائم کی گئی ہے اس میں اس الزام کا جہاں تک تعلق ہے وہ ٹھیک ہے کہ ان کا خطابت کا انداز محبان وطن کے لئے اکثر جگہ انتہائی معیوب ہے۔ لیکن بعض جگہ انھوں نے مجاہدین کی قربانی، تجربہ کاری، ذہانت، بہادری اور جنگی انتظام کی تعریف کی ہے اور اصل واقعات بیان کرنے میں جھجھک محسوس نہیں کی ہے۔

جنگ آزادی کے دوران میں مجاہدین دہلی کا تقریباً ہر ایک مقام کی چھاؤنی سے تعلق تھا۔ اور وہاں سے صحیح خبریں ان کے پاس آتی تھیں۔ اس خوبی کو انھوں نے چھپایا نہیں بلکہ نمایاں طور پر تعریف کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں۔

"دہلی کی باغی سپاہ کو سب مقاموں کے سپاہیوں کی بغاوت اور ہر چھاؤنی کی جس میں بغاوت ہوتی تھی تو مدام صحیح خبر آتی تھی اور جب وہ سپاہ دہلی کی طرف منزل پیما ہوتی تھی تو ہر منزل کی خبر ان کے پاس آتی تھی۔ جب وہ دہلی کے قریب آتی تو اس کے چند سپاہی و افسر دہلی میں باغی سپاہ کے پاس آتے تھے۔ اور ان کے ذریعہ سے بادشاہ کو اطلاع دیجاتی

اور دہلی کے سپاہ کے افسر شہر سے باہر اس نو آمد سپاہ کے
پاس جاتے اور خوب تحقیق کر لیتے کہ وہ اُن کے ساتھ بغاوت
میں شریک ہیں تو شہر کا دروازہ اُن کے آنے کے لئے کھولا
جاتا ۔ اور بادشاہ کے حکم سے اُن کے ٹھہرانے کے واسطے
مقام شہر کے آس پاس تجویز ہوتا ۔ جب بریلی کا بریگیڈ دہلی
کے قریب ان کا سپہ سالار بخت خاں آیا تو بادشاہ کی طرف
سے اس کے استقبال کے لئے نواب احمد علی خاں بادشاہ
کے خسر گئے تھے ۔ بعض کمپنیاں پلٹنوں کی بے ہتھیار آتیں
ان کو دہلی کے میگزین سے ہتھیار مل جاتے تھے یا جو لڑائی
میں سپاہی لڑتے یا زخمی ہوتے ان کے ہتھیار ان کو دیدیے
جاتے ،، (۶۷۴)

مجاہدین کے انتظام کی یہ خوبی تھی کہ اس پر آشوب زمانے میں دہلی میں
غلہ آنا بند نہیں ہوا تھا ۔ اور نہ ہی دہلی والوں کو اجناس کی طرف سے کوئی
تکلیف ہوئی ۔ تلنگوں نے اپنے رسد کا خود معقول انتظام کر لیا تھا چنانچہ
تلنگوں کی اس خوبی انتظام کا اعتراف کرتے ہوئے منشی ذکا ءاللہ صاحب
فرماتے ہیں ۔

،، شہر میں انگریزوں کی طرف سے رسد آنے کا انسداد تو کسی
جانب سے نہیں ہوا تھا ۔ چاروں طرف سے صبح سے شام تک
سب طرح کی اجناس ضرورت کے موافق آتی تھیں بیلوں

گدھوں، ٹٹوؤں، خچروں، گاڑیوں، چھکڑوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ شہر میں جا بجا اجناس بکتی تھیں کسی کا مقدور نہ تھا کہ ان پر ہاتھ ڈال سکے۔ تلنگے رسد کے قواعد سے خوب واقف تھے۔ جنس کی قیمت نرخ کے موافق خوب دیتے تھے.....
تلنگوں نے خود اپنی رسد کا انتظام ایسا رکھا کہ ان کو بادشاہی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوئی... جب وہ میدان جنگ میں جاتے تو بادشاہی اہلکار حلوائیوں سے مٹھائی وغیرہ بنوا کر چھکڑوں میں اُن کے پاس بھیجتے۔ لیکن ایسا اتفاق دو تین ہی دفعہ ہوا ہوگا۔ شہر میں نہ سپاہ کو نہ اہل شہر کو ضروری چیزوں کے میسر ہونے میں تکلیف ہوئی (۴۹)
جس طرح انگریزوں کو بہادر شاہ ظفر اور اُن کے متعلقین سے خاص پرخاش تھی۔ اسی طرح روھیل کھنڈ میں نواب خان بہادر خاں کے نام سے انگریز کھِل جاتا تھا۔ ان کے ساتھیوں نے اس جنگ آزادی کے میدان میں جو بہادرانہ کام کئے تھے۔ منشی ذکاء اللہ اپنے مخصوص انداز میں ان کی تعریف و توصیف کے لئے رطب اللسان ہیں۔
.. دفعتہً غازی سبز پھینٹے سر سے باندھے ہوئے سپروں کو منہ کے آگے لگائے ہوئے تلواریں چمکاتے ہوئے آئے اور دین دین پکار کر یورش کی۔ وہ اہل سکھوں پر گرے جن کو ملکھوں نے اپنی صفوں سے بھگا دیا۔ وہ بیالیسویں

یا لینسڈرس کے پاس گئے جنہوں نے ان کی کمر تھامی۔ سر کولن اپنے گھوڑے پر سوار تھے ۴۲ رجمنٹ کو انھوں نے کہا کھڑے رہو اور غازی جب اُن کے نزدیک آئیں تو ان پر گنیں چلائیں۔ ۴۲ رجمنٹ نے حملہ کیا۔ جس کا اثر اچھا ہوا لیکن سر کولن غازیوں کے ہاتھ سے مارے جانے سے یوں بچ گئے کہ وہ گھوڑے پر سوار ایک کمپنی سے دوسری کمپنی کو دیکھنے جاتے تھے۔ ایک غازی کو انھوں نے دیکھا کہ وہ بظاہر مردہ کی شکل اُن کے گھوڑے کے ٹانگوں کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ دفعتہً وہ اپنے پاؤں پر کود کر تلوار سے سر کولن کو مارنا چاہتا تھا۔ ایک سپاہی نے اپنی تلوار سے اس کی گردن اڑا دی۔ غازی خوب لڑے کوئی ان میں زندہ سلامت نہیں گیا۔ انھوں نے اپنے کام کا حق ادا کیا.... رھیل کھنڈ میں کئی دفعہ غازیوں کی انگریزوں سے لڑائی ہوئی۔ ہر دفعہ انھوں نے حق عمدہ ادا کیا۔ اپنی جانیں دیں اور اُن کی لیں"۔ (۸۸)

منشی ذکاء اللہ صاحب کی اس کتاب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو جاں نثاران وطن کی مذمت کے باوجود یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ۱۸۵۷ء کی کل ہند تحریک آزادی کے بارے میں اور خصوصاً دہلی کے متعلق اس کتاب میں جس قدر صحیح میٹر ملتا ہے۔ وہ کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ انگریزوں نے عیسائی مذہب کو فروغ دینے کے لئے جو ہتھکنڈے استعمال کئے اور

کن کن وجوہات و اسباب کی بنا، پر ہندوستانی عوام اور فوجیں بغاوت
پر آمادہ ہوئیں ان کو منشی صاحب نے بڑی خوبصورتی سے اجمالا ہے۔
اور اپنے مخصوص انداز میں ان پر روشنی ڈالی ہے۔

رسالہ بغاوت ہند جولائی ۱۸۵۹ء کو آگرہ سے جاری ہوا تھا یہ وہ
رسالہ ہے جس کے مہتمم شیو نرائن صاحب ایڈیٹر مفید خلائق مرزا غالب کے
دوست تھے۔ جس کے پڑھنے کا اشتیاق مرزا غالب اور ان کے ساتھی حکیم
احسن اللہ خاں صاحب کو رہتا تھا۔ مرزا غالب نے اس رسالہ کا ذکر اپنے
خطوط میں کیا ہے۔ اور حکیم احسن اللہ خاں مرزا غالب کی معرفت اس رسالہ
کے خریدار بنے۔ اس رسالے کے اٹھارہ پرچے میرے والد ماجد مولینا شرف الحق
صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں مجلد ہیں۔ پہلی جلد ۱۸۵۹ء کے گیارہ پرچے
جولائی ۱۸۵۹ء سے جون ۱۸۶۰ء تک کے موجود ہیں۔ تیسرا پرچہ ستمبر ۱۸۵۹ء
کا نہیں ہے۔ دوسری جلد کے چھ پرچے جولائی ۱۸۶۰ء سے دسمبر ۱۸۶۰ء
تک کے ہیں اور ایک پرچہ فروری ۱۸۶۲ء کا ہے۔

اس رسالہ میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حالات درج ہیں۔
دہلی کے حالات بہت مختصر ہیں۔ کانپور، لکھنؤ، فرخ آباد اور علی گڑھ
کے جو حالات تفصیل کے ساتھ دئے گئے ہیں۔ اٹاوہ۔ بلند شہر، بدایوں
مراد آباد۔ شاہجہانپور، بجنور، اعظم گڈھ، بنارس، جون پور، الہ آباد
فیض آباد، سلطان پور، ہمیر پور، جھانسی، نوگانوہ اور مین پوری کے حالات
اختصار کے ساتھ درج ہیں۔ فرخ آباد اور علی گڑھ کے جو حالات اس میں

درج ہیں نہ کسی دوسری تاریخ میں درج نہیں ہیں۔ لکھنؤ میں مجاہدوں نے انگریز جرنیل
کو کافی عرصے تک حصار میں رکھا اور اپنی بہادری کے جوہر دکھائے اور قدم قدم پر شکست
دی۔ یہ شجاعانہ حالات بھی کسی تاریخ میں نظر نہیں آتے۔ اگر رسالہ تاریخ بغاوت
ہند کا مکمل فائل مل جائے تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے متعلق کافی
معلومات فراہم ہوسکتی ہے۔

داستان غدر اصل میں ظہیر دہلوی مرحوم کی ایک خود نوشت
سوانح عمری ہے جس میں انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی سے لیکر ٹونک کی ملازمت
اور الور، جے پور اور ٹونک کے ملازمت کے حالات زیادہ لکھے ہیں۔ ضمناً دہلی کی ۱۸۵۷ء
کی جنگ آزادی کا مختصر حال لکھا ہے۔

مولف کے اپنے ماحول و حالات و واقعات کا تحریر پر اثر پڑتا ہے۔ جس ماحول میں
مولف رہتا ہے اور جس سوسائٹی اور اشخاص کا ممنون احسان ہوتا ہے
اس کو بھی اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ظہیر دہلوی قلعہ میں جانبازوں
میں سے تھے۔ بہادر شاہ ظفر تک ان کی رسائی تھی۔ دہلی میں جنگ آزادی
میں جب ناکامی ہوئی تو انھوں نے دہلی سے باہر جانے کی ٹھانی۔ اور نواب
رامپور کی وساطت سے انگریزوں نے ان کی جان بخشی اس کے بعد انگریزوں
کے پٹھو و حامی راجہ الور، جے پور اور نواب ٹونک کے ہاں ملازم ہوئے
داستان غدر انھیں ایام میں لکھی۔ اس فتنہ پرور زمانے میں ظہیر دہلوی
مجاہدین کی کیسے تعریف کر سکتے تھے۔ مجبور تھے ان کی تذلیل کرنے اور
ان کی پوزیشن کو خراب کرنے اور ان پر رکیک قسم کے الزامات لگانے

کے لئے اور دہلی کی جنگ آزادی کی اہمیت کو گھٹا کر ان کو لچوں بدمعاشوں کی جنگ ثابت کرنے کیلئے جناب ظہیر نے ایسا ہی کیا۔ دہلی کی جنگ آزادی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"کیفیت یہ تھی کہ جس وقت باغیہ باہر جاتے تھے یہ سب بدمعاش ان کے ساتھ ہوتے تھے.... مگر شہر کی خلقت میں سے کوئی مسلمان یا ہندو اعلیٰ تا ادنیٰ کبھی ہمراہ افواج باغیہ دھاوے پر نہیں گیا۔ سوائے ان اجلاف بدمعاشوں کے جو رذیل پوربیوں کے ہمراہ لے کر شہر کو لٹواتے پھرتے تھے.... بیشتر ان میں کاغذی محلہ کشمیری دروازہ کے اطراف و جوانب کے کنجڑے قصائی، کاغذی چوڑے چمار، پانڈی باز پہلوان مثل گامی بدمعاش وغیرہ تھے کوئی شریف نہیں تھا۔"

گویا شہزادے اور دہلی کی انگریزی چھاؤنی کے سپاہی انگریزوں سے لڑنے جاتے تھے اور دہلی میں جسقدر بھی فوج بیرون دہلی سے آکر انگریزوں سے لڑتی تھی ظہیر صاحب کے نزدیک یہ سب لوگ اجلاف رذیل اور بدمعاش تھے۔

جنرل بخت خاں جن کی آمد پر دہلی والوں نے مسرت کا اظہار کیا تھا اور بقول ظہیر دہلوی "جنرل چودہ ہزار کا کمپو اور چند توپ خانہ اور دو تین رجمنٹیں سواروں کی اور کئی لاکھ روپیہ خزانہ بریلی سے لیکر دہلی میں وارد ہوا اور بقول منشی ذکاء اللہ ان کے استقبال کے لئے بہادر شاہ ظفر کے خسر نواب احمد علی خاں صاحب تشریف لے گئے اور قلعہ میں ان کا شاندار استقبال

ہوا جن کی فراست جنگی کا ہر شخص قایل ہے اور جو بہادر شاہ کی انتہائی تعظیم تکریم کرتے تھے۔ اس اولوالعزم و بہادر انسان سے حضرت ظہیر نے یہ واقعہ منسوب کیا ہے۔

"ایکدن کا اور ذکر ہے کہ صبح کا وقت تھا۔ دن کے سات بجے ہیں بادشاہ برآمد ہوئے اور دیوان خاص کے بیچ کے در میں کرسی بچھوا کر بیٹھے ہیں۔ کچھ تھوڑے سے آدمی اس وقت موجود ہیں کرسی کے پیچھے دو خواص کھڑے ہوئے مورچھل جھل رہے ہیں میرے بھنوئی آغا سلطان کرسی کے قریب کھڑے ہیں انکے برابر میں ہوں۔ کوئی پانچ چار آدمی ہیں۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک چھ بیا قربہ اندام، پستہ قد، ادھیڑ۔ پچاس پچپن برس کی عمر منہ پر داڑھی، گاڑھے کا کرتہ، دھوتی بندھی ہوئی۔ سر پر ایک انگوچھا لپٹا ہوا جنہ دھیا کھلی۔ چال کریج افسروں کی اس کے گلے میں پڑی ہوئی عقب حمام چبوترہ کی طرف سے دربار میں آیا اور بادشاہ کو سلام کرکے پاس چلا آیا۔ میرے بھنوئی نے روکا بھی کہ میں ہیں کہاں چلے گئے ہو۔ مگر وہ کیا سنتا تھا۔ پاس آکر بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ سو بڑھو ہم نے تمہیں پایا کیا۔ یہ بات سنکر مجھے تو تاب نہیں رہی مارے غصے کے کانپنے لگا۔ اور ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھکر دھکا دیا۔ اور کہا او بے ادب بے تمیز بادشاہوں کے دربار میں اس طرح گستاخی

کرتے ہیں.... اس نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے بھی تلوار
کھینچ لی جس وقت اس نے قبضہ پر ہاتھ ڈالا ہے تو میرے برابر
ایک سید کا لڑکا نجف گڑھ کا رہنے والا اور میری ہم عمر ہوگا وہ
انگریزی رسالہ میں کوئی عہدیدار تھا۔ میرے برابر سے بڑھ کر
اس نے اس کا گلا اس زور سے دبوچا کہ قریب تھا کہ اسکی
آنکھیں نکل پڑیں۔ ادھر لوگوں نے مجھے روک لیا... بادشاہ
نے اشارہ کیا پیچھے کرسی کے آ جا۔ لوگوں نے دھکے دے کر
دیوان خاص کے باہر کر دیا... مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ
بدبخت جرنیل بخت خاں یہی ہے۔ پیچھے حال کھلا کہ وہ
بریلی والا جرنیل تھا۔"

جرنیل بخت خاں کو دہلی میں آتے ہی بادشاہ نے مرزا مغل کی جگہ فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا تھا۔ اور جنگ کی تمام ذمہ داری سونپ دی تھی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ظہیر دہلوی اور ان کے بھنوئی اور اس وقت بادشاہ کی خدمت میں جو چار پانچ آدمی موجود تھے وہ سب ہی جنرل صاحب سے ناواقف تھے جنرل بخت ایسے نادان و جاہل نہیں تھے کہ ایسے الفاظ بادشاہ کی شان میں کہتے۔ اور اتنے بے اثر بے وقعت اور بے یار و مددگار بھی نہیں تھے کہ ان کو دھکے دیکر دیوان خاص سے نکال دیا جائے۔ اور بادشاہ ان کو غلط گالیاں دیں۔

اس کتاب میں یہ بات قابل تعریف ہے کہ اس میں بہادر شاہ ظفر کی

نام اور ان کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے اور مورخوں کی طرح ان کو نیچا دکھانے یا گرانے کی کوشش نہیں کی۔

سرکشی بجنور میں صرف بجنور کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات سرسید مرحوم نے قلم بند کئے ہیں۔ اس کتاب کے نام سے مولف کے خیالات کا پتہ چلتا ہے کہ بجنور میں مجاہدین نے بدیشی لوگوں کی غلامی کی لعنت کو ختم کرنے کے لئے آزادی کی جنگ میں جو حصہ لیا وہ حب الوطنی نہیں تھی بلکہ سرکشی تھی۔

اسی نظریہ کے تحت سرسید مرحوم نے اس کتاب میں بجنور کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کو کسی بھی صورت سے نہیں سراہا۔ ان کو غدار لکھ کر بھی ان کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ بلکہ جان نثاران وطن کے نام لے لیکر غلامی کا پتلہ سمجھ کر ان کو نازیبا الفاظوں سے نوازا ہے اور غاصب و ظالم انگریز کو آقا کا خطاب دیکر اس کی دل کھول کے مدح سرائی کی ہے اور اپنی جان کو اس کی جان پر نچھاور کرنے کی آمادگی کا اظہار کیا ہے۔ سرسید مرحوم مغفور نے بجنور کے آزادی کے ہیرو محمود خانصاحب کو کم بخت بد ذات اور بدنصیب نامحمود خاں لکھا ہے اور قاضی عنایت رسول جو بجنور کے مشہور قاضی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور بجنور کی جنگ آزادی میں مجاہدین کی رہنمائی کر رہے تھے، ایک معرکہ میں ان کے ساتھ سو سوا سو کے قریب مجاہدین جان نثاری کر رہے ہیں شہادت کا جام نوش فرما چکے ہیں اور قاضی عنایت رسول خود بھی ان شہداء کے زمرے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس موقعہ پر اسی عبارت میں

قاضی صاحب کو "نامی باغی اور مشہور حرامزادہ" لکھنا کسی دل جگر اور بڑے گردے والے کا کام ہے یہ الفاظ سر سید مرحوم نے کس دل سے لکھے اور کس طرح ان کے قلم کو جنبش ہوئی یہ ہم نہیں جانتے بلکہ سرکشی بجنور صفحہ ۱۳۰ کی عبارت نقل کر دیتے ہیں جو انھوں نے تحریر فرمائی ہے۔

"جس فوج نے دائیں طرف سے غنیم پر یورش کی تھی اور باغی بھاگ جاتے تھے اس وقت سرکاری فوج متصل پکے باغ کے جو پائیں کے نام سے مشہور ہے پہنچی اس باغ میں کچھ لوگ مسلح شہر سے بھاگ کر آن چھپے تھے اور کچھ باغی بھی بھاگتے وقت گھس گئے تھے منجملہ ان کے" عنایت رسول جو نامی باغی اور مشہور حرامزادہ تھا" مع جان محمد اپنے ملازم کے اس باغ میں گھس گیا۔ جب سرکاری فوج کے چند سوار اس باغ میں جا کر قریب پچاس ساٹھ آدمی کے قتل کیا اور ساٹھ ستر آدمیوں کو زندہ پکڑ کر گولیوں سے مار دیا۔ عنایت رسول مع اپنے نوکر کے مارا گیا۔ اور اکثر آدمی قاضی محلے کے جو اس باغ میں چھپے ہوئے تھے وہ بھی مارے گئے۔"

ہندوستانیوں کے مذہب و دھرم کے دشمن انگریزوں کے متعلق کیسے جذبات کا اظہار کیا ہے اور کس قدر سر سید مرحوم کو ان سے دلی عقیدت و محبت تھی اس کا اظہار بھی ان کے قلم سے سنئے۔

"اور مجھکو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ اگر میرے آقا میری نسبت بات کہی ہے میں کیوں نہ اس کو کہوں اور کس لئے نہ کہوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کر کر اپنا فخر کرنا

نوکر کا کام ہے۔ یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کرانٹ ولسن صاحب بہادر اقبال صاحب جج اور اسپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ تم ایسے نمک حلال نوکر ہو تم نے نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا.... تم وفادار اور نمک حلال نوکر سرکار رہے۔ اس کے صلہ میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کو رکھی جائے تو بھی کم ہے۔ میں اپنے آقا کا کمال شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھ پر ایسی مہربانی کی اور میری قدر دانی کی۔ خدا ان کو سلامت رکھے"۔ آمین (۶۸)

انگریزوں کی زندگی کی سلامتی کے لئے دعا ہی نہیں مانگی بلکہ ان کو اپنی جان پیش کرنے کے لئے سر سید مرحوم تیار تھے۔ فرماتے ہیں۔

"جناب الیگزنڈر شکسپیر، مسٹر جارج پامر جو اخلاق اور عنایات ہمارے حال فرماتے تھے ان اخلاقوں اور عنایتوں نے ہمارے دل میں ایسی محبت ان صاحبوں کی ڈال دی تھی کہ ان صاحبوں کی خدمت گزاری میں ہم جان کی بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ ہمارا دلی ارادہ یہ تھا کہ خدانخواستہ اگر برا وقت آوے تو ہم پروانہ کی طرح قربان ہو جاویں"۔ (۱۳)

سرسید مرحوم کے نزدیک جس مجاہد نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا وہ شریف نہیں بلکہ بدمعاش و جاہل تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۶۰ء میں جبکہ سرسید مرحوم مرادآباد میں صدرالصدور تھے۔ اس وقت انھوں نے "خیر خواہ مسلمانانِ ہند" کتاب شائع کی تھی۔ اس میں جن لوگوں نے ۱۸۵۷ء میں ملک و قوم کے ساتھ غداریاں کی تھیں انگریزوں کی خیر خواہی میں ان کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ناکام کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان غداروں کا اس کتاب میں ذکر ہے۔ اور جن مجاہدِ وطن کو شہید کیا تھا۔ انکو بدمعاش ثابت کیا ہے۔ ان میں مولینا منہاج الدین عرف منو مرادآبادی بھی شامل ہیں۔ ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"۲۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ایک گروہ بدمعاشوں کا رامپور سے آیا اور گنگا کے کنارے پر ٹھہرا۔ یہ معلوم ہوا کہ منو نامی بدمعاش نے جو مولوی کے نام سے مشہور تھا ان کو بلایا ہے۔ یہی معرکہ ہے جس کو ہمارے مہربانوں نے مشہور کیا ہے کہ مسلمانوں نے مرادآباد میں جہاد کیا تھا۔ اور محمدی جھنڈا کھڑا ہوا تھا۔ یہ منو پوتا تھا مولوی وجیہہ الدین کا اور بھتیجا تھا مولوی اسمٰعیل کا۔ جو چند برس ہوئے کہ شاہ اودھ کی طرف سے سفیر ہو کر لندن گئے تھے۔ اور وہاں سے مراجعت کے وقت مرے۔ اس منو کا اصلی نام منہاج الدین تھا۔ وضع اس کی ایسی تھی جیسے اچھے بدمعاشوں کی ہوتی ہے مطلق پڑھا لکھا نہ تھا۔ یہاں تک کہ اپنا نام بھی نہیں

لکھ سکتا تھا۔ بدمعاشی کا یہ حال تھا کہ جرائم سنگین میں دو دفعہ
قید ہو چکا تھا یعنی ایک دفعہ دس برس، ایک دفعہ سات برس
قید خانہ میں پوری کی تھی "۔ (۴۳)

مولوی منو جاہل تھے۔ یہ بالکل غلط ہے بلکہ بقول عزیز احمد صاحب قادری وچشتی:

"مولوی صاحب کو عربی فارسی اور دیگر علوم کے علاوہ،
انگریزی زبان پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ اُنھوں نے
انگریزی زبان اپنے حقیقی چچا مولینا محمد اسمٰعیل لندنی کی بیوی
سے جو ایک یورپین مہذب خاندان سے تعلق رکھنے والی لیڈی
تھیں پڑھی تھی۔"

مولوی منو کے سزا کے بارے میں بھی سرسید مرحوم کا خیال و رائے صحیح نہیں ہے، ان کی یہ سزائیں اخلاقی نہیں تھیں بلکہ سیاسی تھیں۔ وہ انگریزوں کے سخت ترین دشمن تھے۔ انگریز دشمنی کی پاداش میں ان کو یہ سزائیں دی گئی تھیں۔
سرسید مرحوم کو انگریز کی ہر ادا پسند تھی اس کو جائز بتلاتے اور قرآن مجید و احادیث سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ سور کی چربی کے کارتوسوں کو مسلمان فوجیوں سے دانتوں سے کٹوانے کیلئے انگریز مجبور کرتے تھے جس پر ۱۸۵۷ء کی جنگ کی چنگاری تمام ہندوستان میں پھیلی۔ اس کو سرسید نے اچھا نہیں سمجھا۔ ان کے نزدیک اس سے دین جانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کی مدلل عبارت یہ ہے۔

"ایک اور بات سنو کہ یہ تمام بغاوت جو ہوئی تھی بنا اس کی کارتوس تھا۔ کارتوس کاٹنے سے مسلمانوں کے مذہب کا کیا نقصان تھا ہمارے مذہب میں اہل کتاب کا کھانا کھانا درست ہے۔ اس کا ذبیحہ ہم پر حلال ہے۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ ان میں سور کی چربی ہو گی۔ تو بھی ہمارا کیا نقصان تھا۔ ہمارے ہاں شرع میں ثابت ہو چکا ہے کہ جس چیز کی حرمت اور ناپاکی معلوم نہ ہو وہ چیز حلال اور پاک کا حکم رکھتی ہے۔ اگرچہ ہم یہ بھی فرض کریں کہ یقیناً سور کی چربی تھی تو اس کے کاٹنے سے بھی مسلمانوں کا دین نہیں جاتا۔ صرف اتنی بات تھی کہ گناہ تھا۔ سو وہ گناہ شرعاً بہت درجے کم تھا۔ ان گناہوں سے جو اس غدر میں بد ذات مفسدوں نے کئے"۔ (۳۲)

"سرکشی بجنور" اور "خیر خواہ مسلمانان ہند" سر سید مرحوم نے ۱۸۶۰ء میں چھپوائی تھیں۔ جبکہ وہ انگریزی سرکار کے ملازم تھے۔ اسوقت ان کے خیالات اسی قسم کے تھے۔ مگر بعد میں اس میں تبدیلی آگئی تھی۔ ان اقتباسات کے پیش کرنے کا قطعاً یہ مقصد نہیں ہے کہ ان کی بلند پائیگی کے بارے میں شبہ کیا جائے بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ جو بھی کتاب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بارے میں لکھی گئی ہے اس کا انداز تحریر اسی قسم کا خوشامدانہ تھا ــــ جس پر حقائق کو چھپانا مقصود تھا۔

قیصر التواریخ جلد دوم میں لکھنؤ کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے

کے حالات ہیں۔ یہ جنگ حضرت محل اور برجیس قدر کی قیادت میں شروع کی گئی تھی۔ اس کتاب میں برجیس قدر، حضرت محل اور مجاہدین کی جس قدر بھی ممکن ہو سکتی تھی تذلیل کی گئی ہے۔ اور انگریزوں کی بہادری اور اولوالعزمی کے گیت گائے گئے ہیں۔ کسی کسی صفحہ پر حقیقی واقعات کی جھلک نظر آجاتی ہے

کنزالتاریخ میں بدایوں شہر کے قدیمی حالات پرگنوں، قصبوں، عمارتوں، محلوں، مقبروں اور مسجدوں کی کیفیت و حالات بہت زیادہ ہے۔ دو بارہ صفحات میں مشکل تمام کچھ صفحوں میں جس میں مصائب غدر کی بھی عبارت نقل کی ہے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات درج ہیں مسلمان اور اہیروں کی لڑائی دکھانے کے بعد انگریز اور ہندوستانیوں کے مقابلہ کا معمولی ذکر ہے اس سے کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

مصائب غدر ولیم ایڈورڈس مجسٹریٹ بدایوں کی ڈائری ہے جس کا اردو ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی نے کیا ہے۔ جس میں بدایوں کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بہت ہی مختصر حالات ہیں۔ گویا مجسٹریٹ صاحب کی سرگذشت ہے کہ اس پر آشوب زمانہ میں صاحب بہادر بدایوں سے نکلنے کے بعد کہاں اور کن کن مقامات پر پریشان حال چکر کھاتے پھرے۔ البتہ مجسٹریٹ صاحب نے جنگ آزادی کے اسباب و وجوہات ظاہر کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ اس کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"بلوے سے ایک برس پہلے بلکہ آگے میں نے حکام اعلیٰ سے صاف صاف بیان کر دیا تھا کہ دیوانی عدالتیں اپنے اختیارات بہت

طرح عمل میں لاتی ہیں۔ بھوڑے تھوڑے قرضوں کے لئے منافع درافق
آراضی نیلام کرنا ڈالتے ہیں۔۔۔۔ میرے جتانے پر کچھ التفات
نہیں ہوا اور میں ٹھڈپوک سمجھا گیا کہ تم نے ابتک صرف ملکی صیغے
میں نوکری کی ہے۔ معاملات مالی میں بالکل ناکارمودہ ہو"۔

اخبار الصنادید کا مولف نواب رامپور کا مداح ہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ
آزادی مرادآباد، بریلی، رامپور اور روہیہ میں لڑی گئی تھی اس کے بہت مختصر
واقعات دیکھی اس انداز سے لکھے ہیں کہ ان مقامات کی لڑائیوں کو ناکام کرنے
والے نواب رامپور صاحب ہی تھے۔ انھوں نے ہی انگریزوں کی مدد کی تھی
البتہ نواب رامپور کی اس جنگ کے زمانے میں کیا عزت تھی وہاں مولف عوام
کے خیالات کی صحیح ترجمانی کرنے پر مجبور ہوئے۔ اور صحیح بات و کیفیت لکھی
تاریخ الہ آباد میں جنگ آزادی کی کیفیت صرف ایک صفحہ ۳۲ پر
لکھی ہے۔ لیکن الہ آباد کے مقامات اور خاص طور پر خسرو باغ اور اس
کے ساتھ اکبر ثانی کے صاحبزادے شاہزادے جہانگیر کے حالات تفصیل
کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ جو بالکل بے ربط اور بے جوڑ ہیں۔ کتاب کی ترتیب
صحیح نہیں ہے۔

تاریخ شاہجہانپور میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات کے ساتھ
مقامی شعرا اور اہل کمال کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ یہی ایک ایسی تاریخ
میری نظر سے گذری ہے۔ جس سے مجاہد شعراء کے کارنامے اور ان کا کلام
دستیاب ہوسکتا ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات شائع کرنے کا ارادہ کیا تو انگریزوں کی حکومت کا دبدبہ حائل ہوا۔ انھوں نے انگریزی حکام سے اجازت لیکر "فسانۂ غدر" کے نام سے تیرہ حصے شائع کئے۔ اس میں آزادی رائے کا بھلا کیسے دخل ہو سکتا تھا۔

محاصرۂ دہلی کے خطوط، گرفتار شدہ خطوط، عہد دہلی کے اخبار، بہادر شاہ کا مقدمہ، بہادر شاہ کا روزنامچہ، غدر کا نتیجہ یہ حصے تو یقیناً ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کو شائع کر کے خواجہ صاحب نے اردو تاریخ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ جہاں تک "بیگمات کے آنسو" کا تعلق ہے اس کی حیثیت ادبی اعتبار سے بہت اچھی ہے۔ لیکن تاریخی حیثیت سے قابل اعتبار نہیں ہے۔ "دہلی کی جانکنی" میں تقریباً تمام معلومات "تاریخ عروج سلطنت انگلشیۂ ہند" مولفہ مولینا ذکاء اللہ صاحب سے اخذ کی گئی ہے اور خاتمہ پر لارنس صاحب کی مدح خوانی کے لئے جو واقعات و دلیلیں دی ہیں وہ بھی منشی ذکاء اللہ صاحب کی تالیف میں درج ہیں۔

ثورۃ الہندیہ اور مولینا فضل حق خیرآبادی کے دو منظوم قصیدے یقیناً کسی دباؤ کے ماتحت نہیں لکھے گئے ہیں جس میں دہلی اور لکھنؤ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مختصر حالات مگر جامع درج ہیں اور انگریزوں کے مکر و فریب کا پردہ بھی چاک کیا ہے (جس کا اقتباس مولینا خیرآبادی کے حالات میں آ رہا ہے) لیکن جن جاں نثاران وطن پر انگریزوں نے مظالم ڈھائے تھے ان کے نہ اسماء گرامی ہیں اور نہ ہی ان کے حالات اس میں ملتے ہیں۔

"۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" میں ان شعراء کرام کے حالات درج ہیں جو ۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ میں شہید ہوئے۔ جیلوں میں گئے۔ جیلوں ہی میں زندگیاں بتائیں یا ۱۸۵۷ء سے قبل اس جنگ آزادی کی بنیاد ڈالنے کے لئے انگریزی حکومت کی بیخ کنی، اور اس کی پاداش میں شہید ہوئے یا قید ہوئے۔

اس کتاب کے دو حصّے ہیں ایک حصّہ میں شہید اور دوسرے حصّہ میں اسیر شعراء کے حالات و کلام درج ہیں۔ اس جنگ آزادی کے ہیرو بہادر شاہ ظفر ہیں۔ اس لئے ان کے حالات زندگی سے کتاب شروع کی گئی ہے۔

جناب ماسٹر ائق صاحب بریلوی۔ جناب انور بخت صاحب فرخ آبادی حضرت قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا، قاضی سعید احمد صاحب سکریٹری انجمن فروغ اردو پٹنہ، سید سبط رضا بدایونی، مسٹر مطیع الرحمن صاحب لائبریرین، شعبہ السنہ مشرقی) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، جناب محیط الحسن صاحب لائبریرین (شعبہ السنہ مشرقی) نیشنل لائبریری کلکتہ، جناب قائم حسن صاحب برادرزادہ خدابخش صاحب لائبریرین خدابخش لائبریری پٹنہ، جناب حسن زماں صاحب، جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی، لائبریرین رضا لائبریری رامپور، کا میں بیحد ممنون ہوں۔ ان حضرات نے اس کتاب کے مرتب کرنے میں ہر ممکن اعانت فرمائی۔ اور ادب و علم نوازی کا ثبوت دیا۔

ت ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے اخذ کیا گیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) آثار الصنادید مؤلفہ سر سید احمد خاں صاحب دہلوی (۲) گلستان سخن مؤلفہ مرزا قادر بخش صابر دہلوی (۳) حیات جاوید مؤلفہ مولانا الطاف حسین حالی (۴) مرحوم دہلی کالج مؤلفہ علامہ عبد الحق صاحب (۵) غالب مؤلفہ مہر لاہوری (۶) لیکچروں کا مجموعہ مؤلفہ مولانا ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی (۷) یادگار غالب مؤلفہ الطاف حسین حالی (۸) غدر کی صبح و شام مؤلفہ خواجہ حسن نظامی دہلوی (۹) دہلی کی آخری بہار مؤلفہ علامہ راشد الخیری دہلوی (۱۰) طبقات الشعراء مولوی کریم الدین پانی پتی (۱۱) داستان غدر مؤلفہ ظہیر دہلوی (۱۲) سخن شعرا مؤلفہ مولوی عبد الغفور صاحب نساخ۔ (۱۳) شمیم سخن مؤلفہ مولوی عبد الحی بدایونی (۱۴) خطبات دتاسی مؤلفہ گارساں دتاسی (۱۵) دہلی کی آخری شمع مؤلفہ فرحت اللہ دہلوی۔ (۱۶) تاریخ ادب اردو مؤلفہ سکسینہ (۱۷) بہارستان اندھ مؤلفہ مولوی عبد اللہ عاشق (۱۸) [illegible] مؤلفہ مولوی منظفر حسین (۱۹) تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند مؤلفہ مولانا ذکاء اللہ دہلوی (۲۰) تبصرۃ التواریخ مؤلفہ سید کمال الدین حیدر حسینی (۲۱) وارفتگان فرخ آباد قلمی مؤلفہ رادھا رمن سکسینہ (۲۲) غدر کا نتیجہ مؤلفہ خواجہ حسن نظامی دہلوی (۲۳) دہلی کی جانکنی مؤلفہ خواجہ حسن نظامی دہلوی (۲۴) تذکرہ علماء ہند مؤلفہ مولانا رحمان علی (۲۵) خمخانہ جاوید مؤلفہ لالہ سری رام دہلوی (۲۶) حیات حافظ رحمت خاں

مؤلفہ سید الطاف حسین علیگ بریلوی (۲۷) کنز التاریخ مؤلفہ مولوی رضی الدین
بدایونی (۲۸) غدر کے چند علماء مؤلفہ مولوی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی
(۲۹) مقدمہ بہادر شاہ مؤلفہ خواجہ حسن نظامی دہلوی (۳۰) واقعات
دارالحکومت مؤلفہ مولوی بشیرالدین دہلوی (۳۱) گلشن ہند مؤلفہ مرزا
علی لطف (۳۲) تذکرۂ شعراء فارسی مؤلفہ مولوی عبدالغنی فرخ آبادی (۳۳)
اردوئے معلّٰی مؤلفہ مرزا غالب (۳۴) آب حیات مؤلفہ مولٰینا محمد حسین آزاد
دہلوی (۳۵) اخبار الصنادید مؤلفہ مولوی نجم الغنی رامپوری (۳۶)
مصائب غدر مؤلفہ روداروس (۳۷) تاریخ بلند شہر مؤلفہ لچھمن سنگھ
(۳۸) تاریخ اودھ مؤلفہ مولوی نجم الغنی رامپوری (۳۹) مسلمانوں کا روشن
مستقبل مؤلفہ مولوی طفیل احمد صاحب (۴۰) حیٰوۃ العلماء مؤلفہ مولٰینا عبدالباقی
سہسوانی (۴۱) مرقع اودھ مؤلفہ مولوی احمد علی بی اے (۴۲) انتخاب
یادگار مؤلفہ امیر مینائی (۴۳) صبح گلشن مؤلفہ نواب صدیق حسن خاں صاحب
(۴۴) خیر خواہ مسلمانان ہند مؤلفہ سر سید احمد خاں دہلوی (۴۵) کمپنی کی
حکومت ہندوستان میں مؤلفہ باری علیگ (۴۶) تاریخ فرخ آباد (قلمی)
مؤلفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی (۴۷) حیات السیر (قلمی) مؤلفہ
علامہ مجلسی دہلوی (۴۸) لوح تاریخ (قلمی) مؤلفہ سید بہادر علی (۴۹)
تاریخ نوابان بنگش مؤلفہ ولیم آر۔ بین (۵۰) گزیٹیر فرخ آباد مؤلفہ ایچ۔ آر۔ نیول
(۵۱) روزنامچہ (قلمی) مؤلفہ نواب ولایت حسین فرخ آبادی (۵۲) تاریخ ہند
مؤلفہ مولٰینا ذکاء اللہ دہلوی (۵۳) تذکرۂ عالم مولوی رحیم بخش۔

(۵۴) رہنمائے دہلی مؤلفہ مینویل (۵۵) سیرت فرخ آباد (قلمی) نواب ولایت حسین
(۵۶) تذکرۂ ہندی مؤلفہ مصحفی امروہوی (۵۷) تذکرہ شعراء اردو۔ مؤلفہ
میر حسن دہلوی (۵۸) یادگار شعراء مؤلفہ اسپرنگر (۵۹) تاریخ شاہجہانپور
مؤلفہ مولوی صبیح الدین خلیل (۶۰) تاریخ تحفۂ راجستھان مؤلفہ عبید اللہ فرحتی
(۶۱) تاریخ نادر العصر مؤلفہ کرنل سانڈرس (۶۲) واقعات اظفری مؤلفہ
مرزا علی بخت اظفری (۶۳) تاریخ الہ آباد مؤلفہ مولوی مقبول احمد صمدنی
(۶۴) تاریخ صوبہ بہار مؤلفہ مولوی سید محمد علی عظیم آبادی (۶۵) محاربہ عظیم
مؤلفہ کنھیا لال (۶۶) فتاوے عزیزیہ مؤلفہ شاہ عبد العزیز دہلوی
(۶۷) کوہ نور لاہور ۱۹ دسمبر سنہ ۱۸۵۷ء (۶۸) باغی ہندوستان مؤلفہ
محمد شاہد خاں شیروانی (۶۹) فتح نامہ انگریزی مؤلفہ فراسو۔ (۷۰)
حدیقہ شعراء مؤلفہ مرزا جان (۷۱) العلم کراچی جنگ آزادی نمبر جون سنہ ۱۹۵۶ء ایڈیٹر سید
الطاف علی بریلوی (۷۲) تاریخ پنجاب تحفۂ احباب مؤلفہ منشی عبد الکریم۔ (۷۳)
مغل اور اردو مؤلفہ سید نصیر حسین خیال (۷۴) بہادر شاہ ظفر مؤلفہ
امیر احمد علوی (۷۵) بہار سخن مؤلفہ سندر لال برق سیتاپوری (۷۶)
کارنامہ سروری مؤلفہ نواب ضیاء الدولہ (۷۷) گلشن بیخار مؤلفہ
شیفتہ دہلوی (۷۸) تاریخ بغاوت ہند مؤلفہ مکند لال اکبر آبادی
(۷۹) صادق الاخبار دہلی سنہ ۱۸۵۷ء (۸۰) دہلی اردو اخبار سنہ ۱۸۵۷ء
ایڈیٹر مولانا محمد باقر شہید نیرنگ (۸۱) صحیح السیر فی کوائف الخلفاء (قلمی) مؤلفہ مولوی
احمد رضا بدایونی (۸۲) سنہ ۱۸۵۷ء مؤلفہ میاں محمد شفیع۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہیرو

بہادر شاہ ظفر دہلوی

دہلی پر انگریزوں کا تسلط شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں ہوا تھا۔ یہی وہ بادشاہ ہے جس کے دور میں دہلی والے بدیسی حکومت کے غلام بنائے گئے تھے۔ اور یہی وہ دور ہے جب دہلی کی جنگ آزادی کی تحریک کی ابتدا ہوئی۔ اور اس کے ہیرو ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر بنے جنھوں نے تمام ہندوستان کی تحریک آزادی کی رہنمائی کی اور ملک کے کونے کونے میں انقلابی چنگاریاں پھیلائیں

شاہ عالم ثانی

بہادر شاہ ظفر کے دادا شاہ عالم ثانی اٹھارہویں صدی کے آخری حصہ میں ۲۵ جون ۱۷۲۸ء کو پیدا ہوئے جب کہ ہندوستان میں طوائف الملوکی شباب پر تھی۔ ہندوستان میں نا قابل ریاستیں قائم تھیں۔ حیدرآباد میں نظام دکن بادشاہ بنے ہوئے تھے۔ گائیکواڑ اندر کاٹھیاواڑ میں بجو نسلا راج کر رہے تھے۔ مالوہ میں سندھیا اور ہلکر حکمران تھے مرہٹوں سے راجپوتوں کی ریاستیں آمادۂ جنگ و پیکار رہتیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں بنگال آگیا تھا۔ روہیل کھنڈ اور الٰہ آباد کو رہ اودھ کے وزیر کی ملکیت میں تھے۔ پنجاب پر سکھ چھائے ہوئے تھے۔

بنگال کی فتح کی فکر

شاہ عالم نے جوانی میں قدم ہی رکھا تھا کہ بنگال

کو فتح کرنے کی فکر ہوئی۔ اسی اثناء میں ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ مطابق نومبر ۱۷۵۹ء ان کے والد ماجد عالمگیر ثانی قتل ہوئے۔ کام بخش تخت پر بیٹھ گیا احمد شاہ درانی نے جب دہلی پر حملہ کر کے فتح کیا۔ تو شاہجہاں ثانی کام بخش کو معزول کر کے مقید کیا۔ اور مرزا جواں بخت خلف شاہ عالم ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ جب شاہ عالم کیلئے والد کے انتقال کی خبر ایک مہینے کے بعد بہار کے ایک گاؤں کوتونی میں ملی تو اسی وقت سے وہ تخت پر بیٹھے۔[۱]

شاہ عالم کی فتح

شاہ عالم انگریز کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو ناقابل برداشت سمجھتے تھے۔ جب ان کے والد عالمگیر ثانی ۱۷۵۹ء میں زندہ تھے۔ نواب میر جعفر جو انگریزوں کا زبردست حامی تھا۔ سید ہدایت علی خاں و مرزا رضا علی خاں اور محمد قلی خاں جو صوبہ الہ آباد کے لشکر کا مشیر مدارالمہام تھا کو ہمراہ لے کر اس پر چڑھائی کر دی۔ جب یہ لشکر شاہ آباد پہنچا رام نرائن جو میر جعفر کا گرگہ تھا وہ سخت گھبرایا۔ اس نے میر محمد جعفر خاں اور انگریزوں کو متواتر خطوط روانہ کئے کہ ہماری مدد کرو۔ فوج بھیجو۔ لیکن کسی نے بھی فوج نہیں بھیجی۔ مجبوراً رام نرائن کو شاہ عالم کی اطاعت کرنی پڑی۔ اور یہ صوبے ان کے حوالے کر دیئے۔

شاہ عالم کے ساتھ دھوکہ

شاہ عالم جب قصبہ داؤدنگر کے قریب پہنچے تو مدار الدولہ مرزا محمد علی موسوی اور مرزا اسحاق کشمیری کو تین سو آدمیوں کے ساتھ رام نرائن کے پاس

---

[۱] تاریخ ہندوستان کا دولتہ نہم صلا۳۱۱

روانہ کیا۔ ان لوگوں نے اس کو بادشاہ کی خدمت میں آنے کے لئے آمادہ کیا۔ چنانچہ وہ قصبہ پھلواری میں بادشاہ کی خدمت میں پہنچا۔ وعدے وعید کئے اور ملازمت بھی قبول کی۔ لیکن رسد لانے کے بہانے رخصت ہوا۔ اور قلعہ میں پہنچکر لڑائی کا انتظام کرنے لگا۔ اس اثنا میں اسکو انگریزی فوج کے آنے کی خبر ملی۔ شاہ عالم شہر میں داخل ہونا چاہتے تھے تو اس نے شاہ عالم کو شہر میں داخل ہونے سے روکا اور کہلا کر بھیجدیا کہ آپ شہر میں داخل ہوں گے تو اس سے شہر والوں کو تکلیف ہوگی۔ اس نے یہ بھی کہلوایا تھا کہ میں نہ آپ کا نوکر ہوں اور نہ تابعدار جو کچھ میں نے آپ کے ساتھ سلوک کیا تھا وہ مہمان کی حیثیت سے کیا تھا۔

اس جواب کے بعد محمد قلی خاں نے اپنی فوج کو قلعہ سر کرنے کا حکم دیا۔ یہ لڑائی پورب کے حصار کی طرف ہوئی تھی۔ جنگ خوب ہوئی لیکن نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ اتنے میں شاہ عالم کو انگریزی فوج کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ شاہ عالم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ محاصرہ چھوڑ کر شجاع الدولہ کی امداد کے بھروسہ پر بنارس کی طرف روانہ ہوئے[1]

دوسرے معرکہ میں شاہ کی فتح

بادشاہ کے واپس آنے کے بعد میر جعفر عظیم آباد پر قابض ہوگیا۔ غرور و تکبر کا پتلہ بن گیا تھا۔ عوام پر ظلم ڈھانے لگا۔ اس کے ظلموں کا شکار رہلیر خاں اور کامگار بھی تھے۔ یہ دونوں بندھیل کھنڈ سے پانچہزار فوج کے ساتھ شاہ عالم

[1] تاریخ عدبہ بہار ص۵۳

کے پاس پہنچے۔ کامگار خاں نے سامان جنگ کی ذمہ داری خود لی اور زمینداروں سے اتنے عرصہ روپیہ وغیرہ جمع کیا۔

تجویز یہ رکھی گئی کہ میرن کے آنے سے پہلے رام نرائن سے لڑا جائے اور اسکو شکست دیکر عظیم آباد کے قلعہ پر قبضہ کیا جائے۔ بادشاہ کو یہ تجویز پسند آئی۔ اسی وقت فوج کو کوچ کرنے کا حکم دیا۔ رام نرائن کا لشکر دیوبا ندی کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ کامگار خاں اور دلیر خاں نے رام نرائن کے لشکر کے برابر اپنی فوج کا پڑاؤ ڈالدیا۔ کئی دن کے بعد جنگ شروع ہوئی۔

سب سے پہلے دلیر خاں اور اصالت خاں نے حملہ کیا۔ اور رام نرائن کی فوج میں گھس گئے۔ بندوق اور چھروں سے حملے ہونے لگے۔ ان دونوں بھائیوں نے ایسی دلیری اور بہادری کا ثبوت دیا کہ ساری زمین دشمنوں کی لاشوں سے پٹ گئی۔ رام نرائن کی فوج کے چھکے چھوٹ گئے۔ لاتعداد دشمنوں کو جہنم واصل کرتے ہوئے خود بھی تین سو ساتھیوں کے ساتھ یہ جاں بحق ہوئے۔

توپیں اور بندوقیں نیل ہو چکی تھیں۔ کامگار خاں جو ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی فوج کے ساتھ رام نرائن کے پاس جا پہنچا۔ رام نرائن کی فوج دلیر خاں کی فوج سے لڑکر ہمت ہار چکی تھی۔ دوبارہ کامگار کی فوج سے مقابلہ نہیں کر سکی۔ پسپا ہوئی۔

شاہ عالم کو شکست

جب رام نرائن نے نقشہ پلٹا ہوا پایا۔ تو دوران جنگ میں کپتان کا کری صاحب کو پیغام

بھیجا کہ اس فوج میں سے نصف فوج میری مدد کے لئے بھیجدو۔ اس نے آدھی
فوج بھیجدی۔ یہ لوگ بھی جنگ کے تھکے ہوئے تھے مقابلہ نہ کر سکے۔ کامگار خاں
نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ اور اپنا گھوڑا رام نرائن کے ہاتھی کے پاس لیجا کر کھڑا
کر دیا۔ اور اتنے تیر اور نیزے مارے کہ یہ سمجھے کہ وہ مر گیا ہے۔ وہ زخمی ہو کر
حوضی میں لیٹ گیا۔ اور تختوں کی آڑ میں ہو گیا۔ رام نرائن کے بہت سے
ساتھی مارے گئے۔ شاہ عالم کو فتح ہوئی۔ تو اس نے فوج کا تعاقب نہیں
کیا۔ بلکہ فوج کو کھیت پر ڈٹے رہنے کا حکم دیا۔ اتنے میں انگریزی فوج آگئی۔
اس سے ۱۸۔ فروری ۱۷۶۰ء کو بادشاہ کو شکست ہوئی۔

بادشاہ اس شکست سے بددل نہیں ہوا۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ
مرشدآباد انگریزی فوج سے خالی ہو چکا ہے وہ پہاڑوں کے راستوں سے فوج
کو مرشدآباد کے درمیان میں ڈال کر دارالسلطنت پر قبضہ کرنے کے ارادے
سے چلا۔ مگر اس سے قبل کہ شاہ عالم مرشدآباد پہنچے۔ انگریزوں نے اس کو
راستے میں روک لیا۔ اور ۷۔ اپریل کو شکست دیدی۔

شاہ عالم عظیم آباد آرہے تھے کہ راستے میں موشیر لا فرانسیسی ملا۔
اس کے پاس پانچسو فرانسیسی تھے۔ بادشاہ نے ان فرانسیسیوں کی
اعانت سے قلعہ عظیم آباد کو گھیر لیا تھا۔ متواتر حملوں سے یقین تھا کہ
کہ دیوار حصار ٹوٹ جائے گی۔ موشیر لا اور زین العابدین دانائی کے
ایسے جوہر دکھا رہے تھے کہ اہل حصار دہل گئے اور ان کے جی چھوٹ

گئے کہ اب بادشاہ کی فوج آئی اور ہم ان کے قبضہ میں گئے لیکن میجر فوکس بردوان سے دو سو گورے سپاھی اور ہندوستانی فوج تیرہ دن میں تین سو میل مسافت طے کر کے حاجی پور سے دریا پار ہو کر شہر میں داخل ہو گیا۔ جس سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ غالب فوج مغلوب ہو گئی۔ اور جیتی ہوئی بازی ہر گئی۔ بادشاہ جنوب کی طرف گیا چلے گئے۔

شکست پر شکست گیا کے علاقہ سے بادشاہ کو کافی امید تھی ان کا خیال تھا کہ یہاں کے تمام لوگ اس کا ساتھ دیں گے۔ لیکن سوائے خادم حسین کے کسی نے انکی امداد نہیں کی خادم حسین کی مدد پاکر بادشاہ نے پٹنہ پر حملہ کر دیا مگر کپتان فوکس نے راجہ شتاب رائے کو اپنا حامی اور ہم نوا بنا کر بادشاہ کو پھر شکست دیدی بادشاہ شمال کی طرف روانہ ہوئے۔ انگریزی اور میر جعفر کی فوج نے ان کا تعقب کیا ۱۷۶۱ء میں بنگال کی سپاہ سے شاہی فوج پھر ہاری۔ اس میں موسیو لابھی گرفتار ہوا۔ اور آخر تک لڑتا رہا۔

دوسرے روز انگریزی افسر بادشاہ کی خدمت میں آئے اور چوبیس لاکھ روپیہ سالانہ خراج بادشاہ کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ مگر بادشاہ نے منظوری نہیں دی تھی۔

شجاع الدولہ دہلی سے اودھ میں آئے اور یہاں سے روانہ ہو کر شاہ عالم سے سرائے سید راجی میں ملے۔ ۱۱۷۵ھ میں بادشاہ نے ان کو خلعت وزارت مرحمت کیا۔ شجاع الدولہ بادشاہ کو ساتھ لے کر بنارس کی طرف

ھ تاریخ صوبہ بہار ۹۱

انگریزوں سے لڑنے کے لئے چلے۔ ۲۳۔ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو انگریزی سپاہ نے نواب کی فوج کو بکسر میں ناکام کر دیا۔

شاہ عالم کی انگریزوں سے صلح

بادشاہ دو برس تک لڑتے لڑتے تنگ آگئے تھے۔ کامیابی کی صورت کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ انگریز بھی صلح کرنی چاہتا تھا۔ چنانچہ بکسر کی اس جنگ کے بعد بادشاہ سے انگریزوں نے صلح کی۔ اور دونوں کے درمیان یہ طے ہوا۔

"شروع سال ۱۱۶۶ھ سے بنگال، بہار، اڑیسہ صوبوں کی دیوانی بلا شرکت غیرے کمپنی کو دی گئی۔ اور خراج دیوانی جو اب تک لیا جاتا تھا معاف کیا۔ اور چھبیس لاکھ روپے نواب جعفر جو دیتا تھا اس کا ادا کرنا سرکار کمپنی کے ذمہ ہوا[1]۔ اور سرکار بنارس اور غازی پور بطور جاگیر سرکار کمپنی کو دی گئی۔ صوبہ الہ آباد بادشاہ کے پاس رہا۔

دہلی شاہ کے قبضہ میں

۱۷۷۱ء میں بادشاہ کی خواہش ہوئی کہ دہلی کے تخت پر بیٹھیں۔ انگریزوں نے ان کی خواہش کو پورا کرنے سے گریز کیا۔ تکاجی ہلکر اور مہاجی سندھیا کی امداد بادشاہ کو لینی پڑی۔ جب دہلی کے تخت پر بیٹھے۔ انگریزوں کو مرہٹوں کی دوستی ناگوار گذری انھوں نے اس دوستی کا بہانہ لے کر کہ۔ تم ہمارے دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہو۔ الہ آباد و کوڑہ کو ضبط کر کے پچاس لاکھ میں شجاع الدولہ کو فروخت کر دیا

[1] آئینہ تاریخ نما دوم ص[illegible]

اور لارڈ کلائیو نے تین صوبوں کی دیوانی کے عوض چھبیس لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کو ادا کرنا بند کر دیا۔[1]

جب دہلی پر مرہٹوں کا اقتدار زیادہ بڑھنے لگا تو غلام قادر کو یہ بات ناگوار گذری۔ مرہٹوں سے لڑنے کے لئے تیار ہوا۔ ۱۷۸۸ء میں جنگ ہوئی۔ موقع پاکر غلام قادر نے بادشاہ کو تنہا پاکر قید کر لیا۔ اور بادشاہ کی دونوں آنکھیں نکال لیں۔ اس کے بعد غلام قادر کی مرہٹوں سے جنگ ہوئی۔ غلام قادر ہارا۔ گرفتار ہوا۔ اس کو اندھا کر کے ناک، کان، ہاتھ پاؤں کاٹ کے شاہ عالم کے پاس بھیجا۔ لیکن وہ بادشاہ کے پاس پہنچنے نہیں پایا تھا کہ لیجانے والوں نے راستہ ہی میں اسے ایک درخت میں سر نیچے اور دھڑ اوپر کر کے ٹانک دیا۔ زخمی تو پہلے ہی تھا دم نکل گیا۔[2]

دہلی پر انگریزوں کا قبضہ

۱۸۰۳ء میں سندھیا اور ۱۸۰۳ء میں جسونت سنگھ ہولکر سے انگریزوں کی جنگ ہوئی انگریز غالب آئے اور ان کا دہلی پر قبضہ ہو گیا۔ اور شاہ عالم ثانی سے یہ معاہدہ ہوا۔

شاہ عالم اور انگریزوں کا معاہدہ

عدالت ہائے انصاف خواہ فوجداری خواہ مذہبی۔ خواہ دیوانی شرع محمدی کے مطابق ہوگا۔ عدالت فوجداری کا حکم جو قید سیاہ و کثیر یا سزائے موت پر مشتمل ہوگا۔ بغیر بادشاہ کی مرضی اور منظوری کے عمل میں نہیں لایا جائیگا

---

[1] آئینہ تاریخ نما دوم صفحہ ۲ - [2] واقعات دارالحکومت دہلی صفحہ ۶

اور تمام دعووں اور مقدمے کے فیصلوں کی اطلاع ہر روز بادشاہ کو دی جایا کریگی۔ ایک لاکھ کے قریب خرچ بادشاہ کا مقرر ہوا۔ اس کے علاوہ دس ہزار روپے سالانہ مرمت قلعہ و مکانات کے لئے ملیں گے۔ اندرون شہر زمین یعنی مفتوحہ شاہی بادشاہ کی ملکیت ہوگی۔ اس کا انتظام ریذیڈنٹ کرے گا حساب وکتاب سے بادشاہ کو مطلع کرتا رہیگا۔ فوج اور پولیس کے اخراجات کمپنی برداشت کرے گی۔ ان محالات کی کل نکاسی خاص آمدنی بادشاہ کے نذر رہے گی"۔

انگریزوں پر بادشاہ کا رعب

اس زمانے میں خواہ بادشاہ کی کیسی ہی حیثیت تھی عوام میں بادشاہ بہت مقبول تھے جس کی وجہ سے کمپنی کو بھی احترام کرنا پڑتا تھا اور بڑی اہم تقرریاں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کرتی تھی اس کی منظوری بادشاہ سے لیتی تھی۔ چنانچہ گورنر جنرل ہاگ کی تقرری کے بعد لازمی تھا کہ بادشاہ سے منظوری لیجائے۔ سپریم کورٹ کے ججوں کا تقرر بھی بادشاہ کی منظوری سے ہوتا تھا[1]

شاہ عالم سے صلح کرتے وقت انگریزوں کا قطعاً یہ خیال نہیں تھا کہ وہ سلطنت مغلیہ کے وجود کو مٹانے کے لئے کوئی قدم اٹھائے اور اپنی ایک خود مختار حکومت بنائے بلکہ مغلیہ بادشاہ کی آڑ میں وہ اپنے مقاصد کو پورا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام لکھے۔ (؟) ۱۳ جولائی ۱۸۰۴ء کی چٹھی میں اس امر کا صاف لفظوں میں اقرار کیا

[1] آئینہ تاریخ نما صفحہ ۲۲۰

کہ شاہی خاندان منگیر میں مقیم ہوں لیکن بادشاہ اس انتقال مکانی کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ اور بادشاہ کے خاندان کے ہر فرد اور بادشاہ کے متعلقین اور ہر دہلی والے نے اس کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔ اور بادشاہ تو انتہائی غضب ناک ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ مجھ میں ابھی زندہ رہنے کی قوت موجود ہے۔ اور زندہ آدمی کو کوئی شخص اپنی پسند کردہ قبر میں دفن نہیں کر سکتا۔"

جس کی وجہ سے لارڈ ولزلی نے اس خیال کو اس وقت ترک کر دیا لیکن اس سے خاندان شاہی کے لوگوں کو انگریزوں کی نیت سے ایک عام بدگمانی پیدا ہو گئی۔

اس کش مکش کی زندگی میں ۷۔ رمضان کو ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۸۰۶ء کو شاہ عالم ثانی نے انتقال کیا۔ موتی مسجد قطب صاحب میں دفن ہوئے۔ تاریخ وفات میر نظام الدین صاحب ممنون نے حسب ذیل کہی

شور بس روئے زمیں سے اٹھا ہے کسوف آفتاب سلطنت

گو مرقد پر یہ تاریخ کندہ ہے کہ

بود آفتاب روئے زمیں بود چشم ازل شد آفتاب زیر زمیں آہ و آسماں

شاہ عالم کی شاعری

شاہ عالم کو فن شعر سے کافی انس تھا۔ آفتاب تخلص تھا۔ سودا۔ میر۔ لقیر

"فرانسیسیوں کو ہندوستان کے شمالی مغربی اضلاع میں قوت و غلبہ حاصل ہوگیا تھا جب ہم نے شہنشاہ شاہ عالم کو فرانس کے اثر سے چھڑا لیا ہے اور فرانسیسی گورنمنٹ اس زبردست آلہ سے محروم ہوگئی ہے جس کی آڑ میں برٹش گورنمنٹ کے خلاف فرانس کو ہندوستان پر قبضہ کرنا مقصود تھا۔ اب ہم بادشاہ اور اس کے خاندان کے لئے امن و راحت کے ذمہ دار ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ریاستیں ہم پر اعتماد کرنے لگی ہیں کیونکہ ہم نے بادشاہ کو مرہٹوں اور فرانسیسیوں کی قید سے رہائی دلوائی ہے اور ہم کو ضرورت ہے کہ ہم سب کی نظروں میں بادشاہ کے حامی نظر آئیں"۔

بادشاہ کی مقبولیت انگریزوں کو کھٹکی

لیکن بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو بادشاہ کی مقبولیت جو عوام میں حاصل تھی کھٹکنے لگی۔ اور اس سے اس کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ وہ اس انداز سے سوچنے لگی۔

"یہ آبائی سلطنت اسی طرح اگر چلتی رہیگی اور بادشاہی رہے گی بادشاہ دہلی کے لال قلعہ میں آباد رہیگا اور اس کے مصاحب جو اس کے حضور میں حاضر رہتے ہیں یوں ہی رہتے رہیں گے۔ اور عوام ان کے ساتھ جاں نثاری اور وفاداری کرتے رہیں گے تو ایک دن ایسا آئے گا کہ اس تباہ حال سلطنت کو شاہ عالم کے جانشینوں میں سے، کوئی شخص بحال کر لیگا"۔

شاہ کو مونگیر بھیجنے کی تجویز

ان خطرات کے پیش نظر یہ تجویز بادشاہ کے سامنے پیش کی گئی

ذشاد، زار، ممنون، احسان، مقاسم، فراق سب ان کی سرکار میں پہنچے کمالات دکھلا چکے تھے۔ چار دیوان مرتب کئے گئے۔ بقول مصنف "آب حیات" ایک ضخیم قصہ نثر بھی نہایت شستہ و دلچسپ عبارت میں حضرت کی یادگار ہے۔ نمونۂ کلام یہ

صبح تو جام سے گزرتی ہے — شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے — اب تو آرام سے گزرتی ہے
بات کیجئے غیر سے اور ہم سے منہ کو موڑیے — کچھ خدا سے ڈریے ان جفاؤں کو اپنی چھوڑیے
منہ نہ موڑے گا یہ عاصی گر یہی منظور ہے — لیجئے سنگ جفا اور شیشۂ دل توڑیے

چوں شمع تا سحر شب فرقت میں آفتاب
بے اختیار مجھکو رلاتی ہے چاندنی

وہ گلبدن جدا ہے ہم آغوش ہو کہیں — چوں غنچہ پیرہن میں نہ پھولے سمائیے
ہے مدتوں سے منتظر جلوہ آفتاب — مکھڑے سے تم نقاب کو جلدی اٹھائیے
چھیڑنے کا تو مزا یہ ہے کہو اور سنو — باتیں میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو!
اے صنم جس سے جہاں بھر کی شناسائی کیجئے — کیا ہے لازم پھر اس سے بیوفائی کیجئے

اسقدر افسردہ دل کیوں اندنوں ہے آفتاب
دیکھکر ہوتا ہے مجھکو تنگ دل گلزار کا

اکبر شاہ ثانی اکبر شاہ ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ مرزا جواں بخت کا جب انتقال ہوا تو یہ شاہ عالم ثانی کے ولیعہد

۱؎ گم کردہ پیرہن ہے

مقرر ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد ۱۸۰۶ء میں تخت نشین ہوئے مولیناصہبائی نے تاریخ تخت نشینی کہی ؎

بسر چو کردہ لباس خلافت اکبر شاہ — بشرف دولت و اقبال و عزت ناموس
سروش غیب اندوئے بدیہ یک نگاہ — جہیز عشرت پرویز۔ گفت سال جلوس

سرکار کمپنی کی طرف سے نذریں پیش ہوئیں سلامی کی توپیں چلیں جشن تخت نشینی دھوم دھام سے ہوا۔

انگریزوں سے خراج بڑھانے کا مطالبہ

شاہ عالم ثانی کے مصارف معذوری کی وجہ سے بہت کم تھے۔ جو خراج ان کے لئے مقرر تھا وہ کافی تھا۔ اکبر ثانی جب تخت پر بیٹھے ان کی طبیعت میں اولوالعزمی تھی۔ اس کے علاوہ پہلے بادشاہوں کی اولاد اور بہت سے شہزادے تھے۔ جن کی پرورش بادشاہ کے ذمہ تھی اور شاہ عالم کی اولاد کے معمولی نہیں بلکہ بڑے بڑے وظیفے مقرر تھے بادشاہ کے لئے جو وظیفہ مقرر تھا اس کو وہ خراج سمجھتے تھے۔ یہ ان کے اخراجات کے لئے ناکافی تھا اس لئے انھوں نے اس کے اضافہ کے لئے کوشش کی۔ اور اپنے بیٹے کو جو لکھنؤ میں نواب وزیر کے پاس تھے یہ خط لکھا۔

"جو روپیہ خزانہ میں شاہ عالم کا جمع کیا ہوا تھا وہ سب خرچ ہوگیا۔ انگریزی گورنمنٹ نے جو خراج ملک کا مقرر کیا ہے وہ کافی نہیں ہے تم ایسی تدبیر نواب وزیر سے کرو جو میرے مدعا حاصل کرنے میں کوشش کرے۔"

یہ خط لکھنؤ کے رزیڈنٹ مسٹر بیلی کے ہاتھ کسی طرح لگ گیا۔ اسپر شہزادہ کو منع کیا۔
اور دہلی کے رزیڈنٹ نے بھی بادشاہ کو ایسی حرکت سے باز رکھنے کی تلقین کی
کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بلکہ نقصان پہنچنے کا احتمال زیادہ ہے اس پر
بادشاہ نے دو وکیل گورنر جنرل کے پاس کلکتہ بھیجے۔ وہاں کوئی شنوائی نہیں
ہوئی[1] بلکہ جو آمدنی شاہی جاگیر سے ہوتی تھی وہ بھی چھپائی جانے لگی۔

مجبوراً اکبر بادشاہ نے راجہ رام موہن رائے کو جو بنگال کے مشہور و معروف
برہمو سماج کے رہنما اور اپنے دور کے مانے ہوئے اور کامیاب مصلح تھے ان کو
سفیر بنا کر لندن بھیجا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے جو عہد نامے ہوئے تھے وہ انکے
ہمراہ کئے۔ راجہ صاحب نے بڑی قابلیت کے ساتھ بادشاہ کے خیالات کی
ترجمانی کی۔ اور مطالبات کے جواز میں معقول وجوہات اور دلیلیں پیش کیں
ان شرائط کا بھی ذکر کیا۔ جو شاہ عالم ثانی کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی نے
طے کئے تھے جس میں وضاحت کے ساتھ یہ بات قرار پائی تھی کہ اگر جاگیر کی
آمدنی بڑھ جائے گی تو اس کا حقدار بادشاہ ہوگا راجہ صاحب نے مطالبہ
کیا کہ جاگیر کی کل آمدنی اس وقت تیس لاکھ کے قریب ہے اس کا حقدار
بادشاہ ہے۔ اس لئے اس کا خراج بڑھایا جائے۔ راجہ صاحب کا
استقبال تو شاندار کیا گیا۔ لیکن بامراد واپس نہیں ہوئے ناکام لوٹے۔

شاہ کی طرف سے گورنر کی توہین

اکبر ثانی ایسٹ انڈیا کمپنی سے خراج
لیتے تھے۔ حکومت یہاں کا پورا قبضہ

[1] تاریخ ہند ذکاء اللہ نہم صـ۳۲۳

نہیں تھا۔ لیکن جو چیز ان کے قبضہ میں تھی اس پر پوری طرح سے حاوی تھے۔ اور اپنے دربار میں اپنے خاندانی آداب کو قائم رکھنے پر پوری طرح مستعد تھے۔

اس خاندان کے آدابوں میں ایک یہ بھی آداب تھا کہ خاص خلوتی صحبتوں میں وزیروں اور بڑے امیروں کو بیٹھنے کی اجازت ملتی تھی۔ اور یہ بڑی عزت و توقیر سمجھی جاتی تھی۔ مگر بادشاہ کے علاوہ کسی دوسرے امیر و وزیر کے سامنے پیچوان نہیں لگتا تھا۔ محمد شاہ نے اس قاعدہ میں کچھ تبدیلی کی اس کے دور میں تمام خاص امیروں کو حقہ اور کبھی کبھی پان بھی ملنے لگا تھا اس عزت کی حصول کے لئے بڑے بڑے جتن کئے جاتے تھے۔ اور قیمتیں چکائی جاتی تھیں۔

اکبر ثانی نے بھی اس آداب کو اپنے دربار میں برقرار رکھا۔ اس کے دربار میں لوگوں کو حاضر ہونے کی بڑی خواہش و تمنا ہوتی تھی۔

چنانچہ لارڈ ماٹرا گورنر نے دربار میں حاضری کی خواہش کی جس کو شرف قبولیت عطا ہوا۔ اور حکم ہوا کہ "اچھا آئیں عزت بخشی جائے گی"۔ پھر درخواست گذری کہ وہ پیچوان عنایت ہونے کے امیدوار ہیں۔ بادشاہ نے اس پر سکوت اختیار کیا۔ سمجھا یہ گیا کہ درخواست قبول ہو گئی ہے۔

گورنر جنرل حاضر دربار ہوئے۔ بادشاہ نے اخلاقاً انہیں کرسی عنایت ہونے کا حکم دیا۔ ماٹرا آداب بجا کر بیٹھ گیا۔ مگر پیچوان سامنے نہیں آیا۔ انتظار کیا۔ نہ آنے پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر اجازت لے کر کورنش عرض کر کے چلا گیا۔

اکبراس معاملہ میں دوسرا عالمگیر تھا۔ وہ اپنے درباری آداب سے برتر نہ سرکا۔ بادشاہ سے شکایت کی گئی۔ مگر انھوں نے پرواہ نہیں کی۔ ماثرا بدلہ لینے کے منصوبے بنانے لگا۔[1]

بادشاہ کے احترام کو ختم کرنے کے منصوبے

ادھر انگریز ہندوستان کے کافی حصوں پر قابض ہوچکا تھا۔ اپنی طاقت کا اسکو احساس تھا۔ دہلی کے بادشاہ کی عزت و تعظیم کو کیسے برداشت کرتا کہ اس کے قوم کے افراد دہلی کا انگریزی رزیڈنٹ اور خصوصاً گورنر جنرل بادشاہ کے سامنے کورنش بجالائے۔ انھوں نے اس کے احترام و عزت کو ختم کرنے کی کوشش شروع کی۔

چنانچہ سیٹن صاحب وزیڈنٹ دہلی کے نائب چارلس مٹکاف اس احترام سے بہت جلتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بادشاہ کے احترام کو اس طرح قائم و زندہ رکھنا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک مراسلہ میں جو گورنمنٹ کو بھیجا تھا۔ اس خیال کا اظہار کیا تھا۔[2]

> میں اس پالیسی کے ساتھ موافقت نہیں کرتا جو سیٹن صاحب نے خاندان شاہی کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے۔ جو شخص برٹش گورنمنٹ کی طرف سے دہلی میں حکمرانی کے لئے مقرر ہو وہ بادشاہ کی تعظیم اس طرح کرے کہ جو بادشاہی قوت کو جگانے جس کو ہمیشہ کے لئے سونا چاہیئے۔ چونکہ ہمارا مقصود یہ نہیں ہے

---

[1] مغل ادوار دوم صفحہ [2] تاریخ بغاوت ہند صفحہ ۷۶

کہ بادشاہ کو بادشاہی کے اختیارات و اقتدار حاصل ہوں اس لئے ہم کو ایسی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ جس سے اس کے دل میں اپنی بادشاہی حاصل کرنے کی تمنا پیدا ہو۔ اس کا ادب اس کی شان کے موافق کرنا چاہئے۔ اس کو خوش و خرم آسائش و آرام سے رکھنا چاہئے۔ اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ اس کی حکومت کو پھر دوبارہ قائم کریں تو ہم کو چاہیئے، کہ بادشاہی کا خیال اس کے خواب میں بھی نہ آنے دیں"۔

چند سال کے بعد جب مٹکاف دہلی کا رزیڈنٹ بن گیا۔ اور کل اختیارات اس کو مل گئے تو اس نے گورنر جنرل کی ایما پر انتقامانہ طور پر بادشاہ کی توقیر کو خاک میں ملانے کے لئے حسب ذیل غیر شریفانہ و ناز یبا حرکتیں کیں جو انسانیت سے بعید تھیں۔

(۱) دستور تھا کہ بادشاہ کی سواری شہر سے گذرتی تھی تو ہر شخص شاہی آداب ملحوظ رکھتا۔ اور آداب مجرا بجا لانا ضروری تھا۔ اب حکم ہو گیا کہ انگریزوں کو اشارۃً میں بادشاہ سلامت کی تعظیم و تکریم کے لئے مجبور کرنا نہایت نازیبا ہے۔

بادشاہ کے اختیارات کا خاتمہ

(۲) دہلی میں طویل قید یا قصاص کے احکام پر بادشاہ کی منظوری لی جاتی تھی۔ یہ رسم بھی موقوف کی گئی۔ جس سے ایک معمولی سا ثبوت بادشاہ کی ملکیت و اثر ہونے کا باقی تھا۔

(۳) ایک موقع پر لارڈ ایمہرسٹ گورنر جنرل نے صاف الفاظ میں اکبر ثانی کو تحریر کر دیا تھا کہ آپ کی بادشاہی صرف نام کی ہے اور محض اخلاقاً آپ بادشاہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔[۱]

(۴) ۱۸۳۲ء میں قدیم دارالسلطنت دہلی پر برائے نام ملکیت بھی بادشاہ کی ختم کر دی گئی اور دہلی کو ممالک مغربی و شمالی میں شامل کر دیا گیا۔

(۵) ۱۸۳۵ء میں دہلی کے بادشاہ کے سکے کے بجائے سکہ کمپنی بہادر رائج کیا گیا۔

بادشاہ کو قلعہ سے نکلنے کی ممانعت

ایک روز اکبر ثانی بادشاہ شاہدرہ تفریح کے لئے نیز بندشاہ کو بلہ شکار کھیلنے کے لئے گئے ہوئے تھے کہ ریذیڈنٹ نے چند ضرب توپ دردولت پر توہین آمیز طریقے سے فائر کیں۔ اس پر لوگ برگشتہ ہو گئے۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو کافی ہنگامہ ہوا۔ اس روز سے بادشاہ کیلئے ممانعتِ قطعی کر دی گئی کہ بادشاہ قلعہ سے باہر نہ نکلنے پائیں۔[۲]

اس قسم کی نازیبا حرکتوں کی وجہ سے اہل دہلی ہی نہیں بلکہ بقول منشی ذکا اللہ "یہ تمام باتیں اہل قلعہ کے دلوں میں کانٹوں کی طرح چبھتی تھیں۔"

دہلی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی ابتداء اکبر ثانی کے صاحبزادے

شاہزادہ جہانگیر کو بھی یہ حرکتیں برداشت نہیں ہوئیں۔ انھوں نے ایک دن موقع پاکر ریذیڈنٹ دہلی کی بہت توہین و تذلیل کی اور اس پر ایک پستول سے

---

[۱] بہادر شاہ ظفر ص ۵ [۲] تاریخ الہ آباد

فیر کیا۔ جس سے وہ بچ گیا۔ گولی ٹوپی پر لگی۔ اس جرم میں گرفتار ہوئے۔ اور الٰہ آباد نظر بندی کے لئے بھیجدئے گئے۔ گویا دہلی میں انگریزوں کے خلاف عملی بغاوت کی ابتدا ہوئی۔ (جہانگیر کے تذکرے میں ان کے تفصیلی حالات پڑھیئے)

اکبر ثانی مغلیہ خاندان کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بیاسی) برس کی عمر میں ۲۸ دسمبر ۱۸۳۷ء کو اس دنیا سے گل ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنے والد کے انتقال کی یہ تاریخ کہی ؎

شاہ اکبر فروغ بخش جہاں — منخسف گشت از قضا چوں بدر

پئے سال وفات گفت ظفر — عرش آرام گاہ عالی قدر

اکبر ثانی کی شاعری

اکبر ثانی موزوں طبع تھے اپنے والد ماجد کے تخلص آفتاب کی مناسبت سے "شعاع" رکھا تھا۔ شعر بہت کم کہتے تھے۔ ان کے دربار کے شعراء میر نظام الدین ممنون۔ غالب علی خاں سید شاہ نصیر وغیرہ تھے۔ ان کا بمشکل ایک شعر دستیاب ہو سکا ہے[1]

تجھ زلف کے سودے سے یہ دل کیونکر بر آوے

تا حشر نہ چھوٹے یہ بلا جس کے گھر آوے

بہادر شاہ ظفر

بہادر شاہ ظفر ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء کو منگل کے روز شاہ عالم کے دوسرے بیٹے مرزا اکبر شاہ ثانی کے محل میں مسماۃ لال بائی کے بطن سے پیدا ہوئے جبکہ ان کے والد ماجد کو تخت سلطنت پر جلوس فرمائے ہوئے صرف چار ماہ ہوئے تھے۔ یہ والد کو بہت

---

[1] سخن شعراء صفحہ ۲

عزیز تھے انکو اس دور کے مشہور قاری حافظ محمد خلیل صاحب نے قرآن مجید پڑھایا اتالیقی کا منصب گرامی حافظ ابراہیم کو عطا ہوا۔ جن کے پڑپوتے شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب تھے۔ ہندوستان کے خوشنویس سید جلال الدین حیدر "مرصع رقم" کے والد میر ابراہیم علی شاہ نے تحریر کی مشق کرائی۔ اور خط نستعلیق میں شاگرد کو استاد بنایا۔

حضرت ظفر کو فارسی، عربی درسیات کی تعلیم دی گئی۔ نشانہ بازی اور تفنگ اندازی میں وہ کمال حاصل تھا کہ بڑھاپے کے وقت مرشدزادوں کو اس فن کی تعلیم دیتے تھے۔ شہسواری اور تیغ زنی میں کبھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

اپنے والد اکبر ثانی کے انتقال کے دو روز بعد، ۳۰ ستمبر ۱۸۳۷ء مطابق ۲۹ جمادی الثانی ۱۲۵۲ھ ہفتہ کے روز تخت نشین ہوئے۔ امام میر احمد علی صاحب امام جامع مسجد شاہی نے رسم تاجپوشی کا افتتاح کیا توپیں داغی گئیں۔ فوج نے سلامی دی۔ رزیڈنٹ نے نذر پیش کی۔ سکہ شاہی بھی موزوں ہوا۔

نسیم وزر زدہ شد سکہ بفضل الٰہ   سراج دین ابوظفر شہ بہادر شاہ

مغل بیگ عہدۂ وزارت سے سرفراز ہوئے، اور نواب حمید الدولہ مرزا مغل بیگ خان بہادر خطاب پایا۔

"مدوعگی نذر و نیاز"، خلیفۃ الملک ندیم الدولہ حافظ محمد داؤد خاں مستقیم جنگ مقرر ہوئے۔ نقیب الاولیاء حاجی غلام علی بنائے گئے۔ اس

وقت سر چارلس مٹکف لفٹننٹ گورنر تھے۔

جوں ہی بہادر شاہ تخت نشین ہوئے انگریزوں کی طرف سے ان کی بھی بے اثری و بے عزتی کرنے اور ان کے رہے سہے اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی مسلسل کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ طرح طرح کی چالیں اور ہتھکنڈے استعمال کئے جانے لگے تھے۔ خاندانی تنازعات کو اپنے اغراض کے حصول کے لئے ہوا دی جاتی تھی۔ جانشینی کے مسئلہ کو الجھایا جاتا تھا مستحقوں میں اختلافات پیدا کرا کے باہمی من مانی کرنے کے لئے منصوبے بنائے جاتے تھے اور بادشاہ کو مجبور و معذور کر کے اپنا دست نگر بنانے کی سعی کی جاتی تھی۔

دستور کے مطابق عیدین، نوروز اور بادشاہ کی سالگرہ کے دن دہلی کے ریزیڈنٹ کے ساتھ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے بادشاہ کو ریزیڈنٹ کی معرفت نذریں پیش کی جاتی تھیں ۱۸۴۳ء میں شاہی اقتدار کو ضرب لگانے کے لئے لارڈ ایلنبرا نے ان نذروں کو بند کر دیا تھا۔

بادشاہ نے انگریزوں کی خواہش کو ٹھکرا دیا

بہادر شاہ کا خرچ زیادہ تھا اور آمدنی کم تھی اس لئے مجبور تھے۔ کہ حکومت برطانیہ سے اپنا خراج بڑھوائیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی خراج میں اضافہ کرنے کے لئے ایک قسم کا وعدہ اکبر شاہ سے کر چکی تھی۔ بہادر شاہ کے اضافہ کرانے کی فکر میں تھے۔ لفٹننٹ گورنر کے پاس درخواست گئی۔ اس نے اضافہ کی سفارش نہیں کی لیکن یہ تسلیم کر لیا کہ اقرار اضافہ ضرور کیا گیا ہے تکمیل جب ہو گی جب تم اپنے تمام دعووں جو تم نے ایسٹ انڈیا کمپنی پر کئے ہیں دستبردار ہو جاؤ اس کا

بہادر شاہ نے جواب دیا۔

"اگر میں باپ کا بیٹا ہوں تو وہی کروں گا جو میرے باپ نے کیا ہے
ایسٹ انڈیا کمپنی کی کسی شرط کو قبول نہیں کرونگا"

خرابی کا ازالہ کرنے کے لئے بہادر شاہ نے جاسج طامس کو مقرر کیا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ شاہی جاگیر کوٹ قاسم کا پرگنہ اور شمع پور وغیرہ کو رزیڈنٹ کی تحویل میں لے لیا گیا۔ کہ وہ اس کا انتظام کرے گا، اور کرایہ وصول کرکے بادشاہ کو پہنچا دے گا۔ گویا قلعہ کے باہر جو املاک تھی وہ اس سے بادشاہ بالکل محروم کر دیئے گئے ان کے انتظام میں ایک گز زمین بھی نہیں رہی۔

شہریوں کی نظروں میں بادشاہ کو ذلیل کرنیکی سعی

بادشاہ کو شہریوں کی

نظروں میں گرانے اور اپنے اقتدار کا سلسلہ جمانے کے لئے شاہی خاندان میں مقدمہ بازی کا سلسلہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکمرانوں نے شروع کرا دیا تھا چنانچہ نواب حسینی بیگم زوجہ سلیم کا قضیہ اتنا اہم نہیں تھا۔ آپس میں بھی طے ہو سکتا تھا لیکن عورت ذات کو ورغلا کر بہادر شاہ کی جائیداد روشن آرا بیگم کا باغ اور سرھند کے باغ پر قابض کر دیا جس پر مجبور ہو کر بادشاہ کو یکم مئی ۱۸۴۲ء کو ایک شقہ جاری کرنا پڑا۔

"روشن آرا بیگم کے باغ۔ سرھند کے باغ اور چاندنی محل کو نواب حسینی بیگم صاحبہ بیگم مرزا محمد سلیم شاہ بہادر مرحوم کے قبضہ سے الگ کر لیا جائے۔ پہلے ان سے خالی کرنے کی نسبت کہا ہے

اگر وہ نہ مانیں تو ہیرالال وکیل سے کہا جائے کہ عدالت عالیہ میں مالش کرنے کے لئے کارروائی شروع کردیں۔ چنانچہ انھوں نے تعالی نہیں کیا۔ اور ہیرالال وکیل نے مقدمہ کی کارروائی شروع کردی۔

نواب حسینی بیگم نے جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی کہ قابض کا قبضہ اٹھانا بجز عدالت دیوانی کی ڈگری کے ناجائز ہے۔ اور ملازمان سلطانی کے قبضہ میں ان دونوں باغوں کا دینا قانونی طور پر درست نہیں ہے۔ یہ دونوں باغ قابض نواب حسینی بیگم کے حوالہ کئے جائیں۔

اس مقدمہ کا شہر میں کافی چرچہ ہوا۔ انگریزوں کی غرض بھی یہی تھی۔ کہ شہریوں کے علم میں آجائے کہ بہادر شاہ ظفر کا سوائے قلعہ کے شہر میں کسی قسم کا اختیار نہیں ہے جتیٰ کہ اپنی املاک پر بھی نہیں۔

اسی نظریہ کے ماتحت مسٹر کالبن کنجی صاحب جج نے حکم دیا کہ یہ مقامات قلعۂ مبارک سے باہر ہیں اور بادشاہ سلامت کو ان کے متعلق کسی قسم کی کارروائی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر ملازمان سلطنت ان کے اپنے تصرف میں لینا چاہتے ہیں تو انہیں عدالت دیوانی میں دعویٰ کرنا چاہیئے۔

اس فیصلہ کے بعد ریذیڈنٹ دہلی نے ایک حکم بھیجا کہ باغ سرہندی باغ روشن آرا وغیرہ کا نواب حسینی بیگم زوجہ محمد سلیم بہادر مرحوم کو قبضہ دیدیا جائے۔ اس کام میں بہت جلدی ہونی چاہیئے۔

اس فیصلہ سے جہاں بادشاہ کو بے اختیار ثابت کرنا مقصود تھا

وہاں بادشاہ کو جھکانا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکمرانوں کا دست نگر بنانا بھی تھا۔ یہ دوسری غرض بھی پوری ہوگئی۔ چنانچہ بہادر شاہ کو لفٹنٹ گورنر کو لکھنا پڑا "کہ اگر باغ روشن آرا اور باغ سرہندی نواب حسینی بیگم کے قبضہ میں دیدئے گئے۔ اور شاہی عمل دخل اٹھالیا گیا تو اس سے بارگاہ سلطانی کی بہت ہتک ہوگی اس لئے دونوں باغوں پر شاہی قبضہ برقرار رہنا چاہیئے البتہ ہماری طرف سے ایک سو روپیہ ماہوار خرچ اخراجات کے لئے بیگم صاحبہ کے پاس ہمیشہ پہنچ جایا کرے گا"

لفٹنٹ گورنر نے بہادر شاہ کی اس معروض کو منظور کیا۔ اور حکم بھیجدیا کہ ان باغوں کی آمدنی نواب حسینی بیگم کو پہنچادی جائے یہ تاکیدی حکم ہے ہمیشہ پابندی کے ساتھ اس کی تعمیل کی جائے[1]

انگریزوں کا دبدبہ بٹھانے کی جدوجہد

اسی زمانہ میں دہلی کے امراء پر انگریزی قوم کا دبدبہ بٹھانے کے لئے دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اعلان کیا گیا۔

"تمام ہندوستانی امراء کو اطلاع دیجاتی ہے کہ جب ہاتھی پر سوار ہوکر بازاروں میں نکلیں اور سامنے سے کسی انگریز کی سواری آتی نظر آئے تو اپنے ہاتھیوں کو کنارے کرلیا کریں۔ تاکہ آنے جانے میں مزاحمت نہ ہو۔"[2]

بادشاہ کے لقب کی موقوفی

ایسٹ انڈیا کمپنی کو دہلی کی بادشاہت سے شروع ہی سے خطرہ تھا۔ گرچہ بہادر شاہ

---

[1] دہلی کا آخری سانس ص۵۸ [2] احسن الاخبار بمبئی ۲۲ مئی ۱۸۴۶ء

نام کے بادشاہ تھے۔ لیکن کمپنی کے حکمران بادشاہت کے سلسلے اور تخیل کو مٹانا چاہتے تھے۔

اگست ۱۸۴۴ء کو کورٹ آف ڈائرکٹر کے حکم کے مطابق گورنر جنرل نے اپنے دہلی کے ایجنٹ کو یہ ہدایتیں کیں۔

"جب دہلی کے بادشاہ کا انتقال ہو جائے تو اس کے جانشین بنانے کے سلسلہ میں ہر معاملہ کی خاص منظوری گورنر جنرل سے لینی چاہیئے اگرچہ ان ہدایتوں میں بادشاہ کے لقب کی موقوفی کی نسبت خیال ظاہر کیا گیا ہے لیکن ہم اس کی موقوفی کا حکم جب تک نہیں دے سکتے کہ اس کے متعلق زیادہ مفصل حال تم سے نہ سنیں اور جن باتوں کی تم سفارش کرو اس کے مقصد اور وجوہ پر ہم غور کریں گے۔"[1]

چنانچہ لارڈ ڈلہوزی کی بھی بادشاہت کے نام کو مٹانے کے بارے میں یہ نظریہ اور پالیسی تھی۔

"وہ حقوق اور فوائد جنہوں نے بادشاہی کی اس بے اصل جھوٹی نقل کو زندہ کر رکھا تھا وہ موقوف ہو جائیں۔ بادشاہ کا لقب بنا بڑا ناسور ہے ہندوستان کے سلاطین اور رعایا کے دلوں میں خواہ بادشاہ کے متعلق کیسے ہی خیالات ہوں مگر وہ بادشاہ کی کسی حالت میں بھی پرواہ نہیں کرتے بے شک ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں سب سے زیادہ اعلیٰ و برتر والا اقتدار بادشاہ ہو گئی ہے۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی رقیب اس کا نام دین

---

[1] تاریخ بغاوت ہند ص ۳۲

بادشاہ ہو جس کے باپ دادا ایسے ذالاقتدار ہوں جیسے کہ اب ہم ہیں۔ میں لیے مانتا ہوں کہ اس کے ہونے سے کوئی اصلی خوف ہمارے لئے نہیں ہے۔ مگر اس کی سازشیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ وہ ہمکو تکلیف دیتی ہیں۔[۱]

بادشاہ سے قلعہ خالی کرانیکا خیال

اس گورنر جنرل کا ارادہ تھا کہ اس کام کے لئے فوراً قدم اُٹھایا جائے۔ بادشاہ کے انتقال کا بھی انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سمجھتا تھا۔

"غالباً بادشاہ کو اگر کافی ترغیب دی جائے گی تو وہ قلعہ خالی کردیگا۔ اس لئے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قطب ایک ایسا مقام ہے جہاں ایک دلی اور بادشاہ کے باپ دادا کی قبریں ہیں۔ بہادر شاہ اور اس کے خاندان کے آدمی آباد ہونے میں کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ اور اگر اعتراض کرینگے تو اس بات پر غور کیا جائے گا۔ کہ آیا ان پر دباؤ زیادہ نہ ڈالا جائے۔ یا یہ تدبیر آخر کی جائے کہ اگر وہ قطب میں جا کر نہ آباد ہوں تو ان کا وظیفہ بند کر دیا جائے۔

جب لارڈ ڈلہوزی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز میں اپنے ان خیالات کا اظہار کیا تو لندن ہال اسٹریٹ میں دلچسپ اور مختلف خیالات ہوئے۔ اور مباحثہ کی نوبت آئی۔ ڈائرکٹرز کے خیالات حسب ذیل تھے۔

---

[۱] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۲۷۳

"یہ سوال کمپنی کے اعلیٰ و بدتر ہونے کا نہیں ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ سرکار و الا اقتدار کمپنی کی حکومت اعلیٰ و برتر ہے۔ دہلی کی بادشاہی فقط ایک لقب ہے جو ہماری معزت رسانی کے لئے ذرا سی قوت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کا اذب مسلمان کرتے ہیں کہ ان کے بادشاہ کا ایک قدیمی نام باقی رہے۔ مسلمان حکومت برطانیہ کی طرف سے اس وجہ سے نیک خیالات رکھتے ہیں کہ وہ اس قدیمی خاندان کی عزت کرتی ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کے تمام سلاطین اور رعایا کو بادشاہ کی کچھ پرواہ نہیں ہے۔ لیکن کورٹ اس کو ممکن نہیں سمجھتا۔ کہ کوئی رعیت اس خاندان کی پہلی عظمت و شان سے بے پرواہ ہو گئی ہو[1]"

جب اس کا مسودہ، لیڈن ہال اسٹریٹ سے کیلن رو میں آیا تو بورڈ کنٹرول نے مندرجہ بالا احتیاطی نظریوں سے اختلاف کیا تو اس پر ہندوستانی وزیر نے بڑی جراءت سے کہا۔

"کمپنی کو گو خاندان تیمور کے سرپرست سے کتنا ڈر اخوف ہے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان کبھی یہ خیال کرے گا کہ وہ عیسائیوں کی برتری پر حملہ کرنے کیلئے اپنے ایمان کے جوش کو مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کر کے پھر ان کو فراہم کرلے تو یقینی اس کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ دہلی میں جو بالفعل بادشاہ بنا بنایا موجود ہے اور شاہی قلعہ اس کے پاس ہے تو وہ اس کے ہاتھ میں کارگر آلہ بہ نسبت اس شہزادہ کے ہوگا جس کو لارڈ ڈلہوزی بادشاہ سے

[1] تاریخ بغاوت ہند امل ص ۳۷

پست حالت میں رکھنا چاہتا ہے۔"

لارڈ ڈلہوزی جو سازش دہلی کی بادشاہت کے خلاف عجلت کے ساتھ کرنی چاہتے تھے اس کے خلاف کافی میران سے اظہار رائے کیا۔ اور اس سازش کو ملتوی کرنے کا مشورہ دیا۔ اور لارڈ صاحب کے پاس ایک مراسلہ ۱۸۵۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی ڈائرکٹرز آف بورڈ نے بھیجا جس میں مسٹر ٹکر صاحب جن کی تقرری بیس کی تھی ان کی حسب ذیل رائے بھی درج تھی۔

"میں اس بات کو ایک لمحہ کے لئے بھی یقین نہیں کرتا کہ خاندان شاہی ترغیب دینے سے قلعہ خود خالی کر دیگا۔ ہندوستان کے آدمی خواہ وہ کیسے ہی غریب و مفلس ہوں باپ دادا کے سکونت کے مکان سے بڑی محبت رکھتے ہیں، وہ سب لوگ خوب جانتے ہیں جو ہندوستانیوں کی باتوں کو کچھ بھی سمجھتے ہیں۔ اور قلعہ کی صورت کی تو خاص حالتیں ہیں قلعہ سے اس خستہ حال خاندان شاہی کو الفت ہے وہ ان کی گذشتہ شان و شوکت کی نشانی ہے یہ مطلب کہ قلعہ کو خاندان شاہی خالی کر دے گیا تو جنگی زور سے یا دھمکیوں سے حاصل ہو سکتا ہے جس میں گورنمنٹ کی ہتک ہو گی۔ اور اس سے کمپنی سے کینہ و نفرت پیدا ہو گی۔"

جانشینی کے مسئلہ میں الجھا کر فائدہ اٹھانا

اس مباحث کے دوران میں بہادر شاہ کی جانشینی کا مسئلہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے سامنے پیش آیا۔ کمپنی مرزا فخرو کو جانشین بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ جس کی مخالفت بہادر شاہ اور

زینت محل نے کی۔ گورنر جنرل نے دونوں مسئلوں پر غور کرنے کے لئے اپنی کونسل کی ممبران کی میٹنگ طلب کی۔ اس میں قلعہ خالی کرانے اور بادشاہ کے خطاب کو موقوف کرانے کے متعلق جان ہٹلر نے مسٹر منگر کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

" جو کام کیا جائے بڑے حزم و احتیاط اور ترغیب سے کیا جائے جبر نہ کیا جائے۔" جان لوئیس ان باتوں کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ اور اس کا کہنا تھا کہ میں یہ یقین نہیں کرتا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو دہلی یا اس کے بادشاہ کی ذراسی بھی پرواہ ہو۔ بلاکسی تاخیر کے بادشاہ کا خطاب موقوف کیا جائے اور قلعہ خالی کرایا جائے۔"

کونسل نے غور و فکر کے بعد انگلینڈ میں ہوم گورنمنٹ کو یہ سفارش کی کہ موجودہ بادشاہ کے فوت ہونے تک دستور کے مطابق حالات قائم رہیں مرزا فخرالدین کو بادشاہ کا لقب دیا جائے لیکن بادشاہ ہونے کی وجہ سے اس کو قلعہ میں رہنے کا حق نہ دیا جائے اور اس کو ترغیبیں کی جائیں کہ وہ قلعہ خالی کر کے قطب میں رہائش اختیار کرے اگر ضرورت پڑے تو اس کا قلعہ میں رہنے کا حق اضافہ مشاہرہ کے عوض خرید لیا جائے۔

گورنر جنرل کی تمام سفارشیں ہوم گورنمنٹ نے منظور کر لیں لفٹنٹ گورنر نے قطب میں جا کر مرزا فخر و سے اس عہدنامہ پر دستخط کرا لئے شہر میں اس عہدنامہ کی شہرت ہوئی تو پریشانی اور سراسیمگی پھیل گئی۔ بادشاہ اور اس کی بیگم نے بھی اس عمل کو اچھا نہیں سمجھا۔

۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخر الدین کا ہیضہ سے انتقال ہو گیا۔ پھر ولی عہد منتخب و مقرر کرنے کا سوال پیدا ہوا۔ دوسرے دن سر طامس مٹکاف ایجنٹ دہلی بادشاہ کی خدمت میں گئے۔ جہاں پناہ نے ان کو ایک پرچہ دیا جس میں اپنی پہلی درخواست کا اعادہ کیا تھا کہ مرزا جواں بخت کو ولیعہد مقرر کیا جائے۔ اس کے ساتھ ایک محضر تھا جس میں بادشاہ کے آٹھوں بیٹوں کے دستخط اور مہریں لگی ہوئی تھیں۔ اس میں درج تھا کہ ہم خوشی کے ساتھ زینت محل کے بیٹے کو جو دانائی، لیاقت، علم و خوش اخلاقی کے صفات کا مالک ہے ولی عہد مقرر کرتے ہیں۔

دوسرا دن گذرنے نہیں پایا تھا کہ بہادر شاہ کے سب سے بڑے صاحبزادہ مرزا قویش نے انگریزی حاکموں کے اثر میں آکر ایک خط ریذیڈنٹ کو تحریر کیا کہ والد ماجد نے ہمارے اضافہ تنخواہ اور روپے دینے کا وعدہ کر کے محضر نامہ پر دستخط اور مہریں کرا لی ہیں۔ میں باپ کا حکم بھی ٹالنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ زینت محل کی سازش سے مجھے ولی عہدی سے محروم کیا جا رہا ہے تو میں آپ سے رجوع کرتا ہوں کہ ولیعہدی کا اصل مستحق میں ہوں۔ کیونکہ میں بادشاہ کا بڑا بیٹا ہوں۔ حافظ قرآن اور حاجی بھی ہوں۔

لارڈ ڈلہوزی کی جگہ لارڈ کیننگ کا تقرر ہوا۔ وہ بھی لارڈ ڈلہوزی کے منصوبے کے حامی اور اس کی تکمیل کے خواہشمند تھے ان کی بھی یہی رائے تھی "مدبران ملکی کی رایوں میں مشکل سے کوئی بڑا اختلاف رائے اس باب میں ہو گا کہ سیاسی اور پالیسی کے اعتبار سے اس بات کی اشد ضرورت

کہ قلعہ جو شہر دہلی کو اپنے قابو اور بس میں رکھ سکتا ہے وہ برٹش فوج کے ہاتھ میں سلامت اور محفوظ ہو۔"

چنانچہ انھوں نے مرزا قویش کی درخواست کے جواب میں ریزیڈنٹ دہلی کو حسب ذیل مراسلہ روانہ کیا۔[۱]

"بادشاہی جاہ و جلال کی نقل کے بہت سے زیور جواہر اتر چکے ہیں جس سے اس کی پہلی سی چمک دمک نہیں رہی ہے۔ اور اس کے وہ حقوق جن پر خاندان تیموریہ کو گھمنڈ تھا ایک دوسرے کے بعد تلف ہو چکے ہیں اس لئے کچھ مشکل نہیں ہے کہ قلم کے ایک ڈوبے میں بہادر شاہ کے مرنے کے بعد بادشاہ کا لقب موقوف کر دیا جائے۔ بادشاہ کی نذر جو گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف دیتے تھے موقوف ہوئی۔ بادشاہ کا سکہ جو بنایا جاتا تھا وہ بھی بند کر دیا گیا۔ گورنر جنرل کی مہر سے بادشاہ کے فدوی خاص کے الفاظ نکال دئے گئے۔ اور ہندوستانی رئیسوں کو ممانعت کر دی گئی نہ بھی اپنی مہروں میں بادشاہ کی نسبت ایسے الفاظ استعمال نہ کریں ان تمام امور کے بعد اب گورنمنٹ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ظاہر داری کی اب کوئی بات ایسی باقی نہ رکھی جائے جس سے ہماری گورنمنٹ بادشاہ کے تحت معلوم دے لہذا بادشاہ دہلی لفظ ایسا لقب ہے جس کا باقی رکھنا گورنمنٹ کی مرضی پر منحصر ہے۔"

گورنر جنرل نے اپنے ایجنٹ کو اس مراسلہ میں یہ ہدایتیں بھی کی تھیں۔

---

[۱] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ صفحہ ۳۸

"حضرت سمجھو تو بادشاہ کو لکھدو کہ گورنر جنرل نے مرزا جواں بخت کی ولیعہدی منظور نہیں کی ہے اور مرزا ایاقوش کی درخواست منظور کرلی گئی ہے۔ بادشاہ کی زندگی میں بادشاہ سے یا کسی اور خاندانی رکن شاہی سے جانشینی کے متعلق کوئی خط و کتابت نہ کی جائے مرزا ایاقوش سے کہدو کہ تمہاری ولیعہدی میں وہ شرائط نہیں ہوں گی۔ جو مرزا فخرو سے کی گئی تھیں۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد ان کو بادشاہ کا لقب نہیں ملیگا۔ بلکہ شہزادہ کہا جائیگا۔ اور خاندان تیمور کا جو ایک لاکھ وظیفہ ہے اس میں سے پندرہ ہزار روپیہ ماہانہ ملا کرینگے۔ اور ان کو قلعہ خالی کرنا ہوگا۔

اس مراسلہ میں یہ دلچسپ ہدایت بھی تھی کہ مرزا ایاقوش کے سامنے یہ تمام شرائط زبانی پیش کی جائیں۔ تحریر نہ دی جائے اس لئے کہ کمپنی کا یہ ارادہ نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ عہد و پیمان کرکے قبول کرے بلکہ اس کی غرض یہ ہے کہ اس کے سامنے صرف فیصلہ کا اظہار کیا جائے۔

جس وقت اس عہد و پیماں کا اہل دہلی اور بادشاہ کو علم ہوا۔ تو ان کے دلوں میں غصہ کی آگ بھڑک گئی۔ اور عوام اور بادشاہ کو یقین ہوگیا کہ اب ہمارے حقوق محفوظ نہیں ہیں۔

اختیارات شاہی کو ختم کرنے کے لئے ذلیل حرکتیں

دہلی کے ایسٹ

انڈیا کمپنی کے حکمران معمولی معمولی امتیازی اختیارات شاہی کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اور ان کو مٹانے کے لئے رکیک قسم کے اقدامات و حرکتیں کی جاتی تھیں۔

جب بادشاہ کی سواری کا جلوس نکلتا تھا تو کوئی انگریز جلوس کی قطار کا حصہ بنکر اپنی سواری میں نہیں جاتا تھا لیکن یہ عزت بھی بادشاہ کی ان کو گوارا نہیں تھی۔ اس کے خلاف بھی انھوں نے عمل کرنا شروع کر دیا۔[1]

سر طامس مٹکاف صاحب کو بادشاہ اپنے شقوں (خطوط) میں فرزند ارجمند لکھا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ہاروے صاحب ایجنٹ مقرر ہوئے۔ انھوں نے بادشاہ کو لکھ دیا ہمیں آپ کا فرزند بننا منظور نہیں ہے۔ آیندہ ہم کو یہ فقرہ مت لکھا کرو۔

بادشاہ کو سرکاری خطوط میں جو آداب لکھے جاتے تھے وہ بھی انگریز حکمراں طبقہ کو پسند نہیں تھے۔ پہلے جو خط لفٹنٹ گورنر صاحب کی جانب سے بہادر شاہ کو لکھے گئے تھے اس کی ابتداء "مے اٹ پلیز یور میجسٹی" سے اور اختتام "یور میجسٹیز فیتھ فل سرونٹ" پر ہوتا تھا۔ مگر ۲۲۔ اگست ۱۸۵۲ء کو مسٹر کالون لفٹنٹ گورنر آگرہ نے گا[؟]کشی کے سلسلہ میں بادشاہ کے خط کا جواب دیا تھا۔ اس میں وہ القاب تحریر تھا جو ایک دوست دوسرے دوست کو لکھتا ہے یعنی شہنشاہ دہلی کا مرتبہ لفٹنٹ گورنر کے برابر رہ گیا تھا۔[2]

ہندستانیوں کو عیسائی بنانے کے منصوبے

بادشاہت پر ہی نہیں قبضہ کیا جا رہا تھا بلکہ دین و ایمان اور دھرم و مذہب پر بھی ڈاکہ ڈالنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ دہلی میں کشمیری گیٹ کا گرجا گھر اور دہلی کالج مشنریوں کا

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ صفحہ ۳۹۰ [2] بہادر شاہ ظفر صفحہ ۱۲۵

گرجا بنا ہوا تھا۔ دہلی کالج میں ۱۸۵۲ء میں دہلی کی دو علم دوست ہستیاں ماسٹر رامچندر اور ڈاکٹر چمن لال اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ دہلی کے محلوں، گلیوں، بازاروں، حتیٰ کہ باغوں تک میں ہندوستانیوں کے مذہب کی بیحرمتی اور عیسائی مذہب کی افضلیت مشنری ثابت کرتے پھرتے تھے۔ جس کا ذکر نواب قیصر جہاں بیگم قیصر نے اپنے روزنامچہ میں ۲۔مئی ۱۸۵۶ء کی تاریخ میں کیا ہے۔ بیگم صاحبہ لکھتی ہیں۔

"ریاستی الحاق (اودھ) کے علاوہ کمپنی نے علی الاعلان تبلیغ نصرانیت شروع کر دی ہے اور عاسی کے قول کے مطابق جامع مسجد دہلی کو کلیسا میں تبدیل کرنے کے لئے مشن اور عیسائی دنیا کوشش میں ہے تاکہ جامع ایا صوفیہ کا بدلہ لیا جائے۔ مسیحی پادریوں کی ہمت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہ اسلام سے مناظرہ پر اتر آئے ہیں۔ تقریری اور تحریری مقابلوں کے علاوہ اب جھگڑے بھی شروع ہو چکے ہیں۔ کمپنی نے ہندوؤں کو عیسائی بنانے کی ہر ممکن کوشش شروع کر دی ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو اس خطرہ سے متنبہ کیا ہے۔ ہندوؤں نے بھی کھل کر کمپنی کے خلاف مذہبی جذبہ کے ماتحت بغاوت شروع کر دی۔ میرے والد سید عبدالکریم نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے اب ملکہ باغ میں عیسائی پادری برملا مذہب اسلام کی مذمت کرنے لگے ہیں جس سے شدید امکان تنازعہ ہے مرزا ایا قوش سے میں نے

ایک مرتبہ عرض کیا۔ انھوں نے فریزر صاحب سے شکایت کرنے کا
وعدہ کیا۔ اور عیسائیوں کی اس جسارت پر بڑا ملال خاطر پایا
کشمیری دروازہ کا بڑا گرجا آج کل نصرانیوں کا مرکز ہے۔ عام
لوگ کہتے ہیں "لو بھئی اب دین کی بھی خیر نہیں ہے"

دیہاتیوں میں بھی مشنری پھیل گئے تھے، غریب و ناواقف دیہاتیوں کو لالچ دیکر نصرانیت کے پھندوں میں پھنسایا جاتا تھا۔ دیہات میں گرجا بنانے کی سعی کی جاتی تھی۔ جو ہندوستانی اس کی مخالفت کرتا تھا اس کو ملک کا غدار و باغی سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کی پاداش میں پھانسی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ نواب قیصر جہاں کے روزنامچہ کا ایک اور ورق بھی اس بات کی شہادت دیتا ہے۔

"دہلی میں قتل عام کا حکم دیدیا گیا۔ بے گناہ شہریوں کو گولی کا نشانہ
بنایا گیا۔ ہزارہا نوجوان، بوڑھوں، عورتوں اور معصوم بچوں کو
مکان میں بند کرکے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ انگریز جنرل
نیل لنٹ غضب ناک ہے اپنے میجر رینارڈ کو حکم دیا ہے کہ تمام
قصبہ فتحپور کی آبادی کو تہ تیغ کر دیا جائے کیونکہ اس جگہ ایک
عیسائی گرجا کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالی گئی تھی اور نصاریٰ کے
پادریوں نے اس کی جنرل موصوف سے شکایت کی تھی"۔

ان حالات کو محبان وطن غور سے دیکھ رہے تھے۔ اور اپنی طاقت و ذرائع کے مطابق انگریزی حکومت کو نیست و نابود کرنے کی اسکیمیں اور پروگرام بناتے تھے۔ دہلی ہی کا عوام نہیں بلکہ تمام ہندوستان کے عوام و خواص

اس بات میں کوشاں تھے کہ اس غلامی کے جوئے کو کسی طرح اتار پھینکیں۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کے درباری بھی خاموش تماشائی نہیں تھے۔ چنانچہ جو طریقے ملک کی آزادی حاصل کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں وہ انھوں نے اختیار کئے بادشاہ سمجھتے تھے کہ میرٹھ یا دہلی والوں کی طاقت سے حکومت برطانیہ کا تختہ الٹا نہیں جاسکتا۔ جب تک اندرون ملک میں اپنی طاقت نہ ہو اور بیرون ملک سے امداد نہ لی جائے۔

غیر ملک سے انگریزوں کے خلاف مدد لینے کی سعی

۱۸۵۳ء میں مرزا حیدر شکوہ جو جہاں بخش کے صاحبزادے اور سلیمان شکوہ کے پوتے تھے گویا بہادر شاہ کے بھتیجے تھے۔ اور واجد علی کے قابل اعتماد مانے جاتے تھے جن کو ایک ہزار روپیہ وظیفہ ملتا تھا۔ اور واجد علی شاہ کے ہم مذہب یعنی شیعہ بھی تھے۔ ان سے بہادر شاہ کی گفتگو ہوئی اور جو حرکتیں بہادر شاہ کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کر رہی تھی اس کو سامنے رکھتے ہوئے مرزا حیدر نے بادشاہ کو مشورہ دیا۔ کہ ہندوستان میں اپنی طاقت و اقتدار بڑھانے کے لئے واجد علی شاہ سے یک جہتی و رابطہ قائم کیا جائے تاکہ دونوں متحد ہو کر اور طاقتور بن کر شاہ ایران کو اپنا ہمنوا بنا کر انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کردیں اور بقول حکیم احسن اللہ خاں انسے مل کر اپنا ملک فتح کر لیں[1]

بہادر شاہ کو یہ مشورہ پسند آیا۔ اس پر غور کیا گیا کہ اتحاد کا طریقہ کیا

---

[1] مقدمہ بہادر شاہ ظفر صفحہ ۲۲

اختیار کیا جائے۔ مرزا حیدر کی رائے ہوئی کہ شیعہ مذہب اختیار کرنے کا اعلان کر دیا جائیگا تو واجد علی شاہ اور شاہ ایران پر بھی اثر پڑے گا۔ اور آسانی کے ساتھ مقصد پورا ہو جائے گا۔

انگریزوں کی مخالفت کیلئے شیعہ بننے کا اعلان

بہادر شاہ ظفر انگریزوں سے انتہائی برگشتہ اور نالاں تھے اُنھوں نے بغض معاویہ کے جذبہ میں آکر اعلان لکھکر مرزا حیدر کو دیدیا۔ کہ میں نے مذہب اثنا عشریہ اختیار کر لیا ہے مرزا حیدر نے اس کو لکھنؤ میں جاکر مجتہد العصر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ خبر لکھنؤ کے ہر محلے اور ہر بازار میں پھیل گئی۔ لکھنؤ والے بہت خوش ہوئے لیکن دہلی والوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اُنھوں نے اس مصلحت وقت کو مذہب کے مقابلہ میں کیوں اہمیت دی۔ بالآخر بادشاہ کو انکار کرنا پڑا کہ میں نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا ہے۔ بادشاہ نے اپنے انکار کی تصدیق میں ایک کتاب "حقیقت مذہب اہل سنت و جماعت" مرتب کی۔ اس پر مرزا غالب نے بادشاہ کو اس اتہام سے بچانے کے لئے ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس کا نام غالب نے "دمغ الباطل" رکھا گیا تھا[۱]۔

ایران کے بادشاہ کے نام ظفر کا خط

اس اسکیم کے فیل ہونے کے بعد جبکہ بہادر شاہ کو ایران کے بادشاہ سے خط و کتابت کی اجازت نہیں تھی۔ جنگ آزادی

[۱] یادگار غالب صفحہ ۷۰

سے پہلے مرزا حیدر یا مرزا احسن عسکری کے مشورہ سے بادشاہ نے مرزا نجف کو ایک خط دے کر ایران روانہ کیا جس کا مضمون یہ تھا "کہ دہلی کے بادشاہ کو انگریزوں نے قید کر رکھا ہے اور تمام حقوق بادشاہ کے سلب کر لئے ہیں ان کو اپنا ولیعہد مقرر کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اس لئے بادشاہ کی خواہش ہے کہ کوئی طریقہ ایسا اختیار کیا جائے کہ شاہ ایران اور شاہ کی خط و کتابت ہوتی رہا کرے۔ اور کبھی کبھی ملاقات بھی ہو جائے ^[۱]^

یہ خط مرزا نجف ایران لیکر پہنچے ۔ مولوی محمد باقر کے دہلی اردو اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ شاہ ایران نے مرزا نجف کی بڑی آؤ بھگت و تکریم کی اسی زمانے میں بوشہر و ایران میں لڑائی ہو رہی تھی اس کی وجہ سے بادشاہ کو وہاں سے فوجی مدد آنے کی امید ہو گئی تھی ۔ مرزا نجف کا جب کوئی جواب موصول نہیں ہوا تو چند ماہ بعد شیدی قنبر نے حج کو جانے کی تیاری کی اور مکہ معظمہ جانے کی اجازت چاہی۔ پیرزادہ حسن عسکری کی معرفت رخصت بھی مل گئی اور سفر خرچ بھی مل گیا۔ جب یہ دہلی سے روانہ ہوئے تو مخبر نے ان کے جانے کی اطلاع کپتان ڈگلس سے کر دی کہ شیدی ایران جا رہے ہیں ۔ اس نے لاہور کے نزدیک ان کو گرفتار کرنے کا حکم دیا لیکن یہ ہاتھ نہیں سکے ۔ بادشاہ نے ان کو کچھ کاغذات دیئے تھے جس پر بادشاہ کی مہر تھی۔ شیدی قنبر کے بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ جو خطوط مرزا نجف کے ہاتھ بھیجے گئے تھے۔ اس کا جواب لائیں۔ اور بادشاہ ایران کو

---

[۱] مقدمہ بہادر شاہ ص۱۰۱

مقصد معلوم کریں۔ بادشاہ جوابات کے منتظر تھے اور ایران اور بوشہر کی خبریں سننے کے بہت مشتاق رہتے تھے۔ اور دہلی کے اخباروں میں بھی ایران کی فتح کی خبریں جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا کرتی تھیں۔

مذکورہ ایران بھیجنے کی سازش سے آگاہ کرنے اور بہادر شاہ کی دیگر انگریز دشمن کاموں سے آگاہ کرنے کے لئے محمد درویش سیاح نے ۲۴ مارچ ۱۸۵۷ء کو دہلی سے لفٹننٹ گورنر آگرہ کو ایک لفافہ روانہ کیا تھا جس کے اقتباس قابل دید ہیں۔

"میں نے اپنی پہلی عرضی میں جناب سے عرض کیا ہے کہ دہلی کے بادشاہ کی خط و کتابت شاہ ایران سے مرزا حسن عسکری کی معرفت ہو رہی ہے۔ فقیرانہ سیاحی میری عادت ہے مجھے تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ تین چار مہینے گذرے ہیں کہ حسن عسکری کی معرفت بادشاہ دہلی کے خطوط دو آدمی لے کر قسطنطنیہ کی طرف مکہ کے قافلہ کے ساتھ روانہ ہوئے ہیں۔ حسن عسکری نے بادشاہ دہلی کو یقین دلایا تھا کہ اس کو یہ خبر صحیح معلوم ہوئی ہے کہ شاہزادہ ایران نے بوشہر کو فتح کر کے بالکل اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور سب عیسائیوں کو نکال دیا۔ اور کسی عیسائی کو وہاں زندہ نہیں چھوڑا ہے۔ اور بہت سے عیسائیوں کو قید کر لیا ہے۔ اور بیشک بہت جلد لشکر ایران قندھار اور کابل کی راہ سے دہلی کی طرف آئے گا...... بادشاہ نے

میں اشرفیاں حسن عسکری کو دیں اور کہا خطوط ایران کو بھیجو۔
یہ خبر ہے کہ چار آدمی گیرو کپڑے پہنکر ایک دو روز میں ایران
روانہ ہونگے ۔ ۔ ۔ ۔ تمام قلعہ کو عموماً اور بادشاہ کو خصوصاً اس کا
یقین ہے جس کی بڑی خوشیاں ہو رہی ہیں اور منتیں اور نذریں
مانی جاتی ہیں۔ اور غروب آفتاب سے پہلے ڈیڑھ گھنٹے تک
حسن عسکری ایرانیوں کے آنے کے لئے اور عیسائیوں کے اخراج
کے واسطے دعائیں اور وظیفے پڑھتا ہے۔ یہ دستور ہے کہ ہر جمعرات
کو ملیدہ اور تیل ٹکوں اور کپڑوں کے کئی خوان بادشاہ
حسن عسکری کے گھر بھیجا کرتے ہیں تاکہ نذر نیاز کا لازمہ پورا ہو۔ یہ
چیزیں مجھے اپنے دوستوں سے معلوم ہوئی ہیں جو بادشاہ کے
حضور میں رہتے ہیں۔"

لفٹنٹ گورنر کو اپنی حکومت کی طاقت و قوت پر اتنا غرور تھا کہ خط پر کوئی
توجہ نہیں دی بلکہ خط سنکر صاحب بہادر نے بڑا قہقہہ لگایا۔

ہندیوں کے نام شاہ ایران کا پیغام

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ہندستان ہی میں نہیں بلکہ ایران میں بھی انگریزوں کے خلاف جنگ جاری تھی۔

۱۸۵۷ء سے قبل ایران میں انگریزوں کے خلاف جنگ جاری
تھی۔ بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۵۷ء سے قبل شاہ ایران کے پاس انگریزوں
کے خلاف لڑنے کے لئے اپنا پیغام روانہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے شاہ ایران

ہندوستان کے حالات وخیالات وواقعات سے آگاہ ہو گئے تھے۔ جب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے ان کا واسطہ پڑا تو انھوں نے ایک اعلان جنگ آزادی ہندوستان کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور دوسرے مقتدر حضرات کے پاس روانہ کیا۔ یہ اعلان تاریخ قاچاریہ کے مجلدات ناسخ التواریخ میں درج تھا۔ جب شاہ ایران کی انگریزوں سے صلح ہو گئی تو اس اعلان کی اشاعت کی ممانعت کر دی گئی جس کی وجہ سے ناسخ التواریخ میں یہ اعلان درج ہونے سے رہ گیا۔ بقول مرزا محمد تقی مولف ناسخ التواریخ انگریزوں نے دولت ایران سے شکایت کی کہ آپ نے ہمارے خلاف ہندوستانیوں کو بھڑکایا تھا اور اعلان جنگ آزادی روانہ کیا تھا۔ چنانچہ شاہ ناصر الدین نے اقرار کیا کہ ہم نے ہندوستانیوں کے با اثر لوگوں کے پاس یہ اعلان بھیجا تھا۔ چنانچہ یہ اعلان روزنامچہ وقائع اتفاقیہ میں یعنی ایران کے سرکاری گزٹ میں محفوظ رہ گیا تھا۔ جس کی عبارت یہ ہے۔

"معلوم باد کہ باہیچ وقت بازہاق نفوس و اراقت دماء
رضا ندادہ ایم و در این ہنگام کہ کارداران انگلیس از ہمہ سمت
منافرت با یکجہت شدند و ابواب مقاتلت و مبارزت فراز داشتہ
نقض عہد و کسر میثاق اتفاق کردہ دولت اسلام را ذلیل و
زبون خویش خواستہ و ہر روز بتعزیر و تکلیف شاق مارا ممتحن داشتہ
بر ما و جمیع مسلمین واجب افتاد کہ استمداد کنیم و از خدائے خواستار
شویم و بیاری رسول مجتبیٰ و علی مرتضیٰ از جہاد و غزا نپرہیزیم و فرزند

خصم را ہم چنیں ہم شکیتم تا مکشوف انند کہ ملت شریف اسلام محمدیہ و دولت غیور ایران خوار و ذلیل انگلیس نخواہد شد و من کہ پادشاہ مملکت و خداوند سلطنتم در تقویم دین و دولت جان و مال خویش را اثیار داشتہ نثار خواہم کرد۔ ہمانا چاکران غیور و رعایائے دین دار ما ہرگز ما را تنہا و دولتے را خوار نداشتیم۔ لیکن اہالیہ انگلیس عہد شکستند ناگاہ بیند پوشہم تاختہ نشیمن ساختہ …. لاجرم ما را کہ خداوند بحفظ دین و دولت گماشتہ متوکلاً علی اللہ کار حرب و ضرب دست باز نخواہیم داشت ….."

انگریزوں کے باغی بنانے کیلئے پیری مریدی کا سہارا

دوسرے ملکوں سے سازباز کرنے اور فوجی امداد لینے کی کوشش کے ساتھ بہادر شاہ نے فوجیوں کو اپنا مرید بنانا شروع کر دیا تھا۔ یہ فوجی زیادہ تر انگریزی فوج میں ملازم تھے۔

غدر سے تین سال قبل کا واقعہ ہے کہ چند پیدل سپاہی جو دہلی میں متعین تھے جن کا کام عرضیاں لیکر پیش کرنا تھا۔ وہ اور حمید خاں جمعدار بادشاہ کے مرید ہوئے۔ اس موقعہ پر بادشاہ نے ہر ایک مرید کو ایک شجرہ اور ایک سرخ رومال برکت کے طور پر عطا کیا۔ لفٹنٹ گورنر کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے تحقیقات کی۔ اور فوجی لوگوں کا آئندہ مرید ہونا بند کرایا۔ بقول مکند لال مخبر[1] اس روز سے بادشاہ اور فوج میں ایک قسم کا ارتباط

---

[1] مکند لال نے بہادر شاہ کے مقدمہ میں شہادت دیتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے۔ ص۱۰۳

ارتباط پیدا ہو گیا تھا۔"

انگریزی فوج میں بغاوت پیدا کرنا

انگریزی فوجوں میں بادشاہ کے ملازم اور فوجیوں نے انگریزی حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جن میں قابل ذکر نام یہ ہیں۔ موجود شیدی، اللہ داد خاں، خالق داد خاں، مغل بیگ، شیخ دین محمد، ناصر خاں، کریم بخش، بسنت خواجہ سرائے اور قلی خاں وغیرہ۔

بہادر شاہ کے مقدمہ میں مسٹر سی۔ بی۔ سانڈرس قائم مقام کمشنر اور لفٹنٹ گورنر کے ایجنٹ سے سرکاری وکیل نے سوال کیا۔

"کیا تمہیں اپنی رجمنٹ میں کوئی آثار معلوم ہوتے تھے جس سے ظاہر ہوا ہو کہ سپاہیوں کو میرٹھ کے باغیوں کی آمد کی اطلاع پہلے سے تھی"؟

سانڈرس نے جواب میں کہا۔

"لفٹنٹ ویرٹ نے گذشتہ ستمبر میں مجھ سے کہا تھا کہ صوبیدار میجر کریم بخش نے کپتان رسل کو گیارہ مئی سے قبل اطلاع کی تھی کہ لوگ ہماری لائنوں میں آتے جاتے ہیں۔ اور سپاہیوں کو بغاوت کی تحریک کرتے ہیں" (۱۰۲)

جان الیوریٹ رسالدار سابق بیقاعدہ سواران نمبر ۱۴ رجمنٹ نے اسی مقدمہ میں اپنی شہادت میں سوال کا جواب دیتے ہوئے انکشاف کیا تھا۔

"موجود شیدی" جو بادشاہ کا ملازم تھا اس نے مجھ سے غدر سے تین روز پہلے کہا تھا کہ تم کمپنی کی ملازمت چھوڑ کر بادشاہ کی ملازمت کر لو

میں ہندوستانہ طریقہ سے تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ موسم گرما میں ہر جگہ رئیسوں کو پاؤگے۔ میں اس کے مشورہ پر چلتا۔"

انگریزی فوج میں باغیانہ مراسلوں کی روانگی

فوجیوں میں نہ بانی پر پیگنڈہ کے علاوہ بادشاہ کی طرف سے یا ان کے حامیوں کی جانب سے رجمنٹوں میں مراسلے بھی بھیجے جاتے تھے۔ جس کی تصدیق کپتان نارسٹ اسسٹنٹ کمشنری آف آرڈیننس نے اپنی شہادت میں کی۔

"میں جبتک دہلی میں رہا۔ اس قسم کا شبہ کسی پر نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۔مئی کو میرٹھ پہنچکر ہسپتال میں داخل ہونے پر کیونکہ میں زخمی ہو گیا تھا توپ خانہ ہسپتال کے سارجنٹ نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا دہلی کے میگزین میں کوئی ایسی ہوشیار شخص بھی ملازم تھا؟ میں نے کہا جی ہاں تھا۔ اور ایک شخص کریم بخش کا ذکر کیا۔ جو نہایت عقلمند اور عالم تھا۔ فارسی اچھی طرح لکھ پڑھ لیتا تھا۔ اس سارجنٹ نے پھر مجھ سے ذکر کیا کہ صبح ایک ہندوستانی نے مجھ سے آکر کہا کہ دہلی کے میگزین سے کسی شخص نے رجمنٹوں میں مراسلے بھیجے کہ جو کارتوس اس میگزین میں بنائے جاتے ہیں ان پر چربی لگی ہوتی ہے اور اگر انگریز افسر کوئی بات اس کے بارے میں کہیں تو ان لوگوں کو انکا مطلق اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ یہ شخص کریم بخش جس وقت ہندوستانی میگزین پر حملہ آور ہو رہے تھے بہت سرگرمی دکھا رہا تھا۔ اور حملہ آوروں سے سلسلۂ جنبانی کر رہا تھا۔ اس کی تمام حرکتیں ایسی مشتبہ نظر آئیں کہ لفٹنٹ

بلف یانی نے اسے دروازے سے باہر کرنے کا حکم دیا! ور کہا کہ اگر وہ دوبارہ ادھر گوشی کرے گا تو میں فی الفور اسے گولی مار دوں گا۔

لال قلعہ بغاوت کا مرکز

اسی فوجی سازش کا نتیجہ تھا کہ لال قلعہ میں مجرب کارتوس کے استعمال کرنے کی وجہ سے سپاہیوں میں ناراضگی کا اظہار ہونے لگا تھا۔ اور ان کے کانوں میں یہ آوازیں آنے لگی تھیں کہ میرٹھ کی فوجوں کو مجرب کارتوسوں کو استعمال کرنے کے لئے کہا گیا تو یہ قرار پا گیا ہے کہ وہ دہلی کی فوج سے آکر مل جائے گی۔ اور یہ سازش ہندوستانی افسر کے ذریعہ عمل میں آئے گی۔ جو کورٹ مارشل کی ڈیوٹی میں میرٹھ جائیگا۔

سنی ہوئی بات فوجیوں کے یقین تک پہنچ گئی تھی۔ بلکہ میرٹھ کی سپاہ کا قلعہ میں آنے کا انتظار کیا جانے لگا اور میرٹھ سے خطوط آنے لگے تھے جس میں لکھا ہوا تھا کہ ۸۲ سپاہیوں کو پابہ زنجیر کر لیا گیا ہے اور انجام کار معاملہ خطرناک صورت اختیار کر لیگا۔ چنانچہ قلعہ کے دربان علانیہ کہنے لگے تھے کہ ہمیں امید ہے کہ میرٹھ میں فوج بغاوت کر کے دہلی آ جائیگی۔

یہ چرچے سپاہیوں میں ہی نہیں بلکہ بادشاہ کے ملازموں اور مقربین میں ہونے لگے تھے جو اپنے خانگی کمروں میں بیٹھکر کیا کرتے تھے کہ فوج بہت جلد بغاوت کرنے والی ہے جس کے بعد وہ قلعہ میں آئیگی۔ پھر بادشاہی از سر نو قائم ہو گی۔ اور تمام قدیم ملازموں کو ترقیاں دی جائیں گی یہ گفتگو بسنت علی خاں اور بادشاہ کا پور اگر وہ کرتا تھا۔

حکیم احسن اللہ خاں جو بادشاہ کے بہت قریب رہتے تھے انتہائی قابل

اعتماد اور رازداں تھے۔ اور حکومت برطانیہ کے بہی خواہ تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ کے مقدمہ میں سرکاری گواہ کی حیثیت سے شہادت دیتے ہوئے شاہی فوجی سازش کا صاف اور واضح الفاظ میں اظہار کیا۔ اور میرٹھ کی بغاوت کو لال قلعہ کی سازش کا نتیجہ بتایا تھا۔ ان کے الفاظ یہ تھے

"نمبر ۳۸ دیسی پیادہ رجمنٹ نے کہا کہ انھوں نے غدر سے قبل ہی میرٹھ کی فوجوں سے مشورہ کر لیا تھا اور تمام چھاؤنیوں سے بذریعہ خط و کتابت طے کر لیا تھا۔ کہ سب دہلی میں آکر جمع ہوں قبل از بغاوت اپنی اپنی چھاؤنیوں کے انگریز مرد عورت اور بچوں کو قتل کر ڈالیں ان کی جملہ تدابیر اس وقت کی تیار کردہ نہیں تھیں جب ہنگامہ برپا ہو چکا تھا۔ میں نے ہنگامہ برپا ہونے کا جو ذکر کیا ہے اس سے میرا مقصد میرٹھ کے ہنگامہ سے ہے۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ ہنگامہ مذکور اچانک نہیں برپا ہوا بلکہ عرصہ دراز سے تدبیریں بنائی جا رہی ہونگی"۔ (۲۳۷)

بہادر شاہ کے مقدمہ میں سرکاری وکیل نے اپنی بحث میں بادشاہ پر جو الزامات عائد کئے تھے ان کے ساتھ "موجودہ جنبش" کا واقعہ بیان کرنے کے بعد میرٹھ اور دہلی کی سازش کی تصدیق کی۔ وہ کہتا ہے۔

"اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہنگامہ میرٹھ ہی صرف بغاوت نہیں تھی۔ بلکہ بغاوت کی تکڑی عرصہ سے بہت بڑا جال تن رہی تھی۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمان دیسی افسران اور اہل رجمنٹ دہلی و میرٹھ میں کوئی گہری سازش نہیں تھی۔۔۔ اس سے بھی زیادہ کریم بخش دہلی کا میگزین والا ہے۔ جو انگریزی تنخواہ

پاتے ہوئے فارسی کی تعلیم و تعلم سے فائدہ اٹھا کر دیسی رجمنٹوں میں
مراسلات بھیجتا ہے کہ میگزین کے ساختہ کارتوس مجرب کئے گئے ہیں
اور سپاہیوں کو اس معاملہ میں اپنے انگریز افسران کا اگر وہ کچھ کہیں
تو یقین نہیں کرنا چاہیئے۔ غور کیا جائے کہ یہ شخص کتنا بڑا خائن
ثابت ہوا۔ پھر جبکہ بادشاہ کی فوجیں میگزین پر حملہ آور ہو رہی
تھیں تو کیسی سرگوشیاں کر رہا تھا۔ کیا اس کی سازش میں شرکت
کرنے سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ جبکہ ظاہرا انگریزوں کی نوکری
کر رہا تھا۔ مگر باطن میں ان لوگوں سے ملا ہوا تھا۔ جو انگریزوں
کی تباہی کے درپے تھے۔

کل ہند بغاوت کی سکیم

سرکاری وکیل کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔ کہ ہنگامہ میرٹھ ہی صرف بغاوت نہیں تھی
بلکہ بغاوت کی مکڑی عرصے سے بہت بڑا جالا تن رہی تھی۔ حقیقتہً اگر میرٹھ کی
بغاوت سے قبل کی بغاوت کی مکڑی کے بڑے جالے میں انگریز پھنس جاتا تو
اس کا ہندوستان میں حکومت کرنا تو کجا اس کا نشان بھی نہیں ملتا۔ خدا
بھلا کرے ملک کے غداروں کا جنہوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

بنگال کی اس خوفناک بغاوت کا اندازہ انگریزوں کو ۵۷ء کی
جنگ آزادی کے بعد اس وقت ہوا کہ جب سپریم کورٹ نے ایک خاص
کمشنر مسٹر کریک رانت ولسن کو بدخواہوں کو سزا اور نیک خواہوں کو انعام
دینے کے لئے مقرر کیا تھا۔ اس نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں لکھا ہے

زبانی بیانات کو آپس میں مقابلہ کرنے سے مجھے اس امر کا واقعی یقین ہو گیا کہ ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء اتوار کا دن تمام بنگال کی سپاہ کے بغاوت کرنے کا مقرر ہوا تھا۔ ہر رجمنٹ میں تین آدمیوں کی کمیٹی اس کام کے فرائض ادا کرنے کے لئے مقرر ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ تدابیر تمام رجمنٹوں کو معلوم نہیں تھی مگر آپس میں یہ عہد و پیمان ہو گیا تھا کہ خاص رجمنٹیں جو کام کریں گی وہی اور رجمنٹس کریں گی۔ ان کمیٹیوں میں آپس میں خط و کتابت ہوتی تھی۔ اور آپس میں مل کر یہ تجویز ہوئی تھی کہ ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ان کمیٹیوں کو اطلاع دی جائے کہ وہ تمام یورپین عہدہ داروں کو مار ڈالیں۔ جن میں سے زیادہ تر گرجا میں نماز پڑھتے ہوں گے۔ ان خزانوں پر قبضہ کیا جائے جو اس وقت فصل ربیع کے مالیہ سے بھرے ہوئے ہوں گے۔ جیل خانوں سے قیدی چھوڑ دیئے جائیں۔ جن کی ایک بڑی فوج پچیس ہزار سپاہیوں کی تیار ہو جائے گی۔ دہلی کی رجمنٹوں اور اس کی آس پاس کی پلٹنوں کو ہدایت ہوئی تھی کہ وہ میگزین اور قلعوں پر قبضہ کرلیں۔"

اس سازش کی اطلاع لفٹننٹ کرنل سمائیتھ جو تیسری رجمنٹ بنگال لائٹ کیولری کے کمانڈر تھے ان کو ہو گئی تھی۔ انھوں نے چند گھنٹوں میں تار کے ذریعہ ملک کے تمام حصوں کے انگریزوں کو مطلع کر دیا تھا جنھوں نے اپنی حفاظت کے معقول انتظام کر لئے تھے۔

جب یہ سازش ناکام ہو گئی تو میرٹھ میں نے دوسری شکل اختیار کر لی بہادر شاہ ظفر ان کے ساتھیوں اور ہندوستان کی فوجیوں کو تو تذکرہ

کے خلاف قدم اٹھانا ہی تھا۔ چنانچہ انھوں نے اٹھایا۔

میرٹھ میں بغاوت

طے شدہ پروگرام کے مطابق ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں بغاوت کی چنگاریاں پھیلیں۔ فوجیوں نے انگریزوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ اور اسی روز ایک گاڑی بھری ہوئی میرٹھ کے تلنگوں کی دہلی چھاؤنی میں آئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیر کی صبح کو دہلی کی ایک رجمنٹ یعنی ۳۸ ویں رجمنٹ ۵۴ ویں رجمنٹ، سی برٹ اندلہ ۷۴ ویں رجمنٹ بغاوت کے لئے آمادہ و تیار تھی۔[1]

دہلی میں مجاہدین کا آنا

اسی رات کو میرٹھ سے تیسرے رسالے کے سوار چاندنی رات میں گھوڑوں پر سوار دہلی کی طرف چلے۔ ان کے پیچھے پیدل پلٹن بھی تیز قدم اٹھاتی کشاں کشاں چلی۔ صبح ہوتے ہی وہ جمنا پر پہنچے۔ ان کے سامنے دہلی شہر نظر آرہا تھا۔ ابتداً انھوں نے سلیم پور کی پرمٹ چوکی کو آگ لگانے سے کی اور اس کے کلکٹر کو قتل کیا۔ آٹھ بجے سے قبل جمنا کی کشتیوں کے پل کو چند سواروں نے جو سب سے آگے تھے عبور کیا۔ مسٹر ٹوڈ جو میرٹھ کے بگڑے ہوئے تاروں کو درست کرنے جا رہے تھے ان پر ہاتھ صاف کیا اس کے بعد کلکتی دروازہ پر گئے تو اس کو بند پایا پھر جھروکوں کے نیچے آگئے۔ بہادر شاہ ظفر نے حکیم احسن اللہ خاں صاحب سے کہا کہ ان لوگوں سے معلوم کرو تم لوگ کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو اور یہاں کیوں آئے ہو۔ حکیم احسن اللہ خاں نے تسبیح خانہ میں آکر سواروں سے دریافت کیا۔ سواروں کے چند افسر گھوڑوں سے اتر کر کھڑے ہو گئے۔ اور جھروکے

۱؎ تاریخ بغاوت ص

لال قلعہ میں چھپنے والا اور بہادر شاہ ظفر کی نگرانی میں شائع ہونے والا سراج الاخبار — مورخہ ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء اس میں دہلی میں مجاہدین کے پہنچنے کی پہلی خبر شائع ہوئی ہے۔

حضور جہاں پناہ سلامت! آپ روئے زمین دنیا کے بادشاہ ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کو بائیس
صوبوں کا مالک کیا ہے! تمام ہندوستان آپ کا محکوم فرمانبردار ہے۔ ہندوستان کی رعیت
آپ کی رعیت شمار ہوتی ہے آجتک ہندوستان میں جو منادی پھرتی ہے اس میں
یہی کہا جاتا ہے "خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا حکم کمپنی کا"، انگریز آپ کی طرف سے مالک
مختار ہیں۔ ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں۔ انصاف کے امیدوار ہیں۔ ہم لوگ ملازم
انگریزی ہیں۔ ہم نے اپنی جانیں بیچکر اور سر کٹوا کر کلکتہ سے لگا کر کابل کے ڈیرے تمام
فتح کر کے چودہ سو کوس میں عملداری انگریزی قائم کرادی۔ یہ ولایت سے کوئی فوج
لیکر نہیں آئے تھے سب ہندوستانی فوج کی کارگذاری ہے۔ اب چونکہ تمام
ہندوستان پر قبضہ و تسلط انگریزوں کا ہوگیا۔ اور کوئی سرکش باقی نہ رہا اب
سرکار کی نیت میں فتور آگیا ہے۔ اور ہمارے دین و مذہب کے تخریب کے درپے ہے
اور چاہتی ہے کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کرلیں۔ اور اس کی ابتدا فوج سے ہونی
چاہیئے۔ چنانچہ باہم صلاح سے ایک قسم کی ایسی بندوق ایجاد کی گئی کہ جس میں
ٹوٹا یعنی کارتوس دانتوں سے کاٹ کر بندوق کے منہ میں دینا پڑے اور اس
کارتوس کو جانوروں کی چربی سے منڈھوایا گیا۔ وہ بندوقیں ہم لوگوں کو دی گئیں
کہ تم کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹ کر بندوقوں میں ڈالو۔ ہم لوگوں نے بالاتفاق
ہندو اور مسلمانوں نے تعمیل حکم سے انکار کیا کہ ہم ہرگز ہرگز ایسا نہیں کریں گے
خواہ سرکار نوکر رکھے یا نہ رکھے۔ ہندوؤں کو گائے کی چربی کا اشتباہ ہوا اور مسلمانوں
کو سور کی چربی کا .... ہم کو خیال آئین دین دامنگیر ہوا۔ نزاع بڑھ گئی۔ چار مہینے
سے یہ نزاع درپیش ہے۔ حکام میں کمیٹیاں ہورہی ہیں۔ اور ہم لوگوں میں بھی

سوار پیادوں کی چھاؤنیوں میں جابجا چٹھیاں دوڑ گئی ہیں کہ یک قلم کل فوج ہڑتال
کر جائے۔ اور نوکری چھوڑ دے۔ اور زیادہ تشدد ہو تو ایک دن ایک تاریخ میں بالاتفاق
تمام ہندوستان میں غدر مچا دو پھر دیکھو یہ کیا کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ افسران رسالہ۔
(میرٹھ) کو بندوق میں کارتوس دیکر حکم سنایا گیا کہ تم اس ٹوٹے کو کاٹو۔ افسران
نے معذرت کی کہ سرکار معاف فرمائے۔ ہم دین سے بے دین کبھی نہیں ہوں گے
خواہ سرکار ہم کو توپ سے اڑا دے۔ جب افسروں نے انکار کیا۔۔۔ حکم ہوا۔ تم
لوگوں کو عدول حکمی کی سزا دی جاتی ہے۔ تم جیل خانے جاؤ۔ جب ہم جیل
گئے تو کیمپ میرٹھ میں تہلکۂ عظیم برپا ہو گیا۔۔۔۔۔ باہم یہ صلاح قرار پائی کہ شب کو
جیل خانہ توڑ کر افسران فوج کو چھڑا لاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ بوقت
شب افواج پیادہ و سوار کی متفقہ کمر بندی ہو گئی۔ اور جیل خانے پر چڑھ
گئے اور جیل خانہ توڑ کر چوراسی افسر جو قید تھے ان کو قید سے نکال لائے
اب تمام شہر میں غدر مچ گیا۔ ہنگامۂ جنگ و قتال ہوا۔ صبح کو ہم لوگ دہلی
روانہ ہوئے تیس کوس مسافت طے کر کے آج اس وقت ہم یہاں پہنچے ہیں بادشاہ سلامت
ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں۔ ورنہ ہمارا انصاف فرما دیں۔ ہم دین پر بگڑ کر آئے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق اس ہنگامہ میں بادشاہ نے کوئی جواب نہیں
دیا۔ دوسرے راوی کہتے ہیں کہ جواب دیا۔ لیکن اپنی معذوری ظاہر کی۔ جو
صحیح نہیں ہے۔

انگریزی فوج میں بغاوت

میرٹھ کے فوجیوں کے آنے سے پہلے دہلی کے کمشنر کو فوجیوں کی آمد کی خبر مل گئی تھی

کمشنر اور کلکٹر نے شہر کے دروازوں کو بند کرنے اور جمنا کے پشتیں کا بندوبست کیا۔ کمشنر صاحب اور سائمن فریزر وہ گھوڑوں کی بگھی پر سوار تھے۔ وہ میگزین کے پاس پہنچے وہاں تلنگوں کی کمپنی کھڑی تھی۔ کمشنر نے ان سے کہا ہمارے ساتھ چلو بندوبست کرو۔ انھوں نے جواباً کہا ہم دھرم کے ساتھ ہیں آپ کے ساتھ نہیں چلیں گے۔ انھوں نے سلامی بھی دستور کے مطابق نہیں دی۔ نہیں معلوم کس طرح اور کس وقت ایک ترک سوار سب سے پہلے شہر میں آ گیا تھا۔ وہ قلعہ کے لاہوری دروازہ کے تلنگوں کے پاس گیا۔ اس کے بعد میگزین کے تلنگوں سے ملتا ہوا کشمیری دروازہ کے تلنگوں کے پاس پہنچا گفتگو کی اور ان کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

شہر کے دروازوں پر انگریزوں کا سخت پہرہ تھا کہ مجاہدین دہلی میں داخل نہ ہونے پائیں۔ مگر یکایک راج گھاٹ کا دروازہ کھل گیا۔ جتنی زبانیں تھیں اتنی ہی باتیں تھیں۔ کوئی کہتا تھا پہرہ والا ملا ہوا تھا اس نے دروازہ کھول لیا کسی کا خیال تھا کہ کوئی سبز پوش سوار آیا تھا۔ اس نے کھول دیا۔

دہلی میں انگریزوں کا قتل

سوار شہر میں داخل ہو گئے جو انگریز ان کو ملا قتل کیا۔ انگریزوں کی کوٹھیوں میں آگ لگا دی۔ دین دھرم انکا نعرہ تھا۔ جہاں جاتے اُن کی خاطر مدارات ہوتی تھی حتیٰ کہ کئی قسم کے ہندوؤں نے ان کو دالوں اور بتاشوں کا شربت نیبو ملا کر پلایا۔ یہ آزادی کے ساتھ شہر میں انگریزوں اور عیسائیوں کی تلاش کرتے پھر رہے تھے ان کو معلوم تھا کہ چھاؤنی میں جتنی پلٹنیں ہیں ان سے

ایک سپاہی بھی ایسا نہیں ہے جو انگریزوں کی حمایت میں اپنی بندوق کا گھوڑا چڑھائیگا۔ یا تلوار نیام سے نکالیگا۔[1] ان کے ساتھ شہر کے عوام بھی ہو گئے تھے کسی کے ہاتھ میں پلنگ کی پٹی، کسی کے ہاتھ میں بانس کا ڈنڈا تھا۔[2]

ایک طرف میرٹھ کے مجاہدین شہر میں گشت لگا رہے تھے۔ دوسری طرف کمشنر فریزر اور انگریز افسران اپنے فوجیوں کو اعانت کے لئے طلب کر رہے تھے کمشنر صاحب، کپتان ڈگلس، سر طامس مٹکاف، ہچنسن وغیرہ انگریز کوتوالی میں جمع ہوئے۔ جہاں اور انگریز بھی موجود تھے۔ مجاہدین کا گروہ آیا۔ ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انھوں نے انگریزوں پر حملہ کیا ہچنسن صاحب زخمی ہوئے۔ فریزر صاحب نے اڑتیسویں پلٹن کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر انھوں نے اس کی کچھ نہیں سنی۔ نہ تقریر کام آئی نہ حکم پر توجہ دی۔

افسران نے جب یہ دیکھا کہ مجاہدین کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے تو وہاں سے فرار ہوئے۔ فریزر صاحب بگھی میں بیٹھکر قلعہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ کپتان ڈگلس اور ہچنسن صاحب ہوئے۔ ایک سوار فریزر صاحب پر حملہ کرنا چاہتا تھا کہ انھوں نے دیکھ لیا۔ اور اس کو گولی سے شہید کر دیا۔ سوار بے قابو ہو گئے۔ انھوں نے کہا۔ تم نے ہمارے ایک سوار کو مارا ہے اب ہم تم کو ہرگز زندہ نہیں چھوڑیں گے[3] لال قلعہ کے پاس جب یہ افسران پہنچے تو سواروں نے کپتان ڈگلس کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔ وہ قلعہ کی خندق میں کود گئے۔ سخت چوٹ لگی۔ ان کے چپراسی انکو قلعہ میں لے گئے۔

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ص ۷۵۳ [2] دہلی اردو اخبار دہلی ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء [3] داستان غدر ص ۵۹

مجاہدین قلعہ کے باہر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ انھوں نے دربانوں سے کہا تم لوگ دین کے ساتھی ہو تم نے قلعہ کا دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے دروازہ کھلا اور یہ لوگ قلعہ میں داخل ہو گئے۔

مسٹر فریزر کپتان ڈگلس کے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ سیڑھیوں پر ہی پہنچے تھے کہ حاجی لوہار نے ان پر حملہ کیا۔ ان کے گرتے ہی خالق داد، قبولی پٹھان، مغل بیگ اور شیخ دین محمد نے جو ڈیوڑھی میں چھپے ہوئے تھے دوڑے اور ان کے سر، چہرہ اور سینے پر مسلسل حملے کئے۔ جس سے مسٹر فریزر کا کام تمام ہو گیا۔ انھوں نے مسٹر فریزر کو ہلاک کر کے کپتان ڈگلس کے مکان کا راستہ پکڑا۔ اور جم غفیر کو ہمراہ لیکر سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا جب وہ زینے پر چڑھ گئے تو ڈگلس کے ملازم ماکھن نے اندر جاکر مجاہدین کے اندر داخل ہونے کی اطلاع دی۔ اسے دروازہ بند کرنے کی تاکید کی گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ کمرہ کے جنوبی رُخ سے معدوہ آدمی دوسرے زینے سے اوپر چڑھ گئے۔ وہاں سے اندر داخل ہوئے اور دروازہ کھول دیا۔ ان لوگوں نے یکے بعد دیگرے ڈگلس، ہچنس، مسٹر جننگس اور وہ تمام انگریز جو کپتان ڈگلس کے مکان میں تھے سب کو قتل کر ڈالا۔[۱]

پھر کیا تھا قلعہ بھر میں شور شروع ہو گیا۔ تیسرے رسالے کے سوار ۱۱ویں اور ۲۰ویں پلٹن اور میرٹھ کے مجاہدین کی پلٹن جو دن بھر آتی رہی ان سے قلعہ کے چوک اور غلام گردشیں تک بھر گئی تھیں۔

شہر میں تمام کاروبار بند تھے۔ دکانداراپنی دکانوں کو بند کر کے

۱؎ مقدمہ بہادر شاہ ص۳۷

اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔ مجاہدوں نے دہلی گزٹ پریس، دہلی بنک، دہلی کالج اور ٹیلی گراف آفس کا سامان لوٹا۔ عمارتیں جلائیں۔ ان کے محافظین کو قتل کیا۔ کشمیری دروازہ تمام تلنگوں سے گھرا ہوا تھا۔ جو انگریزوں اور اُن کے خاندان کو مارنے کے لئے تیار تھے۔ انگریزوں کے مکان سے آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل آسمان پر اڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

مجاہدین کے حملوں نے انگریزی فوجی افسران کو سانس لینے کا بھی موقع نہیں لینے دیا تھا۔ جب اُن کو کچھ ہوش آیا تو انھوں نے بگل بجایا۔ اُن کو صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ ہندوستانی فوج باغی ہو گئی ہے۔ فوجیوں نے جب بگل کی آواز سنی تو کمریں سنبھال کر تیار ہو گئے۔ اڑتیسویں اور چوہترویں رجمنٹ کو جن کی بندوقیں خالی تھیں حکم ہوا کہ بندوقیں بھریں۔ اور اسی وقت کپتان والیس جو آج کے دن کے فیلڈ آفیسر تھے انھوں نے اڑتیسویں رجمنٹ کے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مجاہدین پر باڑھ ماریں۔ سپاہیوں نے اس حکم پر ناک بھویں چڑھائیں۔ اور حکم کو نہیں مانا۔ ایک بھی بندوق کو جنبش نہیں دی۔ چوہترویں رجمنٹ بھی اپنے ساتھیوں سے کم نہیں تھی۔ اُنھوں نے بھی بندوقیں ہوائی چھوڑیں۔ اور اُلٹا بعض افسروں پر فیر کیا جس کی وجہ سے مجاہدین نے کرنیل ریلی کو مار ڈالا۔ اور جو افسر گھوڑوں پر سوار تھے ان کو بندوق اور کرابینوں سے مارا۔ اور جو افسر پیدل تھے ان کو سنگینوں سے مارا۔ سمتھ بروش، ایڈورڈس اور واٹر فیلڈ قتل ہوئے۔ نواب حامد علی خاں کی مسجد کے آگے نکس صاحب کمشنری کے

دفتر کے افسر کا لاشہ پڑا ہوا تھا۔ اور کسی ظریف نے ایک بسکٹ اس کے منہ کے پاس رکھ دیا تھا۔[1]

گیارہ مئی کی صبح ۹ بجے کی بات ہے کہ کپتان ٹلر اڑتیسویں پیادہ رجمنٹ کو معلوم ہوا کہ مجاہدین میرٹھ دہلی چلے آ رہے ہیں۔ ان کو روکنے کے لئے کپتان گارڈ نر لائنوں میں پہنچے تو سپاہیوں کے طور طریقے اور تیور بدلے ہوئے پائے۔ بڑی دقت کے بعد وہ کمپنیوں میں سے سو سو آدمی منتخب کرنے میں کامیاب ہوئے۔ میگزین میں گئے تو عجب ماجرا نظر آیا۔ بارود لینے میں سپاہی دیر لگا رہے ہیں۔ اور خلاصیوں سے غصہ کر رہے ہیں کہ کارتوس اور ٹوپیاں ہم کو زیادہ دو۔ خلاصی بغیر گنتی کے دے نہیں سکتے۔ اس لئے دیر لگنی لازمی تھی۔ جوں توں کر کے کپتان نے بارود تقسیم کی۔ کارتوس اور ٹوپیوں کی تقسیم ہونے کے بعد ہر شخص کارتوسوں کے بنڈل اٹھانے لگا جب کمپنیوں کی چلنے کا حکم دیا تو سپاہی چلاتے ہوئے لائنوں سے نکلے اور راستہ بھر شور و غوغا مچاتے ہوئے چلے۔ کپتان نے منع بھی کیا۔ لیکن باز نہیں آئے۔ جب میگزین کے قریب پہنچ گئے تو کپتان نے مختلف مقاموں پر سنتری قائم کر دئے۔ باقی سپاہی مکان کے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کپتان ایک کمرے میں گیا۔ اور دیکھا کہ ایک ہندوستانی سپاہی اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا ہے۔

تمام طاقت و حکومت ایک وقت معینہ تک رہتی ہے۔[2]

---

[1] دہلی اردو اخبار ۱۷۔ مئی ۱۸۵۷ء

کتابوں میں لکھا ہے۔ پس کیا تعجب ہے جو انگریزی عملداری ہی برلبِ انصرام ہی ہو۔"

کپتان چاہتا تھا کہ اس سپاہی کو قید کرے کہ اتنے میں شہر کا میگزین اڑ گیا، پھر دونوں کمپنیوں کے سپاہیوں نے ہتھیار اُٹھائے۔ "برہمنی راج کی جے ہو"۔ کا نعرہ لگا کر شہر کی طرف بھاگ گئے[1]

انگریزی میگزین کی بربادی

جب میرٹھ کے سوار دہلی میں آگئے تو انگریزوں کو سب سے پہلے فکر میگزین کی ہوئی اس کو بچانے کا صبح آٹھ بجے سے انتظام کرنا شروع کر دیا تھا۔ میگزین کے دروازے بند کر دئے تھے اور مٹی بھر کر تھیلوں کے مورچے بنا لئے تھے۔ اور دروازے کے اندر توپیں گراپوں سے بھر کر لگا دی تھیں ان ماس کا نگراں سارجنٹ سٹوورٹ کو متعین کیا کہ وہ روشن بتیاں ہاتھ میں لے کر کھڑے رہیں۔ اگر دروازہ پر کوئی حملہ ہو تو دونوں توپیں ایک ہی دفعہ چھوڑ دیں۔ پھر ہندوستانیوں کو ہتھیار دیے گئے جنھوں نے باسکرا ملئے وہ برافروختہ ہی نہیں معلوم ہوتے تھے بلکہ حکم عدولی کرنے پر تیار تھے کسی کے حکم کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔ اور افسران انگریزی کی توہین کرنے پر آمادہ تھے، اور لبا اوقات دھمکا بھی دیتے تھے۔ اندر اس روز خاص طور پر سپاہی اس شان سے میگزین میں آتے تھے جیسے کسی اہم تقریب میں شامل ہونے کو آئے ہوں۔ بخلافین نہایت نفیس لباس پہنے ہوئے تھے۔ جو کبھی انہیں پہنے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ حتی کہ مزدور تک اپنی معمولی

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ صفحہ ۱۵۱

پوشاک میں نہیں تھے بلکہ صاف ستھری پوشاک پہنے ہوئے تھے۔[۱]

اس انتظام کے بعد سارجنٹ سٹوورٹ نے زمین پر ایک قطار میں بارود بچھا دی تھی اور اس میں آگ لگانے کا اشارہ مقرر کر دیا تھا کہ جب "لوبائی" حکم دیں تو بکلی اپنے سر سے ٹوپی ہٹالے تو بارود میں آگ لگا دی جائے۔

یہ انتظامات ہو رہے تھے کہ نو دس بجے کے درمیان اڑتیسویں رجمنٹ دیسی پیدل کے صوبیدار نے جو میگزین کے دربانوں کا افسر تھا اور میگزین سے باہر رہا کرتا تھا اس نے کپتان فارسٹ کو اطلاع دی کہ بادشاہ دہلی نے میگزین پر قبضہ کرنے کی نیت سے ایک فوجی گارد بھیجا ہے۔ کپتان نے بیان سے کہا کوئی توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دیسی افسر بادشاہی سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر صوبیدار دربان کے پاس آیا۔ کہنے لگا کہ بادشاہ نے تمہاری امداد کے لئے ہمیں روانہ کیا ہے اس پر بھی شکوک اختیار کیا گیا۔ دیسی افسر نے میگزین کے ہر ایک دروازے پر ایک ایک ماتحت افسر کے ہمراہ بارہ بارہ سپاہیوں کو مقرر کر دیا تھا۔ یہ سب کے سب فوجی شاہی وردی پہنے ہوئے تھے۔ دوبارہ صوبیدار کو دربان نے خبر دی کہ بادشاہ نے مجاہدین کے پاس پیغام بھیجا ہے کہ وہ قلعہ سے سیڑھیاں بھیجے گا تاکہ میگزین کی دیواروں پر چڑھ جائیں۔ چنانچہ فوراً ہی زینے آ گئے اور دیواروں پر لگا دئے گئے۔ جب دیواروں پر سے مجاہدین چڑھ آئے تو انگریزی فوجوں نے برابر گولیاں چلائیں اور ان کا مقابلہ کرنے لگے۔ ان کو میگزین میں آنے سے روکا۔

---

[۱] شہادت کپتان فارسٹ اسسٹنٹ کمشنر آف آرڈی نینس مقدمہ بہادر شاہ منث۔

اس میں ناکام ہوئے انجام کار جب میرٹھ کی گیارہویں اور بیسویں رجمنٹ میگزین میں داخل ہو گئی تو چند سیکنڈ میں میگزین کو اڑا دیا گیا

بقول کپتان فارسٹ میگزین پر حملہ کرنے کی تدبیریں کرنے والے بادشاہ بہادر کے ایک پوتے تھے جو ان مجاہدین کی رہنمائی کر رہے تھے۔

میگزین کو تباہ کرنے کی جو غرض انگریزوں کی تھی کہ تمام سامان ضائع ہو جائے وہ پوری نہیں ہوئی۔ بلکہ اس میں کافی سامان بچا جس پر مجاہدین نے قبضہ کرلیا۔ چنانچہ اس سامان کو آخری وقت تک کام میں لاتے رہے اس کی علاوہ توپوں کو شہر کے گرد برجوں پر چڑھایا۔[1]

یہی ہی نہیں بلکہ اس میگزین کے محاذی چند گز کے فاصلہ پر اس کا کُہار خانہ تھا۔ جس میں سلحے اوزار وغیرہ تھے اس پر بھی مجاہدین کا قبضہ ہوگیا تھا۔

مجاہدین یہاں سے فارغ ہونے کے بعد دہلی کے جیل خانہ پر پہنچے وہاں کے محافظین سے مل کر جیل خانہ کو تڑوا دیا۔ قیدی رہا ہوئے۔ قیدخانہ میں جو خزانہ تھا وہ مجاہدین اپنے ہمراہ لائے۔ اور بہادر شاہ کو سونپ دیا۔

میگزین اڑنے کے بعد چھاؤنی میں سپاہیوں نے کھلی بغاوت اختیار کی۔ بارود خانہ پر جو اڑتیسویں رجمنٹ کی دو کمپنیاں تھیں انھوں نے پرتھوی راج کی جے پکاری۔

اہل قلعہ کی جنگ میں شرکت

۱۲ مئی کی صبح سے ہر جگہ یہ شور و غل تھا کہ بادشاہ مجاہدین کی طرف سے

[1] تاریخ بغاوت ہند ص ۲۶

اب انگریزوں سے لڑنا گویا بادشاہ کی طرف سے لڑنا ہے اور مغلوں کی سلطنت کو قائم کرنا ہے۔ میگزین کے حادثے کے بعد اہل قلعہ نے عملی طور پر کھلم کھلا مجاہدین کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ دہلی کے ہندو مسلمان سمجھتے تھے کہ بادشاہ کی حکومت قائم ہونے کے بعد پھر ہم بڑے عہدوں پر سرفراز ہوں گے اس لئے دہلی کے عوام نے بھی اس تحریک آزادی میں شرکت کی۔ جس کی وجہ سے ساری دہلی میں بغاوت کی آگ پھیل گئی۔ کشمیری دروازہ سے اڑتیسویں رجمنٹ نے گولیاں چلانی شروع کیں۔ گولڈن صاحب جو آج کے دن کے فیلڈ افسر تھے اور آر سمتھ اور رزی لی چوہتردیں پلٹن کے افسر مارے گئے۔ چھاؤنی میں جتنی توپیں تھیں ان پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ اب انگریزوں نے سمجھ لیا کہ مجاہدین کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ شہر اور چھاؤنی کو انگریزوں نے خالی کر دیا۔ اور مجاہدین نے لال قلعہ کو اپنا مرکز بنا لیا۔

جنگی کونسل کی تشکیل

یوں تو گیارہ مئی کو دن کے تین بجے سہ پہر کے قریب بہادر شاہ کی حکومت کا شہر دہلی میں اعلان کر دیا گیا تھا۔ اس کو ضابطہ میں لانے کے لئے رات کو مجاہدین نے بادشاہ سے عرض کیا کہ قوت ایمانی و دینی کی وجہ سے سب ہندوستانی فوج انگریزوں سے منحرف ہو گئی ہے۔ اب ہم سب جاں نثاروں کی آپ سے درخواست ہے کہ حضور کی اطاعت کر کے استیصال نصاریٰ کریں۔
بادشاہ نے فرمایا تمہیں اختیار ہے خیر میں بھی شریک حال ہوں اس کے بعد بادشاہ محلسرائے میں داخل ہوئے اور آدھی رات کو توپ خانہ چھاؤنی

سے قلعہ میں آئے اور ۲۱ توپ کی سلامی ہوئی۔ سپاہ کی درخواست پر بادشاہ نے شاہزادوں کو حسب ذیل طریقے پر فوجوں کا افسر مقرر کیا۔[۱]

کمانڈر انچیف مرزا مغل، کرنل پلٹن والنٹیر مارپٹ مرزا خضر سلطان کرنل پلٹن بیلی مرزا عبداللہ، کرنل پلٹن الگزنڈر مرزا سہراب ہندی عرف مرزا مینڈو، کرنل پلٹن رن سٹ مرزا بختاور شاہ، کرنل رسالہ مرزا نصرت الملک عرف مرزا ابوبکر بیٹے مرزا فتح الملک ولیعہد متوفی۔

ہندو مسلمانوں کی جنگ آزادی میں شمولیت

کپتان الیکزینڈر ہیدرلی آزاد جو اردو کے مشہور شاعر تھے۔ فراسو کے نام سے مشہور تھے اور الور کے توپ خانہ کے کپتان تھے انھوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دہلی کے حالات پر ایک کتاب منظوم لکھی ہے۔ جس کا نام ہے "ظفر الظفر بنام فتح نامہ انگریز" اس میں انھوں نے مجاہدین کا ذکر اپنے انداز میں کیا ہے۔

بدہلی رسیدند جمعی لعین — درآں جنگ خواہند شد شرگیں

نداریم از باغیاں، ہیچ کام — دو سردار داریم ازاں لجام

مسلماں جہادی ہندواں ہمہ

جمع ہر گشتہ ازاں کمۂ ماہ

بہادر شاہ طلبیدہ آں ہر دو را — قسم خوردہ آورد بر مدعا

ہندواں قسم، ام گنگا خراہد — مسلماں قرآں بر سر نہند

پسر خویش را شاہ جرنیل کرد — نبیرہ کہ بود آں را کرنیل کرد

---

[۱] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۴۳

ہنود و مسلماں بہ یین و کرم
بہم گشتہ با خود بدین و دھرم

بہادر شاہ کی بادشاہی کا اعلان

غدر سے پہلے جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی دہلی پر قابض تھی بہادر شاہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی بادشاہی و حکمرانی کا ڈھنڈورا اس طرح پیٹا جاتا تھا "خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا، حکم سرکار کمپنی کا"۔

۱۲ مئی سے صرف بادشاہ کی بادشاہت کا ان الفاظوں میں ڈھنڈورا پیٹا جانے لگا۔ "خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا"، کمپنی کا نام اُڑا دیا گیا۔

بہادر شاہ کی فوج کی بھرتی کا اعلان

اس کے بعد بادشاہ نے فوج کی بھرتی کا اعلان کرایا کہ سوار کو تیس روپے ماہانہ اور پیدل کو بارہ روپے ماہانہ دیے جائیں گے۔ لہ

اس اعلان کے بعد بہت سے تجربہ کار سپاہی اور توپچی بادشاہ کے ملازم ہو گئے۔ ان میں کالے خاں بہت مشہور تھے۔ وزیر و زینک اُن کی ساتھ تھی۔ یہ بھی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد شہید فرنگ ہوئے تھے۔

جبکہ تمام ہندوستان میں انگریز چھایا ہوا تھا۔ اور بڑی طاقت و قوت کا مالک تھا۔ ان میں کسی قسم کا انتشار نہیں تھا بلکہ سب انتہا متحد تھے! اس کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کی یہ پوزیشن تھی کہ ان کی کسی بھی مقام میں کوئی بھی چھوٹی موٹی حکومت نہیں تھی اقتدار کا دیوالہ نکال چکے تھے۔ لال

لہ رہنمائے دہلی ص ۱۳۷

قلعہ میں مخبروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ خاندانی اختلافات رونما تھے دربار میں
اور مقربین شاہی میں کوئی اتحاد و یکجہتی نہیں تھی۔ عوام کا کوئی سربراہ نہیں
تھا۔ وہ بھی منتشر حالت میں تھے۔

ان حالات میں دہلی کی بادشاہت کا ڈھنڈورا پیٹنا اور انگریزوں کے
خلاف فوج کی بھرتی کا اعلان کرانا یقیناً مضحکہ خیز بات ہی سمجھی جاسکتی تھی
اور اس فضا و ماحول میں کون یقین کرسکتا تھا کہ انگریزوں سے مجاہد
ٹکر لے سکتے تھے۔

لیکن واقعات نے ثابت کردیا کہ اس آزادی کی جنگ میں کچھ نہ کچھ
خلوص پایا جاتا تھا۔ اور اس کے چلانے والے مخلص تھے۔ عوام کو اس
تحریک سے ہمدردی تھی۔ وہ غلامی کی لعنت کو برا سمجھتے تھے۔ اور ان کو
انگریزوں سے نفرت تھی۔ اس لئے کمزور ناتواں بکری نے شیر ببر سے ڈٹ کر مقابلہ
کیا۔ اور مسلسل شکست کھانے کے بعد بھی آخر تک جھکے نہیں
بلکہ انگریزوں کے چھکے چھڑاتے رہے۔ چار مہینے چار دن کے عرصے میں کوئی
کسی دن بھی حملہ کرنے سے باز نہیں آئے۔ اور بار بار انگریزوں کو محاذ جنگ
سے فرار ہونے پر مجبور کرتے رہے۔

بادشاہ کو مروانے کی سکیم

بظاہر گیارہ مئی کو دہلی سے انگریز نکل گیا تھا
لیکن اسی دن سے دہلی پر قبضہ کرنے کی
تیاری شروع کردی تھی۔ فوجیں بھی جمع کر رہا تھا۔ اور سازشی جال پھیلانے
میں بھی مصروف تھا۔ اور اپنے جانشینوں کی دہلی میں بادشاہ کی بیخکنی

کرنے کے لئے ڈیوٹیاں لگا دی تھیں۔ اُن کو مروانے کے بھی منصوبے بنائے جاتے تھے۔

۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے کہ بہادر شاہ دربار عام میں تھے۔ کہ ایک فقیر تہمت باندھے کھاروے کا کرتہ پہنے سر پر کچھ کپڑا بندھا ہوا، اور لوہے کا پشت خار ہاتھ میں لئے ہوئے تسبیح خانہ کے دروازہ پر لال پردے کے قریب پہنچکر کہنے لگا مجھکو بادشاہ سے خلوت میں کچھ کہنا ہے۔ دربان نے بادشاہ کو خبر کی۔ حکیم احسن اللہ خاں کو حکم ہوا۔ تم جاکر معلوم کرو کون ہے۔ فقیر نے کہا میں راجہ جیر کھاری کا چچا ہوں مدت سے سیاحت کرتا ہوں۔ راجہ نے یہ ہنگامہ سُنکر مجھکو بادشاہ کے پاس بھیجا ہے۔ امیدوار ہوں حاضر ہونے کا حکیم صاحب نے کہا تم شام کو میرے گھر آنا۔ جب فقیر لال پردے سے چلا ایک ملنگہ جو پہرے پر تھا اس نے اس کو شناخت کرتے ہوئے کہا یہ سپاہی لارنس صاحب کا ہے جو معرکۂ کابل میں محمد اکبر خان کا سائیس بن کر نوکر رہا تھا۔ بادشاہ کے لوگوں نے کہا تیرا گمان غلط ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ اس کی پیٹھ پر دیکھو ایک تیر کے زخم اور گولی کے دو زخم ہیں اس کا رنگ اور جسم انگریزوں کے جسم جیسا ہے۔ اس کے بدن کو چھیلو روغن ملا ہوا ہے۔ بدن چھیلا تو جلد سفید نکلی۔ جبراً کرتہ اتروایا تو تینوں نشان ٹھیک پائے تو اس کو سپاہیوں نے قتل کر دیا[1]

مجاہدین کو فریب دیکر شہید کرنا

غازی آباد کے بعد سرائے بادلی میں ۸ جون ۱۸۵۷ء کو مقابلہ ہونا

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوئم ص ۲۲۳

تھا۔ جون کی شام کو انگریزوں نے رسالہ چہارم سے ایک پُر فریب خط بادشاہ کو بھجوایا۔ کہ کل صبح جنگ ہونے والی ہے۔ ہم نے فی سبیل اللہ آپ کی حمایت میں لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم لوگ علی الصباح شاہی فوج کی راست جانب سے آئیں گے۔ مخالف سمجھ کو ہم پر گولیاں نہ برسائیں۔ بادشاہ نے فوج کو ہدایت کر دی صبح ہوئی انگریزی فوج علی پور سے سرائے بادلی پہنچی۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ داہنی طرف سے مذکورہ پانچ سو سپاہی کی فوج کابلی لباس میں سفید پوش سروں پر عمامہ باندھے نمودار ہوئی۔ مجاہدین نے کہا ہم بھی کان پھٹے ہیں۔ جب آمنا سامنا ہوا تو مجاہدین پر کابلی نما فوج نے بندوقوں کی ایک باڑ چڑھائی۔ پانچ سو بندوقوں کی باڑھ نے ان کے اوسان خطا کر دیئے۔ صدہا مجاہدین شہید ہوئے۔ بقایا فوج شہر میں آ گئی۔

زخمی مجاہدین کا صبر تحمل

دہلی میں مجاہدین کے آنے کی صورت یہ تھی کہ انکے ہمراہ زخمی بکثرت آ رہے تھے۔ ایک ایک زخمی کے ساتھ تین تین، چار چار سپاہی تھے۔ سڑک پر خون گرتا چلا جاتا تھا۔ تمام سڑک گلرنگ ہو گئی تھی اور خون کی افشاں ہوتی چلی آتی تھی۔ جیسے ہولی میں زمین پر رنگ گرتا ہے۔ دو سواروں کی یہ حالت تھی کہ ان کے سینہ پر گولیاں لگی ہوئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ اور پشت پر بمبا تے کھلے ہوئے تھے۔ ان کے کلیجے اور پھیپھڑے کے ٹکڑے اور خون کے لختے بہتے پڑے تھے۔ دائیں ہاتھ میں ان کے تمنچے اور بائیں ہاتھ میں گھوڑوں کی باگیں تھیں اور کسی طرح کا

---

[1] داستان غدر صفحہ ۹۱

جس میں جنگ میں شرکت
کے لیے اپیل کی گئی ہے۔

کرب اور بدحواسی ان کے بشرے سے ظاہر نہیں تھی ہوش و حواس قائم تھے۔ آپس میں باتیں کرتے چلے آتے تھے۔[1]

تلنگوں کو بدنام کرنیکا طریقہ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تاریخوں میں مجاہدین کو بدنام کرنے اور خاص طور پر تلنگوں کو لٹیرے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان لوگوں کو سوائے لوٹنے کے کوئی کام نہیں تھا۔ حالانکہ اس میں کوئی اصلیت نہیں تھی۔ انگریز اپنے مخبروں اور حامیوں کو تلنگوں کے بھیس میں شہر میں لوٹ مچانے کے لئے بھجواتے تھے۔ تاکہ تلنگے بدنام ہوں۔ اور عوام کو جو ان سے عقیدت ہے وہ ختم ہو جائے۔ چنانچہ دہلی اردو اخبار نے اپنے ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کے شمارہ میں اس سازش و شرارت کا انکشاف کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

- بہت لوگوں نے یہ افعال اختیار کئے ہیں کہ تلنگوں کی صورت بنا کے شہر کو لوٹنا اختیار کیا۔ اس طرح سے بندوقیں وغیرہ اسباب آلات بیگزین اور کوٹھیوں سے انگریزوں کے لوٹ کر اپنے تئیں تلنگوں کے بھیس میں ظاہر کر کے لوٹنا شروع کیا۔ چنانچہ پانچ آدمی بھی گرفتار ہوئے۔ انجام کو ظاہر ہوا کہ کوئی تو کہار ہے سمن صاحب کا اور ایک دھیر اور چمار ہے جو چھاؤنی میں مینڈھے بنا تا تھا اور ایک اور چمار کولی ڈھنے۔ انھوں نے بھی پلٹن کا سپاہی ہونا ظاہر کیا تھا اس پلٹن میں پہچانے گئے۔ جب جھوٹ اور فریب ظاہر ہوا

---

[1] داستان غدر ص۱۰۹

تو چوبدار اور سپاہیوں نے خوب جوتے مارے اور قید کیا۔

جہاد نامۂ ظفر

جب دہلی میں جنگ چھڑے ہوئے کافی ہفتے گذر گئے اور انگریزوں کے خلاف تمام ملک میں بغاوت کی آگ لگ گئی تب بہادر شاہ ظفر نے ہندوستان کے نوابوں راجاؤں کے نام ایک فرمان جس کو جہاد نامہ کہنا چاہیئے روانہ کیا۔ انگریزوں نے جہاں ۱۸۵۷ء کے جنگ آزادی کے حالات و تاریخ پر سخت پابندی لگا دی تھی کہ وہ کسی شکل میں شائع نہ ہوں وہاں مجاہدوں کے حب الوطنی سے بھرے ہوئے کارناموں اور تحریروں کو جن میں ان کی جراءت و اولوالعزمی بیباکی اور نڈرپن پایا جاتا تھا۔ اس کی اہمیت کو گھٹانے اور مسخ کرنے کی بھی کوشش کی اور ان کے اچھے کارناموں کو ان سے منسوب نہیں کیا۔ بلکہ کسی اور سے اس کا جوڑ لگایا۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر علیہ الرحمۃ کے اس جہاد نامہ کے ساتھ یہ شرارت کی گئی کہ ان سے منسوب نہیں کیا گیا ہے بلکہ لال قلعہ کے مقدمۂ بہادر شاہ کے فائل میں اس کو دہلی کے سپاہیوں کا جہاد نامہ بتایا گیا ہے اس کے برعکس رسالۂ بغاوت ہند اگست ۱۹۵۸ء میں اس جہاد نامہ کو فرمان شاہ دہلی، کے عنوان کے ساتھ شائع کیا ہے اور اس کے متعلق دبے لفظوں میں اس رائے کا اظہار کیا ہے۔

"جنہوں نے اس مکر و فریب اور دغابازی کی عبارت کو لکھا اور جن کے نام سے اعلان دیا سب کمال بےعزتی کے ساتھ خاک میں مل گئے"۔

حالانکہ اس جہاد نامہ کو مولوی سید قطب شاہ نے مطبع بہادری بریلی

میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں بہادر شاہ ظفر کے فرمان کے نام سے چھپوایا تھا جس کی تائید بہادر شاہ کے مقدمہ میں سرکاری وکیل بھی کرتا ہے کہ بہادر شاہ نے نوابوں اور مہاراجوں کو اپنا فرمان بھیجا تھا یا خط وکتابت کی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کا حقائق بھرا جہاد نامہ ملاحظہ ہو۔ جس کا ایک ایک لفظ سے انگریزوں کی شرارتوں، چالاکیوں کا پتہ چلتا ہے اور ہندوستانیوں کی جذبات کی ترجمانی بھی ہوتی ہے

"جمیع راجگان و ذی سار ہند پر واضح ولائح ہو کہ تم ہمہ جو نیکی اور نیک خصلتی اور فیاضی میں مشتہر الدہر و العوام ہو اور تمہارے جس حمایت طرز اور فہم و رعایت سے مذاہب ہندوستان کی اعانت ہے۔ لہذا از راہ خیراندیشی تمہاری تم کو ہدایت ہوتی ہے کہ خدائے تعالیٰ نے تم کو اپنے مختلف مذاہب کے قائم کرنے کے واسطے پیدا کیا ہے۔ اور تم پر فرض ہے کہ اپنے عقاید اور قوانین مذہبی کو بخوبی درست جانو اور ان پر ثابت قدم رہو۔ - - - - - - - -

- -

- -

کیونکہ خدائے تعالیٰ نے تم کو یہ مرتبہ عالی اور ملک اور دولت اور حکومت اس واسطے بخشی ہے کہ تم ان لوگوں کو جو تمہارے مذہب میں رخنہ اندازی کریں غارت کرو۔ اور جو اشخاص کہ تم میں سے صاحب طاقت ہیں ان کو ضرور ہے کہ وہ ان لوگوں کو جو تمہارے مذہب کو بگاڑنا چاہتے ہیں نیست و نابود کریں اور جو اتنی قدرت نہیں رکھتے وہ بدل وجان ایسی تدبیروں میں مشغول

رہیں جس سے انکے مذہب کے دشمنوں کی پامالی ہو۔ اور یہ تمہارے عقائد کی
کتابوں میں لکھا ہے کہ مذہب بدلنے سے مرجانا بہتر ہے۔ اور واقع میں یہ حکم
خداوند تعالیٰ کا بھی ہے جو خاص و عام پر روشن ہے۔ انگریز جملہ مذاہب کو
غارت کیا چاہتے ہیں اور ہندوستانیوں کے تخلل مذاہب کے واسطے انہوں
نے ایک مدت سے بہت سی کتابیں لکھوا کر اپنے پادریوں کے ہاتھ سے
سب ملک میں تقسیم کراتے ہیں۔ اور پادریوں کو بلوا کر اپنے معقولین کا اعلان
کیا ہے۔ سمجھنے کی بات ہے کہ انگریزوں نے کیا کیا تدبیریں واسطے تباہی
ہمارے مذاہب کی کی ہیں۔ اول یہ کہ جب ایک بیوہ مر جائے تو دوبارہ شادی
کرے۔ دوسرے یہ کہ ستی ہونے کی رسم مذہبی قدیم تھی۔ انگریزوں نے اپنے
قوانین کی رو سے موقوف کیا۔ تیسرے یہ کہ انھوں نے تمام خلقت کو علانیہ
سمجھایا کہ اگر وہ ان کا مذہب قبول کریں گے تو سرکار میں انکی توقیر ہوگی۔ اور
یہ بھی ہدایت کی کہ تم عیسائی کلیساؤں میں جاکر وعظ سنو۔ علاوہ اس کے
انھوں نے یہ حکم قطعی دیا ہے کہ صرف حقیقی اولاد راجگان و رئیسان ہند
کی مسند نشینی ہوگی۔ اور گود لی ہوئی اولاد کا کچھ حق نہ ہوگا۔ حالانکہ از روئے
شاستر اس طرح کے مختلف وارث فرمان سلطنت ہوسکتے ہیں۔ اس تدبیر
سے ان کا مطلب خاص یہ ہے کہ وہ آخر کو تمہاری ریاستیں اور جاگیر چھین
لیں۔ جیسا کہ انھوں نے فی زمانہ ریاست ہائے لکھنؤ اور ناگپور میں
عمل کیا۔ ورائے ازیں ایک اور تدبیر انھوں نے یہ بھی کی کہ قیدیان
جیل خانہ کو جبراً ایکی ہوئی روٹیوں کے کھانے کا حکم دیا۔ اکثر قیدیوں نے

یہ امر قبول نہ کیا۔ بھوک کے مر گئے۔ اور جنہوں نے لاچار ہو کر روٹی کھانا قبول کیا
اُنھوں نے اپنا ایمان کھویا۔ جب یہ تدبیر انگریزوں کی اچھی طرح نہ چلی تو انھوں
نے آٹے اور شکر میں ہڈیاں پسوا کر ملوائیں تاکہ لوگ ان کو بلا کسی ظن اور شبہ
کے کھا کے اپنا ایمان کھوئیں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے استخوان اور گوشت
کے چاولوں کے ساتھ ملوا کر سر بازار بکوایا۔ علاوہ اس کے انھوں نے ہر ایک تدبیر
ایسی کی جس سے ہمارے مذہب غارت ہوں۔ انجام کار بعض بنگالیوں نے
بعد لغور یہ امر قرار دیا کہ اگر ابتداً اہل فوج اس معاملہ مذہبی میں پیروی
انگریزوں کی ہو جائے، تو فرقہ بنگالیاں بھی انہیں کے مطابق کار بند ہوگا
انگریزوں نے اس تدبیر کو بہت پسند کیا۔ اور بے اندیشہ اس مثل کے کہ چاہ
کندہ را چاہ درپیش می آید۔ برہمنان اور افضل قوم کے لوگوں کو کارتوسوں
کے کاٹنے کا جن کے بنانے میں چربی لگی ہوئی تھی حکم دیا۔ اس حالت میں
اگرچہ مسلمان سپاہیوں نے خیال کیا کہ ان کارتوسوں کے کاٹنے سے مذہب
ہنود کا صرف جاتا رہیگا لیکن تاہم انھوں نے اس کے کاٹنے سے انکار کیا
تب ان سپاہیوں کو جنہوں نے کارتوس کاٹنے سے انکار کیا تھا انگریزوں
نے توپ سے اڑوا دیا۔ یہ ظلم دیکھ کر سپاہ نے انگریزوں کا قتل شروع کیا۔
اور جہاں کہیں فرنگی کو پایا مار ڈالا۔ اور بفضل ایزدی اور امداد سرکاری
بالفعل ان تدابیر میں مشغول ہیں۔ جن سے کہ چند انگریز جو کہیں کہیں باقی
رہ گئے ہیں وہ بھی نیست و نابود ہو جائیں۔ اور ہمارا یقین واثق ہے کہ اگر
انگریز ملک ہندوستان میں رہیں گے تو کل اس ملک کے آدمیوں کو مار ڈالیں گے۔

اور ہمارے مذہبوں کو مٹا دیں گے۔ ہر چند بعض آدمی ہمارے ملک کے اب
بھی انگریزوں سے موافقت رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کی طرف سے لڑتے بھڑتے
ہیں۔ ان کے حال پر بخوبی غور کیا گیا۔ تو یہی ظاہر ہوا ہے کہ انگریز نہ ان کا
مذہب چھوڑیں گے۔ اور نہ تم سب کا۔ پس اس صورت میں ہم تم سے
پوچھتے ہیں کہ تم نے اپنے ایمان اور جان کی سلامتی سے انگریزوں کی غارت
کر کے اپنے ملک اور ایمان کو بچا سکتے ہو؟ چونکہ تم سب ہندو اور مسلمان کی
بھلائی پیش نظر ہے اور انگریز تو دونوں فرقوں کا دشمن ہے۔ لہذا صرف تمہارے
مذہب کی حمایت کے پاس اور خیال کر کے بنظر اطلاع اعدائے دین بذریعہ اس فرمان
مطبوعہ کے اعلان کیا جاتا ہے کہ اہل ہنود کو گنگا جی اور تلسی اور سالگ رام کی
قسم ہے اور مسلمانوں کو قرآن مجید کی قسم ہے کہ وہ بالاتفاق شامل ہو کر اپنی
جان اور ایمان کی حفاظت کے واسطے انگریزوں کا قتل اپنے ذمے فرض سمجھیں
اور چونکہ گائے کے ذبح کرنے میں ہندو کے مذہب کی اہانت ہے بدیں نظر
رؤسا اہل اسلام نے یہ عہد و پیمان کیا ہے کہ اگر اہل ہنود قتل عیسائیان
میں گرمجوشی اور مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوں گے تو اسی روز سے گائے
اور بیل کا ذبح ہونا موقوف ہو جائیگا۔ اور بعد اس کے کوئی مسلمان خلاف
اس عہد کے کاربند ہو تو وہ پیرو قرآن نہ سمجھا جائیگا۔ اور جو مسلمان گائے
کا گوشت کھائیگا وہ اس کے لئے سور کے گوشت کے برابر ہوگا۔ اور
اگر اہل ہنود قتل عیسائیان اور فرنگیان میں کمربستہ اور آمادہ نہ ہوں گے
تو وہ خدا کی نظر میں اتنے ہی گنہگار ہوں گے جیسا انھوں نے گائے کو

ذبح کیا یا اسکا گوشت کھایا۔ شاید اہل فرنگ بھی اپنے مطلب براری کے واسطے ہندوؤں
سے بحلف ایسا ہی اقرار کرائیں گے۔ اور کوئی عقلمند اس دام فریب میں نہ آئیگا۔
کیونکہ اقرار اہل فرنگ ہمیشہ علیٰ فریب ہوتے ہیں۔ اور جہاں ایک مرتبہ ان کا مطلب
نکل آیا پھر نہ فوراً اپنے عہد پیماں کو بالائے طاق رکھدیتے ہیں۔ اور ہر غریب
امیر پر روشن اور ہویدا ہے کہ فریب انگریزوں کی عادت جبلی ہے اور ہمیشہ دغابازی
ان کا شعار ہے۔ اسی واسطے انگریزوں کے کہنے پر کبھی یقین نہ لاؤ۔ اور یقین
واثق جانو کہ کبھی ایسا موقع جو بالفعل موجود ہے کبھی ہاتھ نہ آئیگا"

دہرازیہ ا۔ جون کو مجاہدین نے ہلکی توپیں اور کچھ سوار لے کر اجمیری دروازہ پر آئے
چھ بجے کے قریب مجاہدین کا مقابلہ انگریزی سپاہی گورکھوں سے ہوا۔ مجاہدوں
کو امید تھی کہ گورکھے اپنے ہم وطن ہیں ہم سے مل جائیں گے۔ چنانچہ جب یہ ان کے
قریب آئے تو انھوں نے گورکھوں سے کہا کہ تم ہم سے آکر ملجاؤ۔ ہم تم پر
گولیاں نہیں چلائیں گے۔ گورکھے بھی آمادہ ہوگئے کہ ہم تم سے ملنے آتے ہیں
جب گورکھے تیس قدم کے فاصلے پر پہنچے تو انھوں نے مجاہدین پر حملہ کر دیا۔
گولیاں ماریں بیس تیس شہید ہوئے۔ گورکھے مارتے ہوئے آگے بڑھے، تو
ان پر اجمیری دروازے کی توپوں کے گولے پڑنے لگے۔

مجاہدین کی بہادری اور فوجی طاقت

مجاہدین پسپا ہو رہے تھے لیکن حملہ کرنے سے باز نہیں
آتے تھے۔ ہارنے کے بعد بھی ان کے حوصلے بڑھ جاتے تھے جس کی وجہ سے بقول
منشی ذکاءاللہ انگریزوں کو صاف ظاہر ہونے لگا تھا کہ۔

"شہر کے محصور کرنے کا کافی سامان اُن کے پاس نہیں ہے
دریا کے جنوب کی طرف باغیوں کو اختیار تھا جہاں چاہیں
آمد و رفت رکھیں۔ ان چند دنوں کے اندر ثابت ہو گیا تھا
کہ توپوں کی لڑائی میں باغیوں کا پلڑا بھاری تھا۔ ان کے
پاس توپوں کے چلانے کا سامان افراط سے تھا۔ انگریزی
سپاہ بیچ میں دستے دے دیکر اپنی توپوں سے توپوں کا
جواب دیتی تھی۔ بھاری توپوں کا میگزین ان کے پاس تھا
باغی جو گولے ان پر مارتے تھے ان کو چُنکر وہ پھر اُلٹے باغیوں
پر چلاتے تھے" (۵۸۲)

انگریزوں کے پاس سامان رسد کی کمی کی وجہ سے ۱۶۔ جون کو کونسل آف وار کا دوسرا اجلاس ہوا جس میں بریگیڈ بیر ونس نے اکدم شہر پر حملہ کرنے کے متعلق یہ رائے دی۔

"باغیوں نے ہمیشہ اپنے مشتعل حملوں سے ہمکو دکھا دیا ہے کہ وہ فصیل کی آڑ میں اچھی لڑائی لڑتے ہیں۔ ایسے ہی وہ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں ہم سے لڑیں گے، جہاں ہر ایک سپاہی ہمارے یورپین سپاہی کے برابر ہوگا۔ انہوں نے جو شہر کی فصیل پر تمیس چالیس بھاری توپیں چڑھا رکھی ہیں۔ ان سے دروازہ تک جانے میں ہمارا بھاری نقصان ہوگا۔ میں حملہ کرنے کے لئے جب ووٹ دوں گا۔ سپاہ کی پہلی کمک آجائے گی"۔

دہلی میں بریلی کی فوج کی آمد | جس طرح انگریزوں کو فکر تھی کہ بھاری فوجی

طاقت بڑھے اور جلد دشمنوں کو پسپا کردیں۔ اسی طرح ہندوستانی عوام چاہتے تھے کہ دہلی کے بادشاہ کی فوجی طاقت میں اضافہ ہوتا کہ عیسائیوں کی غلامی ختم ہو۔ چنانچہ یکم جولائی ۱۸۵۷ء کو بادشاہ کے پاس بریلی سے فوجی امداد آئی۔ جس میں تین ہزار سپاہی اور چھ ضرب توپیں تھیں۔ اور چھ لاکھ روپیہ نقد تھا۔ اس کیمپ میں اٹھارویں اور اٹھائیسویں پلٹن پیادگان ہندوستانی معہ رسالہ سواران بے قاعدہ اور انتیسویں پلٹن متعینہ مراد آباد ان کے ساتھ شامل تھی[1]۔ اس کا سالار بخت خاں تھا جو ایک پرانا تجربہ کار، صوبیدار توپخانہ تھا۔

اب مجاہدین کے پاس ۳۔ جولائی کو تیس ہزار سپاہ اور کافی توپیں ہو گئی تھیں اور میگزین اسقدر تھا کہ وہ کبھی خالی ہونا جانتا ہی نہ تھا۔

مجاہدین کی توجیہ کی دانائی

پنجاب سے انگریزوں کے پاس بھی کمک آ گئی تھی۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ یکایک انگریزی سپاہ باغیوں پر ایسی آنکر لوٹ پڑے کہ وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔ مگر ان کو معلوم تھا کہ مجاہدین تمام باتوں کی خبر رکھتے تھے ان کے سپاہی راتوں کو گشت کرتے تھے۔ اور اپنے پیکٹ بٹھلائے رکھتے تھے۔ وہ صرف شہر میں مقید نہیں تھے[2]۔

جتنے دن گزرتے جاتے تھے۔ اسی قدر انگریزوں کو شاق گذرتا تھا۔ کہ دہلی فتح کیوں نہیں ہوتی۔ ۱۵ جون کو وار کونسل کی میٹنگ ہو چکی تھی۔

---

[1] رسالہ تاریخ بغاوت ہند اگست ۱۸۵۹ء [2] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ۵۹۵۔

۲۔ جولائی کو پھر جائزہ لیا جانے لگا۔ تو اس وقت بھی مجاہدین کی توپوں کی مار اور بے مثل قربانی ان کو پریشان کر دیتی تھی جبکہ وہ روزانہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھتے تھے کہ۔

"دشمنوں کے بہت زیادہ آدمی مارے جاتے ہیں تو دشمنوں کے پاس ان کے بدلے میں اور زیادہ آدمی آجاتے ہیں۔ ان کے پاس لڑنے والے آدمیوں کی کبھی کمی نہیں ہوئی۔ انگریزوں نے دہلی کی تسخیر میں کچھ ترقی نہیں کی۔ ہر روز یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ باغیوں کے پاس توپیں بہ نسبت انگریزوں کے تعدادمیں زیادہ ہیں۔ انگریز باغیوں کی توپوں کو بند نہیں کر سکتے تھے باغیوں کے پاس وہ سامان تھا کہ ہر روز اور ہر گھنٹے میں جتنے گولے چاہتے چلاتے۔ پہاڑی پر دہلی دروازہ کی توپیں انگریزی لشکر کو بڑا ہلاک و حیران اور پریشان کرتی تھیں۔ باغیوں کے توپچی ظرافت و مسرت کے ساتھ انگریزی لشکر کے سارے کاموں کو دیکھتے تھے۔"

مجاہدین کی انگریزی فوج میں بغاوت پھیلانا

جبکہ انگریز ہندوستانیوں پر روپے اور طاقت کے زور پر اثر انداز ہو رہے تھے اور مخبروں کی معرفت ہندوستانی فوجوں میں سپاہیوں کو ورغلاتے تھے۔ اسی طرح مجاہدین بھی انگریزی فوج میں بغاوت کا صور پھونکنے جاتے تھے اور ان کو بہکاتے تھے۔ اور اپنا ہمنوا بنا کر ان سے خبریں بھی حاصل کرتے تھے۔

چنانچہ ۲۔ جولائی ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔ کہ انگریزوں کو ایک سکھ کی وساطت

سے یہ معلوم ہوا کہ ایک پنجابی پلٹن میں ایک کمپنی پوربیوں کی ہے۔ جس کے تمام آدمی باغیان دہلی سے ملے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی پلٹن کے سکھوں کو سمجھایا کہ "خدا کی مرضی یہ ہے کہ حکومت انگلشیہ ہندوستان سے اُٹھ جائے اور خاندان مغلیہ کا دوبارہ عروج ہو۔ تمکو چاہیئے کہ انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دو۔ جس کو خدا سلطنت دیا چاہتا ہے اسی کے ساتھ ہو جاؤ" یہ سُنکر ایک سکھ اپنے افسر کے خیمے میں گھس گیا۔ اس کو گفتگو سے مطلع کیا۔ وہ فوراً گرفتار ہوئے۔ اور تینوں اشخاص بغاوت کے جرم میں مغرب سے قبل پھانسی پر چڑھا دیے گئے[1]۔

مجاہدین کی خود اعتمادی سے انگریزوں میں پریشانی

۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل ریڈ نے دہلی کی میدان جنگ کی سپہ سالاری سے استعفیٰ دیدیا تھا۔ ان کی جگہ بریگیڈیر ولسن سپہ سالار مقرر ہوئے۔ ان کے عہد میں بھی یہ بات مان لی گئی تھی کہ انگریز دہلی میں محاصرین نہیں بلکہ محصورین ہیں۔ اور وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ کبتک مجاہدین پریشان کرنے والے حملے انگریزوں پر کرتے رہیں گے انگریزی لشکر دشمنوں کو مارتے مارتے تھک گیا تھا۔ مگر ان کے مخزن کمزور نہیں ہوتے تھے اور ان کے اعتقاد و اعتبار میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی تو انگریزوں کی سپاہ بڑی حیران تھی کہ اس کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ اور مسلسل دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے باوجود نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا تھا۔

---

[1] رسالہ بغاوت ہند اگست ۱۸۵۹ء

دہلی سے محاصرہ اٹھانے کی تجویز

ہارے: گریٹ ہیڈ جو دہلی میں سب سے بڑے افسر تھے اور پہلے دہلی پر حملہ کرنے کے بڑے حامی تھے۔ انھوں نے ۴ جولائی کو اپنے افسران کو لکھا "دہلی پر حملہ کرنے کے لئے دو دفعہ تیاریاں کی گئیں۔ اب مجھے یقین نہیں ہے کہ پھر یہ ارادہ پورا ہوگا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم اپنی جگہ پر جمے رہیں یا محاصرہ کو اٹھالیں۔ اس فوج سے ملک کو اسی صورت میں فائدہ ہو سکتا ہے کہ جو فوج دہلی کی فصیلوں میں مقید پڑی ہوئی ہے اور اپنی طاقت اس کی حفاظت میں ضائع کر رہی ہے۔ وہ آزاد ہو اور ان مقامات کو فتح کرنے کے لئے بھیجی جائے۔ جہاں انگریز مصیبتوں میں مبتلا ہیں"۔

فتویٰ جہاد

جنرل بخت خاں نے مسلمانوں میں مزید روح پھونکنے کیلئے دہلی کی جامع مسجد میں۔ دہلی کے مشہور با اثر علماء کو جمع کیا اور مشورہ کرنے کے بعد ان سے ایک جہاد کی فتویٰ مرتب کرایا۔ اور اس پر ان کے دستخط ہوئے۔ اس کی اشاعت ہندوستان بھر میں ہوئی۔ وہ فتویٰ ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کے صادق الاخبار دہلی میں شائع ہوا تھا۔ جس کی نقل پیش کی جاتی ہے۔

" کیا فرماتے ہیں علماء دین اس امر میں کہ اب انگریز دلی پر چڑھ کر آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں۔ اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں۔ اور وہ لوگ جو اور شہر اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی

جہاد جاہیئے یا نہیں بیان کرو۔ اللہ جزا دے۔

درصورت مرقومہ یہ فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے۔ بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات وحرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک ہا اور اطراف وحوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جاویں مقابلے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائیگا۔ اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوگا۔ اور جو عدو بستیوں پر ہجوم اور قتل وغارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر فرض ہو جائیگا۔ بشرطیکہ ان کی طاقت ہے۔ بستخط ومواہیر

رحمتہ اللہ۔ سید محمد نذیر حسین۔ نور جمال۔ عبدالکریم۔ سکندر علی۔
مفتی صدر الدین۔ مفتی اکرام الدین۔ محمد ضیاء الدین۔ احمد سعید
محمد عنبر خان، محمد کریم اللہ۔ سید شاہ نقشبندی۔ عبد القادر۔ مولوی
عبدالغنی۔ محمد علی، سرفراز علی سید محبوب علی جعفری۔
محمد حامی الدین۔ مولوی سعید الدین۔ فرید الدین، سید احمد، الہی بخش
محمد انصار علی حفیظ اللہ خان، نور الحق، محمد رحمت علی خان عدالت
العالیہ۔ محمد علی حسین قاضی القضات سیف الرحمٰن۔ محمد ہاشم۔ سید
عبدالحمید۔ سید محمد۔

پنڈتوں کی پیترے بازی	دہلی کے پنڈت بھی مسلمانوں سے کم نہیں تھے

ان کو بھی انگریزوں سے نفرت اور دشمنی تھی۔ کئی دفعہ وہ بھی پنڈتوں سے حساب لگا کر لڑنے کی شبھ مہورت نکال کے ملنگوں کو بتلاتے تھے۔ اور ان کو یقین دلاتے تھے کہ اگر لڑنے جاؤ گے تو فتح پاؤ گے۔ پنڈتوں نے ملنگوں کو یقین دلایا تھا۔ کہ انگریزی حکومت پھر دوبارہ قائم نہیں ہوگی۔ ان ہی کا راج ہوگا۔ ان ایام میں ایک عجیب تماشا چاندنی چوک اور دوسرے بازاروں میں دیکھنے میں آتا تھا کہ پنڈتوں کے ہاتھوں میں پوتھیاں ہوتی تھیں اور وہ ہندوؤں کو دھرم شاستر کے حکم سناتے تھے کہ انگریز ملیچھوں سے لڑنا چاہیے۔ جب چارپائیوں پر ملنگوں کی لاشیں ان کے سامنے آتیں تو وہ ہندوؤں کو اپدیش دیتے کہ ان سرگ باشیوں کی طرح سرگ میں چلے جاؤ۔ جن کے لئے نہ ارتھی کی ضرورت ہے نہ کریا کرم کی[1]

ہندوستانی ویسے ہی انگریزوں کے خلاف تھے۔ ان فتووں اور پنڈتوں کے دھرم شاستروں کے حکموں نے ہندو اور مسلمانوں کے دل اور دماغ میں انگریزوں کے خلاف اور آگ لگا دی تھی۔

جس کا نظاہرہ یکم اگست ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ اس دن بقرعید اور ہندوؤں کی دوج بھی تھی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں نے ملکر بادشاہ کی فتح کی دعائیں مانگیں اور انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ بہادری کے جوہر دکھلائے۔ بہادر شاہ نے بخت خاں کو یہ قطعہ روانہ کیا تھا[2]

لشکر اعدا الٰہی آج سارا قتل ہو گورگہ گو جبر سے لیکر تا نصاری قتل ہو

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ص۷۰ [2] رسالہ تاریخ بغاوت ہند ستمبر ۱۹۵۷ء

آج کا دن عید قرباں کا جیسے پا میں گے ہم　　اے ظفر تہ تیغ گر دشمن ہمارا قتل ہو

اس رندِ بے مثل جنگ ہوئی لیکن نتیجہ وہی نکلا جو نکلتا آرہا تھا۔

بہادر شاہ کا انگریزوں سے صلح کرنے سے انکار

مولویوں کے فتووں اور پنڈتوں کے پتروں کے صاف اندیشہ مہورتوں کے بتانے سے ہندوستانیوں میں انگریزوں کے خلاف جوش بڑھنے لگا۔ عوام بے تابوا و بے آپے ہو گئے تھے۔ اس عالت کو انگریزوں نے اپنے لئے خطرناک سمجھا۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کو مولوی رجب علی جو مخبروں کا سرغنہ تھا اس نے اپنے نام سے گورنر کی ایما پر حکیم احسن اللہ خاں کی معرفت جنگ بند کرنے کے لئے ۳۰۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو حسب ذیل خط لکھا۔ جس پر بہادر شاہ ظفر نے بقول ایڈیٹر رسالہ تاریخ بغاوت ہند اگرہ کوئی توجہ نہیں دی۔ صاف انکار کر دیا۔ خط کا مضمون بغور پڑھئے۔

نصیحتے کنمت بشنو و بہانہ مگیر　　ہر آنچہ ناصح دلسوز گویدت بپذیر

حکیم صاحب فلاطون فطنت ارسطو حکمت یکتائے زماں دانائے دوراں سلامت۔ رسوم عرفیہ برطرف، حرف مطلب اینکہ از عرصہ دو ماہ کم و بیش کہ سپاہ نمک خور سرکار گردوں وقار انگریزی از نا عاقبت اندیشی بمقام دہلی رسیدہ گرد فتنہ و فساد بلند کردہ نام حضرت جہاں پناہ بادشاہ را بدنام ساختہ قدم از اندازہ خود بیروں نہادہ خود را بمقابل دولت قہرمان عنت انگلشیہ قرار دیدہ ہند بعینہ مطابق شعر عارف روم است، شعر

آں مگس بر برگ کاہ و بول خر　　ہمچو کشتیباں ہمے افراشت سر

بر ضمیر منیر شاهی و اشفق و عقلائے هفت کشور عظمت ناقتدار سرکار انگلشی
معلوم و عالمیان کہ درس چون آفتاب نیم روز ظاهر است که از پیشگاه ملکهٔ
انگلستان خلد الله ملکها و سلطانها اعانت سلطان عبد المجید خان،
بادشاه روم و صرف زر خطیر از ابیض و احمر و ماموری افواج ظفر امواج
در بحر و بر محفوظ داشتن، سلطنت اسلامیه و پسند کردن نقصان خود و
حفظ حقوق رومیه با وجود استحالهٔ دولت باروسیان چقدر سعی جمیل و
کوشش جلیل بظهور آمده گاهے از ابتدائے تسلط بر کشور هند بتعلیم و تلقین
علمائے از اهل اسلام و هنود بالاجبار برائے اختیار مذهب مسیحی نبوده بلکه
خلائق بهره و شیکه و ماموریات دنیا و آخرت خواسته آزادانه زیست کرده
و می کنند باقی تفاصیل محول رائے صائب که تطویل غیر مقصود است حال
ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاه که به از و تنهائے شاهی کشور هند بر تند
کسی را است نیامده از تاریخ فرشته واضح است که در عهد قوت و شوکت
بادشاه ممدوح در هندوستان جهازات شاهی که از بندر ها و حجاز براه دریا
شده بودند دست خوش دولت انگریزی شده بار بید خل که سرکار انگریزی
را در هند بود استرداد احمال و اثقال جهازات شاه هجاه کردن توانست
حالا که عرصه هند از دریائے شور تا پشور پامال ملازمان دولت انگلشیه است
چگونه کسے بایں حکمائے عصر و شجاعان دهر مقابل کردن می تواند اگر تراجع و
تاخیر بالفعل کیفر کردار ناآگاهان عاقبت کار بوقوع آمد بزعم عوام
نمی تواند شد بلکه امتحان دوست و دشمن و تفرقه دانا و نادان بغیر و

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا عینی اخبار صادق الاخبار دہلی مورخہ
بمورخہ ۲۲ مئی ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی خبریں چھپی ہوئی ہیں

مصالح ملکی پیش نظر است و تمادتیکہ گروہ مفسد قدم انداز دہلی نشدہ بود از جانب
ملازمان شاہی ہیچ امرے خلاف رضائے اعالیان سلطنت انگریزی بظہور
نرسیدہ حالا چہ انقلاب بروئے کار آمدہ کہ دام امید و علت داکہ این
سوئے اختیار بودہ تمامہ ز اذان ما راسخ الاعتقاد باوجود تحلئے الجلیہ
عقل و دانش بنا التعلقے چراد و پئے اطفلئے نور این سراج ہند شدند و بچہ
سبب مد نفع عاجل اجل این نزغ و زمان چغتائی صرف اوقات نمی
نمایند اینچہ خیال محال بدملغ اعالیان سرکار شاہی پیچیدہ و اگر این امر
نیست تا امروز چرا شحے دریں باب نرسیدہ و کوششے در دفع این
مفسدہ نشدہ صلاح کار اب اگر در آرائے ارباب دربار شاہی مستحسن
متصور شود امنیت کہ مخطورات و مکنونات خاطر را اصالتاً یا وکالتاً تحریراً
و تقریراً بحضرت صاحبان والا و زبان گذارش فرمایند کہ بعد برہمی اساس
این نسخہ این وقت بدست نخواہد آمد و بجز تاسف یادگارے بر صفحہ
روزگار نخواہد ماند الکنایۃ ابلغ من التصریح و دست را از تعلقہ انتظار
جواب تصور فرمایند و ہر چہ ارقام خواہند فرمود حرف بحرف بملاحظہ صاحبان
عالیشان خواہد گذشت فقط قلم شکستم و مضمون مختصر کردم کہ نیست
طرز من این گفتگوئے طولانی فقط۔

مجاہدین نے انگریزوں کو مار بھگایا

نو ذی الحجہ کو شاہی فوجوں نے انگریزوں سے دن میں
باڑہ پر خوب مقابلہ اور مقاتلہ کیا۔ دیر تک کشت و خون ہوتا رہا۔ اِن کے

بعد بارش ہو گئی۔ گورے بُری طرح بھاگے اور لڑائی میں کافی کام آئے۔

گیارہویں شب کو نیمچہ کے کیمپ نے دشمن سے لڑنے کے لئے کوچ کیا۔ پُل پر ۵ سو گوروں کا پکٹ دو توپوں کے ساتھ پھرتا ہوا نظر آیا۔ شاہی فوج نے ان پر فیر کئے اور یکدم حملہ کر کے انکو گھیر لیا۔ تلوار خوب چلی اور بہادران نیمچہ نے سب گوروں کو قتل کر دیا۔ اور دونوں توپیں ان کی چھین لیں۔ اور ساری رات وہیں ڈیرے جمائے پڑے رہے۔ اگلے دن پھر لڑنے کے لئے گئے۔ اور یکبارگی دھاوا کر کے پہاڑی پر چڑھ گئے۔ دشمنوں کو جو سامنے آیا ہلاک کیا۔ اور مال و اسباب کرسی میزیں اور شراب لوٹ لی۔ اور کچھ سواروں نے سرائے محبوب علی خاں پہنچکر انگریزوں کو ہلاک کیا۔[1]

بہادر شاہ کی امداد غیبی کے لئے دعا

بہادر شاہ کو سولہویں ذی الحجہ (مطابق ۵۔ اگست ۱۸۵۷ء) کو یہ خبر پہنچی کہ میگزین واقعہ محلہ چوڑی والان ناگہانی آگ لگ گئی۔ مرد اور عورتیں جو مزدوری کر رہی تھیں کباب کی طرح سوختہ ہو گئیں۔ اور مکان گر پڑا جب یہ واقعہ تلنگوں نے سُنا تو آگ لگ جانے کا الزام حکیم احسن اللہ خاں پر لگایا۔ ان کا مکان لوٹ لیا۔ بادشاہ کو ابھی تک حکیم احسن اللہ پر اعتماد تھا۔ بہت پریشان ہوئے اور اپنی پناہ میں لینے کا حکم دیا اور منادی کرائی کہ حکیم صاحب کا اسباب جس کے پاس ہے وہ حاضر کرے ورنہ سزا دی جائے گی۔ انکے

---

[1] صادق الاخبار دہلی ۱۲۔ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ

بعد خداوند رحیم و کریم سے دعا کی اور یہ رباعی ارشاد فرمائی[1]

دشمن از ہر طرف ہجوم آورد | یا علیؓ ولی برائے خدا
فوج غیبی پئے مدد بفرست | از تو خواہد ہمیں ظفر بدعا

مجاہدین کی انگریزی توپچیوں سے ساز باز

دہلی میں انگریزوں نے باقیماندہ اسلحات وبارود بھیجنے والوں سے...

بعد میں سازش کی گئی پہلے ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء کو مجاہدین نے انگریزی فوج کے ہندوستانی توپچیوں سے سازش کی جس کی وجہ سے بارود کے بجائے توپ میں شیشے کوٹ کر بھر دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ مکند لال نے اپنی کتاب بغاوت ہند میں اس سازش کا ذکر کیا ہے۔

"اتوار کے روز سولہویں اگست ۱۸۵۷ء کو خاص لشکر انگریزی میں ایک اور سازش پکڑی گئی۔ اس سے پہلے معلوم ہوا تھا کہ بعض اوقات تو ہماری توپوں کا گولہ نشانہ سے دور جاکے پڑتا تھا۔ اور بعض اوقات راستہ ہی میں رہ جاتا تھا۔ بعض اوقات دیر ہونے سے پہلے ایک ایک توپ سات سات مرتبہ رنجک چاٹ جاتی تھی۔ انگریزی افسران حیران تھے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ آخر ایک روز معلوم ہوا کہ ہندوستانی توپچی مجاہدین کی فوج سے ملے ہوئے ہیں۔ اور توپ اس طرح چھوڑتے ہیں کہ مجاہدین کا نقصان نہ ہو اور خاص موقع پر بارود کے بجائے شیشہ کوٹ کے توپ میں بھر دیتے ہیں۔ تاکہ صرف شعلہ اٹھے۔ اور دشمنوں کو واپس جانے کے لئے وقت ملے۔ بعض مرتبہ

---

[1] صادق الاخبار دہلی ۱۷ اگست ۱۸۵۷ء

ایسا بھی ہوا کہ مسلسل توپ چھوڑنے کی ضرورت ہوتی تھی لیکن اس وقت گولہ چھوڑنے میں دیر لگائی جاتی تھی ۔ وہ توپچی اس جرم میں پکڑے گئے عدالت میں پیش ہوئے۔ فوراً گلے میں رسی ڈال کر لٹکا دیئے گئے۔ اسی حالت میں جاں بحق ہوئے۔[1]

بہادر شاہ کا دوسرا جہاد نامہ

جنگ میں دشمن کے خلاف عوام کے جذبات کو قائم رکھنا نفرت کے خیالات پیدا کرنا ان کی ذلیل اور تباہ کن حرکتوں کو بار بار دہرانا اور نئے نئے ڈھنگ سے دوہرانا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ عوام کے جذبات کو ابھارنے کے لئے ۲۵ اگست ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر نے یہ شاہی فرمان یا دوسرا جہاد نامہ جاری کیا تھا۔ یہ اعلان دہلی گزٹ ۱۸۵۷ء اور فرینڈ آف انڈیا سیرامپور اکتوبر ۱۸۵۷ء میں بعنوان "دلی کا عہد سعادت" نقل کیا گیا۔ یہ شاہی فرمان بڑا طویل ہے جس میں باغیوں کے نصب العین و پروگرام فرمان کی چند اہم باتیں درج ہیں۔ اس فرمان کا اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"چند ہندو اور مسلمان سرداروں نے جنھوں نے اپنے مذہب کی حفاظت کیلئے بہت پہلے اپنے گھروں کو خیرباد کہہ دیا ہے اور جو ہندوستانی انگریزوں کی بیخ کنی کرنے کے لئے پوری کوشش کر رہے ہیں مابدولت کے روبرو حاضر ہوئے انھوں نے موجودہ ہندوستانی جہاد میں حصہ لیا ہے اور اس امر کا غالب امکان ہے کہ مابدولت کو عنقریب مغرب کی جانب سے فوجی کمک ملے۔ لہٰذا اطلاع عام کے لئے موجودہ اشتہار جو متعدد دفعات پر مشتمل ہے جاری کیا جاتا ہے

۱؎ رسالہ تاریخ بغاوت ہند کا گزٹ ۱۸۵۷ء

ہر شخص کا اولین فرض ہے کہ وہ اس اشتہار کو پورے طور پر ملحوظ رکھے اور اسکی تعمیل کرے۔ ذریعہ معاش سے محروم اشخاص کو اس مشترکہ جدوجہد میں یک ہونا چاہیئے۔ مابدولت کی طرف سے گذارہ عطا ہوگا"۔

"نیز ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کی قدیم تصنیف معجز نگاروں کی تحریروں، جوتشیوں، پنڈتوں، رمالوں کے حسابات سب ہی اس بات پر متفق ہیں کہ انگریزوں کا اقتدار ہندوستان یا کسی اور ملک میں زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہیگا۔ اس لئے ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ برطانوی دور حکومت کے مزید قیام کی امید ترک کردیں اور مابدولت کا ساتھ دیں۔ اور مشترکہ مفاد کے فروغ کے لئے اپنی انفرادی کوششوں کی بدولت بادشاہی حکومت کے التفات کے مستحق بنیں اور اس طور پر اپنے مقاصد کی تکمیل کریں۔ ورنہ اگر یہ سنہری موقع ہاتھ سے نکل گیا تو ان کو اپنی غلطی پر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ ایک شاعر نے کتنی برجستہ بات کہی ہے جس کا مفہوم مندرجہ ذیل ہے۔

"کسی سنہری موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے کیونکہ مقصد کے حصول میں آپ کو گردش تقدیر سے دوچار ہونا پڑے گا لیکن اگر آپ نے خود موقع سے فائدہ نہ اٹھایا جو از خود آپ کی زندگی میں ہے تو آپ کو کف افسوس ملنا پڑے گا"۔

کسی فرد کو بھی برطانوی حکومت کے خیر خواہوں کی غلط بیانی کے باعث ان معمولی پریشانیوں سے جو عام طور پر انقلابات کا لازمی جزو ہوتی ہیں نتیجہ اخذ

نہ کرنا چاہیئے کہ بادشاہی حکومت کے مستقل قیام کے بعد پریشانیاں برقرار رہیں گی۔ اور ایسے اشخاص کہ جن سے کسی سپاہی یا لوٹ مار کرنے والوں نے بُرا سلوک کیا ہو، ا بدولت کے حضور سے دادرسی کے لئے اپنی شکایت پیش کرنی چاہیئں۔ بادشاہی حکومت کے مستقل قیام کے بعد شاہی خزانہ سے ان کی تمام جائیداد کے نقصان کی تلافی کی جائے گی۔ جو موجودہ افرا تفری میں ہوئے ہیں۔

دفعہ ۲ زمینداروں سے متعلق یہ بات صاف ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت نے زمینداری ختم کرنے کے لئے بے اندازہ ٹیکس عائد کیا ہے اور بہت سے زمینداروں کو ان کی جائیداد بقایا حصول کے لئے نیلام کرا کے اس حد تک بے عزت کر دیا ہے کہ کسی عام رعیت یا غلام کی جانب سے دعویٰ دائر ہونے پر معزز زمینداروں کو عدالت میں طلب کیا جاتا ہے اور انہیں گرفتار کر کے قید خانہ میں بند کر دیا جاتا ہے زمینداروں سے متعلق مقدمات میں اسٹامپ کی بہت زیادہ قیمت اور دیوانی عدالتوں کے غیر ضروری اخراجات اور مقدمات کو سالہا سال التوا میں رکھنا، ان سب کا مقصد مقدمہ بازوں کو مفلس بنانا ہے۔ علاوہ ازیں زمینداروں پر مدارس، شفاخانوں اور گذرگاہوں وغیرہ کے لئے بے اندازہ ٹیکس عاید کئے ہے۔ بادشاہی حکومت میں اس قسم کا استحصال ز نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کے برعکس جمع ٹیکس بہت نرم ہوں گے اور زمیندار اپنی زمینداری میں خود مختار رہو گا۔ زمینداری سے متعلق

کل تنازعات تصفیہ شرعی اور شاستر کی رو سے بلا خرچ اور سرسری طور پر ہو گا۔ اور جو زمیندار موجودہ جنگ میں اپنے ساتھیوں اور روپے سے اعانت کریں گے ان کی نصف مالگذاری اور جو زمیندار صرف مالی امداد دیں گے ان کی ایک چوتھائی مالگذاری ہمیشہ کے لئے معاف کر دی جائے گی۔ اس جنگ میں شرکت کرنے پر ایسے زمینداروں کو جو برطانوی ہند حکومت میں اپنی جائداد سے محروم کر دئے گئے ہیں انکی زمینداری واپس کر دیجائیگی

دفعہ ۲ تاجروں سے متعلق یہ امر ظاہر ہے کہ کافر اور فریب کار برطانوی حکومت نے تمام نفیس اور بیش قیمت شلاً نیل، پارچہ جات، دیگر اشیا برآمد کی تجارت پر اجارہ داری قائم کر لی ہے اور محض چھوٹی موٹی چیزوں کی تجارت دوسرے لوگوں کے لئے چھوڑ دی ہے اور اس میں بھی وہ نفع کے حصہ دار ہیں جو وہ محصول اور مقدمات پر اسٹامپ فیس وغیرہ کی شکل میں وصول کرتے ہیں۔ تاکہ عوام محض برائے نام تجارت کر سکیں۔ علاوہ ازیں تاجروں کے نفع پر ڈاک محصول چنگی مدارس کے لئے چندے وغیرہ کے ٹیکس عائد کئے جاتے ہیں۔

ان تمام مراعات سے قطع نظر تجار کو کسی معمولی شخص کی ایماء پر قید اور ذلیل و خوار کیا جاتا ہے۔ بادشاہی حکومت کے قیام کے ساتھ جملہ مذکورہ فریب آمیز طریقے ختم کر دئیے جائیں گے اور بری و بحری تجارت ہندوستانی تاجروں کے لئے عام کر دی جائے گی۔ اور ان کو اپنے مال کی نقل و حرکت کے لئے حکومت کی جانب سے دخانی جہازوں کی

سہولت مفت بہم پہنچائی جائیں گی۔ علاوہ ازیں جن تاجروں کے پاس ذاتی سرمایہ نہ ہوگا ان کو شاہی خزانہ سے مالی امداد دی جائے گی۔ لہٰذا ہر ایک تاجر کا فرض ہے کہ وہ اپنے منصب یا مفاد کے پیش نظر اعلانیہ یا پوشیدہ طور پر اس جنگ میں حصہ لے اور برطانوی حکومت کی اعانت سے باز آئے۔

ہندوستانی سپاہیوں کی بے توقیری

یہ امر مخفی نہیں ہے کہ برطانوی حکومت میں شہری اور فوجی ملازمتوں میں جو ہندوستانی کام کر رہے ہیں ان کی کوئی عزت نہیں ہے اور ان کی تنخواہیں قلیل ہیں اور ہر قسم کے اثر و رسوخ سے محروم ہیں۔ دونوں محکمہ جات کے اعلیٰ اور کثیر تنخواہوں کے عہدوں پر صرف انگریز فائز ہیں۔ فوجی ملازمت میں ہندوستانی ملازمین اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذار دینے کے بعد صوبیدار کے عہدے پر پہنچ جاتے ہیں اور ان کو بیس یا ستر روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی ہے اور جو شہری ملازمتوں میں ہیں وہ صرف صدر اعلیٰ کے عہدہ تک پہنچتے ہیں۔ جن کی تنخواہ پانسو روپے ماہانہ ہے لیکن ان کا کوئی اثر و رسوخ نہیں ہوتا۔ اور نہ انہیں جاگیر ملتی ہے اور نہ نذرانہ کرنل جرنل اور کمانڈر انچیف کے موجودہ عہدوں کے بجائے جن پر اس وقت انگریز فائز ہیں۔ بادشاہی حکومت کے تحت فوجی ملازمت میں پنج عہدی پنج ہزاری، ہفت ہزاری اور سپہ سالاری کے عہدوں پر ہندوستانی فائز کئے جائیں گے۔ اسی طرح کلکٹر، مجسٹریٹ، جج، صدر جج سکریٹری اور گورنری کے عہدوں پر بھی ہندوستانی مقرر کئے جائیں گے جنہیں لاکھوں

روپیہ تنخواہ دی جائے گی۔ اور اس کے علاوہ جاگیر، خلعت، انعام، اور اثر و رسوخ حاصل ہوگا۔ جو ہندوستانی چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے جان بحق ہوگا اسے جنت نصیب ہوگی۔ اور جو انگریزوں کی طرف سے لڑتے ہوئے مارے جائیں گے انہیں بلاشبہ دوزخ میں جگہ ملے گی۔ لہٰذا انگریزی حکومت کے ہندوستانی ملازمین کو اپنے مذہب اور مفاد کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ انگریزوں کی اطاعت ترک کرکے بادشاہی حکومت کی حمایت کرنی چاہیئے۔ اور فی الحال وہ سو یا آٹھ سو روپئے ماہوار تنخواہ حاصل کرنا چاہیئے اور مستقبل میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے حقدار ہونا چاہیئے۔ اگر وہ کسی سبب سے انگریزوں کی علانیہ مخالفت کرنے سے قاصر ہوں تو ان کو چاہیئے کہ وہ انگریزوں کے بدخواہ رہیں۔ اور واقعات کا صرف خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہیں۔ اور ان میں کوئی عملی حصہ نہ لیں"۔

انگریزوں کا دہلی پر پانچوں طرف سے حملہ

۱۴ ستمبر کو انگریزوں نے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا دہلی میں فوجی طاقت میں اضافہ کیا۔ اور دہلی میں فوجیں لاکر جمع کیں۔ دہلی پر یکبارگی حملہ کرنے کے لئے۔ پانچ کالم قائم کئے۔ تین کالموں نے کچھ کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن چوتھا کالم سبزی منڈی کشن گنج اور پہاڑ گنج کی طرف حملہ آور ہوا تھا اس نے توپوں سے مجاہدین پر گولے برسانے شروع کئے۔ کشن گنج کے مکانوں اور باغوں کے اندر سے دو یا تین سو گز کے فاصلے سے مجاہدین نے

انگریزی سپاہیوں پر گولیاں چلائیں اور لاہوری دروازہ کے گرد پر کھڑے
گراپوں کی بمبار کی جس سے انگریزی فوجوں کو بڑا نقصان پہنچا۔ دو گھنٹے
تک سوار انگریزی بے حس و حرکت کھڑے رہے اور موت کا لقمہ بنتے رہے
مرنے والوں کی تعداد کافی ہوگئی تھی۔ چار افسروں میں دو زخمی ہوئے ڈیڑھ
سو کے قریب گھوڑے مرے۔ جس کی وجہ سے چوتھے کالم کو بارہ ہندو راؤ کی
واپس آنا پڑا۔

مجاہدین کی شجاعت سے انگریزی فوج میں بھگدڑ

نکلسن صاحب نے حکم دیا کہ جونس صاحب
کابلی دروازے جائے اور کیمبل صاحب مٹکاف صاحب کے ساتھ جامع
مسجد پہنچے۔ جونس صاحب فصیل کے نیچے کابلی دروازہ پر پہنچے۔ جہاں
کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہوئی۔ اور انھوں نے اپنا جھنڈا لگا دیا اور
برن کے گرگج تک تمام توپوں پر قبضہ کرلیا۔ فصیل کی جنوب کی طرف تمام
مکانوں میں پیدل تلنگے کھڑے ہوئے تھے انھوں نے گولیوں کی ایسی
بھرمار کی کہ بڑی گرگج سے انگریزی سپاہی پھر کابلی دروازہ میں آگئے۔ انگریزی
سپاہ دوبارہ برن گرگج پر قبضہ کرنے کے لئے گئے۔ جس راستہ سے ان کو جانا تھا
وہ فصیل سے لگا ہوا۔ دائیں طرف دو سو گز لمبا تھا اور اس کے بائیں طرف بڑی
اور چوڑی چھتوں کے مکان اور دیواریں تھیں جن کی پناہ مجاہدین بیٹھ سکتے تھے
اس راستے میں جب انگریزی فوج بڑھی تو مجاہدین نے ان پر آگ برسائی۔
میجر جیکب جو بڑے بہادر مانے جاتے تھے اور پہلی بنگال فیوزیلیر کے کمانڈر

سکے زخمی ہو کر گرے۔ اس کے بعد جو بھی افسر سپاہیوں کو آگے لیکر جاتا وہی مارا جاتا۔ جب سپاہیوں نے اپنے افسروں کو مرتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے جانے سے انکار کیا۔ تو نکلسن صاحب دوڑ کر سامنے آئے اور سپاہیوں سے کہا میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ یہ کہنے کی دیر تھی کہ اس کی چھاتی پر گولی لگی پھر تیار ہوئے تو دوبارہ بھی ناکام ہوئے۔ یہی حال جامع مسجد پر شکاف کا ہوا تھا۔[1]

انگریزوں کا پھر حصار چھوڑنے کا خیال

ان تینوں محاذوں پر انگریزوں کو ناکامی ہوئی اور نکلسن میجر کیمبل، کپتان بیگن، لفٹنٹ امل، لفٹنٹ گلیبی، بیرڈ سمتھ، لفٹنٹ پاسکر لفٹنٹ ایڈل، لفٹنٹ لال بالت اور ایں توپخانہ اور پیدل دستوں کے کمانڈر بری طرح مجروح ہوئے۔ تو جنرل ولسن انتہائی پریشان ہوئے۔ اور جب فوج میں ابتری دیکھی کہ سپاہی ہیں تو ان کا افسر ندارد ہے۔ افسر ہے تو سپاہی کا نام نہیں ہے ان کو ہدایتیں کون دیتا۔ یہ بھی ان کو معلوم نہیں تھا کہ ان کے قریب کیا ہو رہا ہے۔ اس پر غور کر ہی رہے تھے کہ ان کے سامنے مقتولین اور مجروحین کی ایک بڑی فہرست آئی تو ان کو یقین ہو گیا کہ دانشمندی اسی میں ہے کہ شہر سے سپاہیوں کو پہاڑی پر واپس لیجایا جائے۔ چنانچہ جنرل ولسن نے اس مضمون کی ایک چٹھی جیمبرلین کے پاس بھیجی[1]

"ہمارے سپاہیوں میں خوفناک کمی ہو گئی اور اتنے سینئر افسر مارے گئے ہیں اب سپاہی قابو میں نہیں رہے، مجھے

---

[1] تاریخ بغاوت ہند ۱۸۵۷ء

اس میں شبہ ہے کہ نہ آئندہ کچھ کر سکیں گے۔ میں اس سلسلہ میں
آپ کی صلاح لینی چاہتا ہوں۔ اگر ہندوستان کے بکٹ حرکت
نہیں کر سکتے تو ہم میں ایسی طاقت نہیں ہے جو شہر کو لے سکیں۔

چیمبرلین نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ کیوں کرتا جبکہ اس کو لال قلعہ کے سازشی جال کا علم تھا۔ چنانچہ حملوں کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ حسبِ مجاہدین نے بھی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔ ۱۴۔ستمبر کو چھ گھنٹے کی لڑائی میں چھیا افسر گیارہ سو سپاہی انگریزوں کے مجروح مقتول ہوئے

ایک افسر کی رات کے وقت دونوں مورچوں کے درمیاں عین کشمیری دروازہ کے کھوکن کے سامنے لاش پڑی رہ گئی۔ صبح اس لاش کو اٹھانے کے لئے طرفین میں کوشش ہوئی۔ اس کے لئے ڈیڑھ دن تک لڑائی رہی۔ آخر رات کو ایک پوربئے نے دانائی سے کام لیا۔ زمین پر لوٹتا لوٹتا اس کے پاس پہنچ گیا اور اس کے پاؤں میں اپنی پگڑی کا سرا باندھ دیا اور اسی طرح لوٹتا لوٹتا واپس چلا آیا۔ اندر وہاں سے اس لاش کو آہستہ آہستہ کھینچ لایا۔ صبح کو جب انگریزوں نے لاش کو نہ پایا تو لڑائی رک گئی۔[1]

آخری معرکہ میں بھی انگریزی فوج بزدل تھی

۱۰ ستمبر ۵۷ء کو لاہوری گیٹ پر گریٹ ہیڈ صاحب نے حملہ کیا۔ مجاہدین نے ایک دروازہ کے اندر پوشیدہ طور پر

[1] تاریخ بغاوت ہند ص۲۳۲

ایک توپ لگا رکھی تھی۔ اس سے گولے مارے جانے لگے تو ولسن صاحب واپس چلے گئے۔ دوسرے دن صبح کو لاہوری دروازے پر حملہ کرنے سے گوروں نے انکار کیا کہ وہ گلی کوچوں میں لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس روز شہر کے اندر پانچ ہزار فوج میں سے انگریزی فوج تین ہزار ایک سو تھی۔ ولسن کو کہیں سے کمک آنے کی بھی امید نہیں تھی۔ بقول منشی ذکاء اللہ اس لئے ولسن چاہتے تھے کہ وہ اپنے سپاہیوں کو بچا کر شہر سے پہاڑی پر لے جائیں یہ تھی آخری معرکہ کی حالت۔

کالے خاں کی قادر انداز گولہ باری

موری دروازے کا محاذ بھی انگریز افسروں کے لئے سب سے اہم اور فیصلہ کن تھا اس محاذ پر انگریز کافی پریشان نظر آتے تھے۔ کافی جانیں ضائع ہو چکیں تھیں۔ اس کی وجہ کالے خاں گولہ انداز جیسے قادر انداز تھے۔ جو نواب مظفر الملک نذیر اعظم فیروز تغلق کی اولاد میں سے تھے جنہوں نے آخر وقت تک انگریزوں کی بھاری توپوں کا مقابلہ کیا۔ ان کی نشانہ بازی کا یہ عالم تھا کہ پہاڑی سے آنے ہوئے انگریزی گولوں کو راستے میں گرا دیتے تھے۔

کالے خاں کو بارود کی بجائے ریت ملنے لگی

ایک طرف کا نقشہ یہ تھا کہ کالے خاں اور مجاہدین کی جان نثاری اور نشانہ بازی سے دشمن لرز رہا تھا۔ اور محاذ سے واپس لوٹنے کے ارادے کر رہا تھا۔ دوسری طرف کی یہ حالت تھی

ملک کے غدار جنگ کے محافظ و نگراں اور کرتا دھرتا بنے ہوئے تھے قدم قدم پر جنگ کو ناکام کرنے کی حرکتیں کی جا رہی تھیں۔

دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ

آخر غداروں سے تنگ آ کر کالے خاں نے رسد وقت پر نہ پہنچنے کی شکایت کی۔ تو ان کو ایک تھیلے میں بھنے ہوئے چنے بھر کر بھیجے جانے لگے اس پر بھی صبر شکر کیا۔ اور ۱۶ ستمبر تک جنگ کرتے رہے۔ آخر قلت خوراک کے ساتھ قلت بارود بھی محسوس کی جانے لگی کہ بارود کی بجائے ریت تھیلوں میں بھیجی جانے لگا۔ کالیخاں بارود توپیں سہہ سکتے غیرت سے کب تک کام چلاتے۔ چنانچہ ۱۹ ستمبر کو دہلی کے اہم مقامات پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

بہادر شاہ کی گرفتاری

اسی تاریخ کو بادشاہ ہمایوں کے مقبرہ میں چلے گئے۔ وہاں جنرل بخت خاں نے بادشاہ کو اپنے ہمراہ چلنے کو کہا۔ مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ کو منع کیا کہ ان کے ساتھ مت جایئے۔ چنانچہ بادشاہ نے جنرل سے انکار کر دیا۔

ہڈسن ہمایوں کے مقبرہ میں آیا۔ وعدے وعید کے بعد بادشاہ پالکی پر سوار ہوئے ان کے ہمراہ مرزا جواں بخت، بیگم نواب زینت محل، بیگم تاج محل اور حکیم احسن اللہ خاں، مرزا قیصر شکوہ، میر فتح علی نو عمار اور دیگر اشخاص بقول مینول شاہی خاندان کے سات سو آدمی گرفتار ہوئے۔ بہادر شاہ جب شہر میں داخل ہو گئے تو انگریزی افسران بادشاہ کے ساتھ طنز و تشنیع کے ساتھ پیش آتے تھے[۱]

---

[۱] تواریخ اودھ ص۵۳۵

بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے لے جانے کا منظر

کیا طعنے تھے کچھ کو کپتان نزاسٹ نے اپنی نظم میں بیان کیا ہے لہ۔

بدو گفت جنرل کہ اے بے عقل　　نکردی تو کاری ز تدبیر عقل

عدو سپاہیاں تو بستی کمر　　نہ ترسیدی از لشکرِ نامور

کہ چوں ضیغم و فیل مستی کراست　　ندیدی دریں جنگ لستی کراست

ز پیکار انگریز لرزید مہر

زحل زہرہ مریخ پوشیدہ چہر

ترا ننگ نہ آمد ز جنگ فرنگ　　تو خود گشتی از خانماں خویش تنگ

کجا آں سپاہاں کجا غازیاں　　کجا حکم اور حکم پردازیاں

کجا توپ و بندوق آں گیر دار　　کجا آں تلنگاں سیہ نابکار

ز تو اے بہادر شاہ برتافت بخت　　کجا شان و شوکت کجا تاج و تخت

جہاں زیر فرماں انگریز شد　　بہار آمد و سبزہ گلریز شد

تو بارزم پرداختی بے درنگ

نہ ترسیدی تو از سپاہ فرنگ

بہادر شاہ کے وفادار غلام کی وفاداری

ایک انگریز نے بہادر شاہ کی ران پر ہاتھ مارا۔

بادشاہ کے وفادار غلام حبشی کو یہ گستاخی برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے اس انگریز کو اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ دو تین سپاہیوں نے اس غلام کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ بادشاہ کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک کے راستے

لہ ظفر الظفر بنام فتح نامہ انگریز ص ۶۳

لائے۔ اور لال کنوئیں کے قریب زینت محل صاحبہ کے مکان میں قید کر دیئے گئے۔ زینت محل صاحبہ، مرزا جواں بخت کو بادشاہ کے قریب کے مکان میں قید کر دیا۔ پانچ روپئے یومیہ بادشاہ کا خرچ مقرر ہوا۔ پھر بادشاہ کو اس مکان سے تبدیل کر کے قلعہ کے مکان میں رکھا۔[1]

ہڈسن کا شہزادوں کا خون پینا

بادشاہ کی گرفتاری کے بعد دوسرے دن ہڈسن نے مرزا خضر سلطان مرزا مغل اور ابوبکر کو ہمایوں کے مقبرہ سے گرفتار کر کے رتھوں پر سوار کرایا۔ جب دہلی کے جیل خانہ کے قریب فیروز شاہ کوٹلہ پر پہنچے وہاں رتھوں سے اتروا کر اپنے ہاتھ سے تین تین گولیاں قلب پر ماریں۔ اور شہ رگ کو سنگین سے چھیدا۔ چلو میں لے کر ان کا خون پیا۔ اور ان کے سر بادشاہ کے سامنے پیش کئے۔ پھر کوتوالی کے چبوترہ پر جا کر لعشوں کو زمیں پر ڈال دیا۔ تین دن کے بعد درگاہ خواجہ باقی باللہ میں دفن کرا دیا۔[2]

جامع مسجد کے صحن میں قتل عام

۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پوری دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اسی دن جامع مسجد بھی انگریزوں کے قبضہ میں آئی۔ مسجد کے صحن میں مسلمانوں کو قتل کیا۔ گورے شہر کی گلیوں اور کوچوں میں پھیل گئے۔ مکانوں کے دروازے توڑ کر اندر گھس گئے۔ غریب عورتوں سے جو چاہا سو کیا۔ سینکڑوں عورتیں اپنی عفت و عصمت کو بچانے کے لئے کوؤں میں گر گئیں جہاں

---

[1] رہنمائے دہلی [2] تواریخ اودھ ص۵۵

عورتوں، بچوں اور مردوں کو پایا قتل کیا جب یہ حال اہل شہر نے دیکھا کہ اب جان اور عزت پر بن آئی ہے ان کی حفاظت ممکن نہیں ہے تو خوب دل کھول کے لڑے نو بجے سے بارہ بجے تک یہی حال رہا۔ ہر طرف سے لاشوں سے گلیاں بھر گئیں تھیں۔ خون برسات کے پانی کی طرح بہنے لگا تھا۔ ستائیس ہزار عام مسلمان اور آٹھ ہزار فوج کے لوگ شہید ہوئے[۱] سات دن تک نہیں بلکہ مہینوں تک دہلی میں قتل عام رہا۔ دہلی کے نامور معزز ہستیاں گرفتار ہوئیں اور پھانسی پر چڑھائی گئیں۔

دہلی میں مجاہدوں سے انتقام لینے کا بہیمانہ تخیّل

جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو نکلسن اپنے ایک خط میں دہلی کے مجاہدوں سے بدلہ لینے کے لئے بہیمانہ سزاؤں کا ذکر کرتا ہے۔ لکھتا ہے۔

"دہلی میں انگریز عورتوں بچوں کے قاتلوں کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیئے جس کی رو سے ہم کو ان کو زندہ ہی جلا سکیں یا زندہ ان کی کھال اتار سکیں۔ یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر ان کو شناکے گھاٹ اتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کرنے کے خیال سے مجھے دیوانہ کئے دیتا ہے۔

زندہ آگ میں جلانا

چنانچہ مجاہدین کو ایسی بہیمانہ سزائیں انگریزوں نے دیں اور مسٹر نکلسن کی تمنا

---

[۱] تیصر التواریخ دوم ص ۵۰۷

پوری ہوئی۔ ایک عینی گواہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح انگریزوں نے ایک مسلمان قیدی کے جسم کو بار بار سنگینوں سے زخمی کر کے زندہ ہلکی آگ میں جلایا گیا تھا۔

"بدنصیب قیدی کے جلتے ہوئے گوشت سے مکروہ بدبو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی۔ ایک انسان نہایت وحشیانہ طریقے سے زندہ آگ میں جلایا جا رہا ہے اور یورپین نہایت اطمینان اور متانت سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائے ارد گرد کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ ٹائمز آف انڈیا اخبار کے فوجی نامہ نگار مسٹر رسل نے اس شخص کی ہڈیوں کو چند دنوں کے بعد اسی میدان میں پڑا ہوا پایا۔"

جو ملتا سنگینوں سے ختم کر دیا جاتا

انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی۔ تمام ایسے لوگ جو شہر کی چار دیواری کے اندر چلتے پھرتے نظر آتے سنگینوں سے وہیں ختم کر دیئے جاتے تھے۔ ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص تھے ان کو سنگینوں سے انگریزی سپاہیوں نے ڈھیر کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ ہاتھ جوڑ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے۔ پھر بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ بلکہ عمر رسیدہ انسانوں کو جنکا جسم رعشہ سے کانپ رہا تھا ان کو بھی کاٹ کر رکھ دیا۔

خاوندوں نے اپنی عورتوں کو قتل کیا

ٹائمز کا نامہ نگار لکھتا ہے

لہ مالکی ڈائری ان انڈیا ان دی ۱۸۵۸ء لہ انقلاب ۱۸۵۷ء کا دوسرا رخ ص

"میں نے دہلی کے گمنام بازاروں میں شہر کا گشت لگانا چھوڑ دیا ہے کیونکہ کل ایک ایسا دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں یعنی جب ایک افسر تیس سپاہی لیکر شہر میں گشت کے لئے جانے لگا تو میں بھی ان کے ہمراہ ہو گیا۔ اور راستہ میں ہم نے چودہ عورتوں کی نعشوں کو شالوں میں لپٹے ہوئے بازار میں پڑا ہوا پایا۔ جن کے سر دھڑوں سے اُن کے خاوندوں نے خود جدا کئے تھے۔ چنانچہ ایک عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ یہ دردناک حادثہ اس لئے ظہور میں آیا کہ ان عورتوں کے خاوندوں کو شبہ تھا کہ اگر انگریز سپاہیوں کے قابو میں آگئیں تو وہ ان کی عصمت دری کرینگے اس لئے ان کی ناموس کے تحفظ کا یہی طریقہ انہوں نے اختیار کیا۔ جس کے بعد انھوں نے خود بھی خودکشی کر لی۔ چنانچہ ہم نے ان کے خاوندوں کی لاشوں کو بھی دیکھا۔"

مجاہدین کیساتھ پھانسی پلتے تھے

ایک انگریز مجسٹریٹ جامع مسجد کا ایک واقعہ لکھتا ہے۔

"وہ رات ہم نے جامع مسجد پر پہرہ دیتے ہوئے بسر کی۔ اور ہمارا زیادہ تر وقت ان قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے یا پھانسی پر لٹکانے میں گذرتا تھا۔ جن کو ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا۔ ان میں بہت سے اسی جگہ ختم ہو گئے تھے۔ لیکن آخری وقت تک ان کے چہروں سے

شجاعت کے آثار ہویدا تھے جو اس سے کسی بڑے مقصد کی نشان علامات تھیں۔

زندہ مجاہدین کو سور کی کھال میں سینا

ٹائمز آف انڈیا کا ایڈیٹر مسٹر ڈی لین جو کہ پارلیمنٹ کے ممبر رہ چکے تھے، انھوں نے اپنے ایک آرٹیکل میں لکھا ہے۔

"زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب بھی کبھی اجازت نہیں دیتی۔"[۱]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے متعلق انگریزوں کی آخر دم تک یہ کوشش رہی اور جس میں وہ کامیاب رہا کہ اس کے صحیح انقلابی واقعات اور جو کارنامے مجاہدوں نے اس سلسلہ میں کئے تھے ان کو دبایا جائے تاکہ تاریخ کے صفحات کی زینت نہ بن سکیں۔ اور مجاہدین کے مجاہدانہ کارناموں کو ایسے رنگ میں پیش کیا جائے جس سے اس کی تمام اہمیت ختم ہو جائے۔

چنانچہ بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلا۔ جس کی کارروائی ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء سے شروع ہوئی اور ۹ مارچ ۱۸۵۸ء میں ختم ہو گئی۔ اور بہادر شاہ کو جلا وطن ہونے کا حکم سنایا گیا۔ اس میں بہادر شاہ ظفر پر لال قلعہ میں انگریز عورتوں مردوں غیرہم کے قتل کرانے اور شاہ ایران سے سازش کرنے کے الزامات لگائے گئے۔ لیکن ان واقعات کو جن سے یہ ثابت ہوتا تھا

۱۔ رسل ڈائری سی ۱۸۵۸ء ص۲۷

کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تحریک ۱۸۵۶ء سے تمام ملک میں مسلسل پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔ اور اس کا مرکز دہلی اور یو پی تھا۔ اس کو سرکاری وکیل نے نمایاں نہیں کیا۔ بلکہ نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ میں اس قسم کے کاغذات موجود ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے چنانچہ پنڈت کنھیا لال نے اپنی تالیف "محاربہ عظیم" میں اس بات کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ صفحہ سات پر لکھتے ہیں۔

"مشہور ہے کہ شراکت شاہ معزول اودھ کی بھی اکثر کاغذ سے جو اس کی قیام گاہ سے برآمد ہوئے اور جن پر اس کے دستخط موجود ہیں پائی جاتی ہے فوراً بعد از تسلط سرکار انگلشیہ ملک اودھ ماہ مارچ ۱۸۵۶ء وقوع میں آیا تھا۔ شاہ معزول نے رسم رسل و رسائل ساتھ شاہ دہلی کے شروع کیا۔ اور لکھا کہ تمام فوج ہندوستانی جو ملازم سرکار ہیں ان کو ترغیب اس امر کی دی جائے کہ وہ تمام یک تن ہو کر ایک روز جو بعد ازیں قرار پاوے گا فساد شروع کر کے اپنے افسران انگریزی اور دیگر انگریزوں کو اور ہندوستانی عیسائیوں کو جو ان کے ہاتھ لگیں قتل کر دیں اور تمام راجہ اور رئیسان ہندوستانی کو علانیہ عام واسطے شامل ہونے کے دیں اور بعد از قتل کرنے یا بھگا دینے فوج گورہ کے ممالک ہندو مسلمین کو جو قبل آمد قوم غزنی اور مردود فرنگیوں کے

قبضہ داشتہ اور ازلیائی شاہنشاہی میں تھیں دوبارہ تسلط شاہ
دہلی میں کردیں اور اوّل قدم جو شاہ معزول نے اس ارادہ
مفسدہ پر رکھا تھا کہ دو رجمنٹ ہندوستانی نمبر ۱۹ اور ۳۴
اس زمانہ میں مقام لکھنؤ میں قیام پذیر تھیں ان کو ترغیب
اس امر کی دی اور وقت تبدیلی معمولی افواج ۱۸۵۶ء و
۱۸۵۷ء یہ دونوں رجمنٹ لکھنؤ سے تبدیل ہو کر ایک تو
برہام پور اور دوسری بارکپور روانہ ہوئی اور تخم فساد جو
ان کے دل میں بویا گیا تھا ان کے ساتھ مقامات مذکورہ میں
پہنچا اور درمیان ۱۸۵۷ء کے سپاہیان رجمنٹہائے مذکور
خصوصاً سپاہیان رجمنٹ ۳۴ درپے ترغیب سرکشی
بدیگر رجمنٹہا رہے اور ہر ایک رجمنٹ ہندوستانی سے خط و
کتابت اس امر میں کرتے رہے اور فہمائش کرتے رہے کہ حمایت
اور پاسداری اپنے قدیم بادشاہوں کی بہتر ہے۔ سپاہ
کو لازم ہے کہ اپنے قدیم بادشاہوں کی رفاقت کریں اور
اغیار عیاروں کی صحبت سے فراغت حاصل کریں"۔

اسی طرح بہادر شاہ کے مقدمہ میں وہ پہلو جس سے یہ بات ثابت ہوتی
تھی کہ شاہ ایران کے بادشاہ کی ہندوستانی مجاہدوں سے سازباز تھی
اور جب ۱۸۵۶ء میں انگریزوں اور ایران کے درمیان جنگ ہوئی
تھی اس وقت بادشاہ ایران نے ایسا جہادنامہ شائع کیا تھا جس

ہندوستانیوں کو بھی انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کا پیغام دیا تھا۔ اس جہاد نامہ کو سرکاری بکیں پی گیا۔ حالانکہ یہ جہاد نامہ بہادر شاہ کے مقدمہ کی فائل میں موجود ہے جس کا اردو ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔[1]

"سرکار انگلشیہ نے بوجہ طاقت و قدرت اپنی کے جو اس کو باعث فتح ہند اور بسبب فوائد جو اس فتح سے حاصل ہوئے ہیں یہ ارادہ کیا ہے اور بلکہ طریق زیادتی کا بھی بدیں خیال اختیار کیا ہے کہ تمامی ملک مشرقی قبضہ سرکار مذکور میں آجاوے اور اسی نیت سے سرکار مذکور نے عزم فتح افغانستان کیا تھا گو کہ اس مہم میں بہت سی زک اٹھائی اور شکست فاش نصیب ہوئی۔ مگر ملک افغانستان میں بڑا فتور برپا ہوا۔ اور سرکار انگلشیہ نے لاہور اور پشاور اور دیگر مضافات افغانستان فتح کر لئے اور اس فتح سے ان کا مقصد یہ ہے کہ ملک ایران پر تسلط ہو جاوے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہماری خط و کتابت کسی رئیس افغانستان سے کہ جو ہمارے ہمسایہ اور ہم مذہب ہیں اور ہمیشہ سے ہمارے رفیق اور دوست رہے ہیں نہ ہووے۔ اس سے غرض ان کی یہ ہے کہ ان کو راستہ واسطے آنے ایران کے ہر طرف سے ملے اور بشرط دست قدرت شاہ ایران کو بطور راجہ ہائے ہندوستان زیر نگیں کریں

[1] محاربہ عظیم صفحہ ۴

اور مذہب اسلام کو خراب کر کے مثال مذہب مسلمانان ہند
اس میں بھی فتور ڈالیں۔ اور اس مطلب کے حاصل کرنے کو
سرکار انگلشیہ نے فوج کشی اوپر ملک ایران کے شروع کی
ہے اور جہال و دہاقین کو بدغابازی و بے ایمانی فریب
دے کر مصدر افعال ناشائستہ ہوئے تھے اور سرکار مابدولت
ہنوز کوئی تدبیر بعوض ایسی حرکات ناشائستہ کے عمل میں نہیں
لائی ہے مگر اس سرکار نے بخیال ضعف سلطنت حرکات
ناشائستہ و بد عہدی کے یہاں تک بہم پہنچائے ہیں کہ ترغیب
ترک کرنے ملازمی شاہی اور اختیار کرنے نوکری سرکار
انگلشیہ شاہزادہا و منشیان ملازم ایران کو دیتے ہیں اور بطرز
بغریب و مکار رستانی دعوے ہائے باطل و تجویزات نادرست
پیش کر کے عزم حصول مطلب ذلیل چاہتے تھے کہ رفتہ رفتہ
تمام افترا پردازی ان کی ظاہر ہو گئی۔ الغرض سرکار انگلشیہ نے
فوج اپنی ملک ایران میں بھیجی۔ اور چونکہ یہاں گمان بھی ایسے
امر کا نہ تھا۔ اور اسی سبب سے کچھ تیاری عمل میں نہ آئی تھی۔
ایک قلعہ ملک اسلام جو برلب دریائے شور واقع تھا۔ اور
فوج قلیل اس میں بطور محافظ قائم تھی ان کے قبضہ میں
آگیا۔ اور چونکہ کچھ اور فوج شاہی وہاں موجود نہ تھی۔ قلعہ
مذکور میں جا کر فوج انگلشیہ قائم ہوئی۔ مگر جب انھوں نے

دیکھا کہ پیشقدمی اس جگہ سے باعث ترند ہوگا اور اُس قلعہ سے باہر نکلنا گویا ماہی بے آب کی طرح بے قراری میں پڑا ہوا زمین مقیم رہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر نہ پیش قدمی کرتے تو شمشیر ہائے آبدار شجاعان اسلام ان کے تن میں دم باقی نہ رکھتی۔

لیکن حضور بدولت شاہنشاہ کو اب موقع اظہار مکنون خاطر بطیب دل بباعث بدعہدی سرکار انگلشیہ حاصل ہوا۔ اور احکام بدولت صادر ہوئے ہیں کہ فوج بیشمار سرحدات ممالک پر جمع ہوں اور بنام فوج نصرت قرین حکم محکم شرف نفاذ پایا ہے کہ بطرف سرحد روانہ ہوکر دشمنان دین کو نکال ڈالیں اور اس خس و خاشاک کو بیچ دریائے عرب منتشر کر دیں۔ خدا جس کو چاہے فتح بخشتا ہے اور اب مطابق قول پیغمبر جس نے تکلیف تم کو دی اس نے تکلیف پیغمبر کو دی۔ ہر ایک ساکن ایران کو فرض عین سمجھنا چاہیئے۔ کہ بموجب قول جو تم کو مارنا چاہتا ہے اس کو تم بنام خدا مارو۔ کاربند ہوں اور ہر ایک کبیر و صغیر غریب و امیر عالم و جاہل رعیت و سپاہ کو چاہیئے کہ محافظت دین محمدی کے لئے ہمت کریں۔ اور کمر شجاعت چست باندھکر باسلاح و یراق اپنے جسموں کو زیب و زینت دیں اور

ہر ایک عالم و واعظ کو چاہیئے کہ مساجد و مقامات جرگہ و جلسہ
ممبروں پر دلائے عام دیویں کہ ہر ایک شخص بنام خدا جہاد پر
آمادہ ہو اور اس سبب رغبت سے غازیان راہ خدا مستوجب
وعدہ آنحضرت ہوں گے ۔ بالتحقیق ہم ان میں سے ہیں جو
براہ خدا لڑتے ہیں ۔ لیکن چونکہ فوج ظفر موج نے ہنوز شمشیر
دشمنوں پر علم نہیں کی ہے اور اس گروہ ہمہ تن شوقی کو اجازت
کوچ کرنے کی اب تک حاصل نہیں ہوئی ہے اس واسطے
مایہ دولت نے تقرری افواج بدیں نمط فرمائی ہے ۔ کہ
امیر الامراء مرزا محمد خان کشیکچی باشی اور امیر علی خان شجاع الملک
اور دیگر جرنیلان و کمانیر مع پچیس ہزار سپاہ کے بطرف فارس
اور شہزادہ نواب صمصام الدولہ مع بیس ہزار سپاہ کے
بجانب محمرہ اور غلام حسین خان سپہدار و جعفر علیخان
میر پنجہ باافسری رجمنٹ ہائے و رسالہ ہائے کرانجی داعی و
آذربائیجان و کرمان بتعداد بیس ہزار کے بطرف کرمان روانہ
ہوں اور بنام نواب احتشام السلطنت حکم ہوا ہے
کہ براہ کیچ و بکرام جو واقع ملک سندھ میں اور بنام سرداران
افاغنہ مثل سردار سلطان احمد خان سردار شاہ و سلطان خان
سردار سلطان علی خان و سردار محمد عالم خان حکم نافذ ہوا
ہے کہ براہ افغانستان مع تیس ہزار سپاہ و چالیس توپ

توپ و دیگر سامان بیشمار حرب و ضرب بجانب ہندوستان روانہ
ہوں اور بفضل الٰہی امید ہے کہ اس فوج قہار کو فتح نصیب ہوگی۔
اب یہ امر ضروری ہے کہ اقوال افاغنہ و دیگر باشندگان
افغانستان جو ہم مذہب ایرانیوں کے ہیں اور جان سے
ہی اقران اور قبلہ اور مسائل محمدی کے پیرو ہیں شریک جہاد
ہوں اور دست امداد برادرانہ دراز کریں اور جلد عمل
کریں اس خوشخبری کے موجب قول محمدی کے کاربند ہوں
بالتحقیق جو با ایمان ہیں وہ آپس میں بھائی ہیں اور اس
حکم خدا کو عمل میں لاویں کہ خدا با ایمانوں کے اجر کو بے ایمان
اور مشرکوں کے عمل سے مختلف اوزان میں وزن کریگا۔ اور
واسطے دور کرنے اس فساد کے بھی صرف ضرور نہیں کہ ایک
جزو گروہ حق پرستوں کا آمادہ محافظت دین ہو بلکہ لازم ہے
کہ تمام باشندگان ممالک ہمارے حکم کی متابعت کریں اور
یہ بھی واضح رہے اقوام افاغنہ پر کہ شہنشاہ ایران کا ارادہ
ہرگز نہیں ہے کہ جانب افغانستان ملک گیری کرے۔ بلکہ یہ
یہ خواہش ہے کہ ملک قندھار سردار رحمدل خاں اور خاندان
کہن دل خاں کو ملے اور حاکم کابل اپنے ملک مقبوضہ مفتوحہ
میں حکمران رہے مگر یہ منشا ہمارا ہے کہ سب متفق جہاد
بخلاف دشمنان دین ہوں اور ان میں شمار ہوں جنکی نسبت

آنحضرت نے یہ فرمایا ہے کہ رحمت خدا ان پر نازل ہوگی جو جہاد میں لڑتے ہیں اور ہم کو یقین ہے کہ بعد ملاحظہ اس اشتہار کے سردار دوست محمد خاں امیر کابل جس کی خواہش دلی ہمیشہ سے یہ تھی کہ فوج ایران جانب افغانستان متوجہ ہو اور رابطۂ دوستی و اتحاد اس سلطنت ایران سے پیدا ہو تا کہ اس وسیلہ سے استحکام اس کی سلطنت کا بخلاف گمراہان از راہ راستی متصور ہو۔ شامل ہمارے اس امر خیر میں ہوں گے اور اس جہاد میں سرپرست ایک گروہ حق پرستوں کے ہو کر غازی ہندوستان کے کہلاویں گے۔ کیونکہ یہ خارج از قیاس ہے کہ وہ طلبگار ایسی قوم کی دوستی کے ہوں گے جس کی شان میں پیغمبر نے یہ فرمایا ہے بالتحقیق وہ تم کو پیار نہیں کرتے تم بھی ان کو پیار نہ کرو۔ اور یہ بھی عقل گوارا نہیں کرتی کہ وہ واسطے دولت دنیا کے ایمان فروشی کریں گے۔ یہ اشتہار واسطے اطلاع اور آگہی حق پرستوں کے مشتہر ہوا ہے اور انشاء اللہ جمیع پیروان اسلام ساکن ہند و سندھ بھی ہمارے شریک ہوں گے اور اس قوم نصاریٰ سے عوض ان زیادتیوں کا لیں گے جو مذہب پاک پران سے عائد ہوئی ہیں۔ اور کسی چیز سے اس امر متبرک میں دریغ نہ کریں گے۔“ فقط۔

نومبر ۱۸۵۶ء کو بہادر شاہ چھ سو گورے سپاہ فرنگی حراست میں قوابنیت محل

صاحبہ، نواب تاج محل صاحبہ، خیر آبادی، ظہور آبادی، مرزا جواں بخت، شاہزادہ مرزا عباس، مرزا قیصر ابن شاہ مرزا سلیمان شکوہ، نواب شاہ بادلی زوجہ مرزا جواں بخت اور ان کی ساس اور سالے، احمد بیگ، باسط علی کے ساتھ بہادر شاہ ظفر رنگون کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاں پہنچتے تھے وہاں عوام کے گھروں میں ماتم برپا ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دوست نے بہادر شاہ ظفر کو کانپور میں اس حالت میں دیکھا [1]

"ایک پینس میں بادشاہ گیروے لباس میں سوار تھے ۲۵ گورے پینس کے اندر گرد تھے۔ دو تین پینس اور کئی انجیوں میں بقایا لوگ سوار تھے آٹھ روپے یومیہ مقرر تھے"۔

بہادر شاہ کا دستور العمل انتظام فوجی و ملکی

بہادر شاہ ظفر نے جو ایک دستور العمل فوجی و ملکی انتظام کے لئے بنایا تھا اس کے کاغذات بھی بہادر شاہ کے مقدمہ میں داخل ہیں۔ لیکن اس کا بھی ذکر مقدمہ میں نہیں ہے اور نہ ہی اس دور کی تاریخوں میں اس کا ذکر ہے۔ غالباً یہی وہ دستور العمل ہے جس کو مولینا فضل حق خیر آبادی نے مرتب کیا تھا جس کا ذکر منشی ذکاء اللہ صاحب مرحوم نے اپنی کتاب تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند صفحہ ۶۹۰ میں کیا ہے۔ لیکن اس میں گاؤکشی کی ممانعت کی کوئی دفعہ نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ وہ دستور العمل دوسرا ہو۔ ملاحظہ ہو دستور العمل کی عبارت

---

[1] تواریخ اودھ صفحہ ۲۵۲

ازانجا کہ واسطے رفع برہمی سررشتہ ہا اور موقوفی بدانتظامی طریقہ فوجی و ملکی کے مقرر ہونا ایک دستور العمل کا واجب اور مناسب ہے اور واسطے عمل درآمد دستور العمل کے اول معین ہونا کورٹ کا ضرور ہے اس لئے حسب ذیل قواعد مقرر کئے جاتے ہیں،

(۱) ایک کورٹ قائم کی جائے اور اس کا نام کورٹ ایڈمنسٹریشن یعنی جلسہ انتظام فوجی و ملکی رکھا جائے۔

(۲) اس جلسہ میں دس آدمی مقرر کئے جائیں اس تفصیل سے کہ چھ جنگی اور چہار ملکی ہوں اور جنگیوں میں دو شخص رسالہائے سواران سے اور دو شخص سررشتہ توپخانہ سے منتخب کئے جائیں۔

(۳)، ان دس شخصوں میں سے ایک شخص باتفاق علیہ آرا پریسیڈنٹ یعنی صدر جلسہ اور ایک شخص وائس پریسیڈنٹ یعنی نائب صدر جلسہ مقرر ہو اور رائے صدر جلسہ کی برابر دو رائے کے قرار پائیگی۔ اور ہر ایک سررشتہ میں بقدر ضرورت سکتر مقرر کئے جاویں۔ اور پانچ کس پر جلسہ کورٹ کا ہوئے۔ کام مناسب و بامراد ہوا کرے۔

(۴)، ان دس شخصوں کے مقرر ہونے کے وقت حلف ان باتوں کا لیا جائے کہ کام کورٹ کا دیانت اور امانت سے بلارو رعایت کمال جانفشانی اور غور و فکر سے سرانجام کریں گے اور کوئی دقیقہ دقائق متعلقہ انتظام سے فروگذاشت نہ کریں گے۔ اور حیلتہً اور صراحتاً خوف و جبر یا رعایت کسی طرح کی کسی لحاظ سے وقت تجویز اور انتظام کورٹ میں

نہ کریں گے۔ بلکہ ہمیشہ ساعی و سرگرم ایسے انتظام امورات سلطنت میں مصروف
رہیں گے کہ جس سے استحکام ریاست اور رفاہ اور آسائش رعیت ہو اور
کسی امر محمودہ کو بے اجازت کورٹ اور صاحب عالم قبل اجرا اس کے
صراحتاً یا کنایۃً کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔

(۵) انتخاب اشخاص کورٹ کا اس طریقہ سے کہ غلبہ آراء سے دو دو
شخص پلٹن پیادگان اور رسالہ ہائے سواران سے سررشتہ توپخانہ جنگی سے
جو قدیم الخدمت اور ہوشیار اور واقف کار اور لائق اور عقیل ہو کئے جائیں
اور اگر کوئی شخص ہوشیار بہت اور عقیل اور فہیم اور لائق انصرام کار
کورٹ ہو اور شرط قدیم الخدمتی کی اس میں نہ پائی جائے تو صرف اس
صورت میں بھی ایک امر خاص مانع تقرر ایسے شخص کا ہوگا۔ اور اسی
طرح تقرر اس میں چار شخص ملکی کا بھی عمل میں آویگا۔

(۶) بعد مقرر ہونے دس شخصوں کے اگر کوئی شخص جلسہ انتظام
عام کورٹ میں رائے اپنی کسی امر میں ایسی کہ خلاف دیانت اور امانت
یا حمول اوپر رعایت کسی کے ہوویگا تو کامل غلبہ آراء کورٹ سے وہ شخص
علحدہ کیا جائے گا۔ اور دوسرا شخص حسب قاعدہ پانچویں بجائے
اس کے انتخاب ہو۔ جو امور انتظام کے پیش آویں اول تجویز ان کی کورٹ
میں ہو۔ اور بعد منظوری صاحب عالم بہادر کے اطلاع رائے کورٹ
سے حضور رنا میں ہوتی رہیگی۔

(۷) بعد مرتب ہونے برائے غلبہ آراء جلسہ کورٹ سے ذات خاص

منظوری کے پیش گاہ حضور صاحب عالم بہادر میں پیش ہونگے اور کورٹ تحت حکومت صاحب عالم بہادر ممدوح کے رہیگی۔ اور کوئی امر امور انتظامی جنگی اور ملکی بے تجویز کورٹ اور بلا منظوری صاحب عالم محتشم الیہ اور بلا اطلاع حضور والا قابل اجرا نہوگا۔ اور بصورت اختلاف رائے صاحب عالم بہادر تجویز ثانی کورٹ وہ رائے بحالت اختلاف بوساطت صاحب معظم الیہ پیش گاہ حضور ظل سبحانی میں پیش ہوا، اس میں حکم حضور کا ناطق ہوگا۔

(۸) کورٹ میں سوائے اشخاص مقررہ علیہ کے مگر صاحب عالم بہادر اور حضرت ظل سبحانی رونق افروز ہونے کا اختیار رکھیں گے۔ کوئی شخص غیر شریک جلسہ اندر حاضر نہ ہوگا۔ اور جب اشخاص معینہ کورٹ میں سے بعذر قوی لائق پذیرائی ایک شخص اپنی تعداد مقرر سے حاضر جلسہ کورٹ نہ ہوسکے تو رائے علیہ آرائے اشخاص مابقی حاضرین جلسہ کورٹ کے بمنزلہ رائے کل جلسہ کورٹ کے متصور ہوگی۔

(۹) جب کوئی شخص کورٹ میں سے بہ نسبت کسی امر کے رائے اپنی پیش کرنی چاہے تو اولاً اتفاق ایک رائے دوسرے شخص کا کرکے اس وقت رائے اپنی متفق علیہ دو شخص کورٹ کے پیش کرے۔

(۱۰) جس وقت کوئی امر کورٹ میں موافق قاعدہ ۹ کے پیش ہو تو اول پیش کرنے والا تقریر اپنی کورٹ میں بیان کرے اور جب تک بیان اس کا تمام نہ ہو کوئی شخص اس میں دخل نہ کرے۔ اہل کورٹ

ئیں سے اگر کسی کو کچھ اعتراض ہو تو وہ بھی اپنے اعتراض ظاہر کرے تا تمام ہونے اس کے بھی کوئی دخل نہ دے اگر معترض پر کوئی تیسرا شخص تقریر اپنی درباب اصلاح یا ترمیم کسی طرح کی کمی بیشی کے ساتھ پیش لاوے اور ما بقی اہل کورٹ کو سکوت ہو تو ہر ایک اہل کورٹ اپنی اپنی رائے علیحدہ لکھے موافق قاعدہ نمبر ۵ کے غلبہ آرا پر عمل ہوگا۔ اور بعد منظوری ہر ایک سررشتہ کے سکتر کے پاس بھیجی جاوے۔

(۱۱) اور ہر ایک سررشتۂ فوج سے جو اشخاص حسب قاعدہ دویم کے منتخب کئے جاویں گے وہی اشخاص اس سررشتہ کے منتظم اور منصرم مقرر کئے جاویں اور ان کے تحت میں چار آدمی کی کمیٹی حسب طریقہ قاعدہ چوتھے کے قرار پاوے اور بقدر ضرورت اس کمیٹی میں سے سکتر مقرر ہوں اور بجائے اس کمیٹی میں غلبۂ آرا سے مرتب ہو کر رائے بذریعہ انہی شخصوں افسر کمیٹی کے کورٹ میں پیش کی جائے۔ اور کورٹ سے موافق قاعدہ ساتویں کے عمل میں آوے۔ اور یہی طریقہ ہر ایک سے رشتہ فوجی و ملکی میں مرعی کیا جاوے۔

(۱۲) ہر وقت بمقتضائے مصلحت کورٹ کو اصلاح اور ترمیم قواعد دستور العمل ہذا کا غلبۂ آرا سے اختیار دیا جائے۔"

ان ہی ایام میں بادشاہ نے اپنے حسب حال دو غزلیں کہیں۔ ایک نقل کی جاتی ہے[۱]

کرحم غریبی پہ گردش ایام | بدخیہ ی زندان نکرا تا مجھے بازا

---

[۱] تذکرہ ... ص ۲۷۲

برگشتگی بخت رکھ اتنا تو نہ ناکام
اے شومیٔ طالع نہ کرا اتنا مجھے بدنام

بے مہری جاناں تو مرے ساتھ وفا کر
اے نالۂ شبگیر مرے حق میں دعا کر

اے رنج تو ہی دل کی مسرت کا سبب ہو
حرماں تو ہی اب انیسِ ایامِ تعب ہو

اے گردِ سیاہ تو آنکھوں کو ضیا دے
اب ہاں مری کشتی کو کنارے لگا دے

اے دستِ جنوں میرے گریباں سے خبردار
اے خارِ مغیلاں مرے داماں سے خبردار

رنجیدگی یار یہ عنایت کی جا ہے
کر عفو گنہ ہوں کہ مرا حال برا ہے

مجھ عاشقِ جانباز کو کیوں تو نے ستایا
بتلا دے کسی بات میں باطل مجھے پایا

زندہ کو تو مردہ کیا مردے کو جلایا
اے عیسیٔ دوراں تجھے کچھ رحم نہ آیا

کیوں چرخ ستمگر مرا یہ حال تباہ ہے
شہباز کو گنجشک کے پنجے میں رکھا ہے

بہادر شاہ ظفر راستہ بھر بڑی تکلیفوں کے ساتھ سفر کرتے رہے ان کے پاس کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی نہ وہ کسی سے بات چیت کر سکتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے اسی سفر میں یہ مشہور نوحہ کہا تھا

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے وہ اک مشتِ غبار ہوں

یہ بھی لوگوں کی زبانی سُنا گیا کہ بعض مقامات پر اس کے مختلف اشعار پوشیدہ طریقہ پر اپنے جوانا سے کاغذ پر لکھ کر ڈالدئے جو لوگوں کے پاس کسی نہ کسی صورت میں پہنچ گئے۔ اور عوام کو معلوم ہو گیا کہ بہادر شاہ جلاوطن کر دئیے گئے ہیں۔ لیکن یہ بات خلاف عقل اور ناقابل اعتبار ہے

لیکن بہادر شاہ ظفر اور ان کے مصاحبین کو یہ آسانیاں میسر نہیں تھیں۔
بہادر شاہ ظفر کو قلعہ میں اسیری کے ایام میں پلنگ تک نہیں دیا گیا
عدالت کے سامنے جب انھیں پیش کیا گیا تو وہ برہنہ سر تھے اور انھیں عدالت
کے باہر ایک گھنٹے تک ملزم کی حیثیت سے انتظار کرنا پڑا۔ پھر پیشی کے
وقت ملزم بہادر شاہ حاضر ہے کی آواز لگائی جاتی تھی۔ ایسی صورت
میں بادشاہ اپنے کلام کی کیسے تشبیہ کر سکتے تھے۔

بادشاہ کا قافلہ بہت سے چکر لگاتا ہوا کلکتہ پہنچا۔ جہاں واجد علی شاہ
پہلے ہی قید کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مگر دونوں حکمرانوں کی حالت میں
زمین و آسمان کا فرق تھا۔ واجد علی شاہ کے لئے آسائشوں اور آرام کے
تمام سامان مہیا کر دیے گئے تھے، ادھر کیا تھا۔ قہر در قہر اور یاس و ناامیدی،
ذلت اور فاقہ۔

بہادر شاہ ظفر کی واجد علی شاہ سے ملاقات

یہ روایت بھی مشہور ہے کہ
کہ جب کلکتہ میں بہادر شاہ ظفر کی آمد کی اطلاع واجد علی شاہ کو پہنچی
تو انھوں نے گورنر جنرل سے ملاقات کی اجازت چاہی جسے گورنمنٹ نے منظور
کر لیا۔ چنانچہ انگریز عہدہ داروں کی موجودگی اور فوجی محاصرہ میں ان کی
ملاقات ہوئی۔ عجب سماں تھا اس حسرت بھری ملاقات کا دل پھٹے جاتے
تھے۔ شہنشاہ عجب حال سے تھے۔ بدن پر ملاگیری لباس اور درویشانہ ٹھاٹھ ہی پونجی
میں تھا۔ ہاتھ میں زمرد کی تسبیح تھی اور بس۔ واجد علی شاہ نے جب ان

قلعہ کے فرمانروا کو دیکھا فوراً جھک کر ایک مرتبہ کورنش بجا لائے۔ جو خاموش اشارہ تھا کہ حضور توپ خانہ نہیں کہ ایک ضرب توپیں سر کر کے سلامی دیجائے۔ مگر یہ عاجزانہ سلامی قبول کیجئے۔ آپ اب بھی دلوں کے بادشاہ ہیں۔ اس وقت شہنشاہ ظفر کے آنکھوں سے سیلاب اشک رواں ہو گیا۔ دل بھر آیا۔ واجد علی شاہ نے جب کورنش سے سر اُٹھایا تو یہاں بھی یہی عالم تھا۔ اللہ اللہ آنسوؤں کی روانی نے نہ معلوم کیا کیا کہہ دیا ہے۔

راز کی بات لے باد صبا یا ذکر غیر

کورنش کے بعد واجد علی شاہ آگے بڑھے اور ادب کے ساتھ اپنی جریب (چھڑی) جو مرصع جواہرات کی تھی دونوں ہاتھوں میں تھام کر جھکاتے ہوئے نذر کے طور پر پیش کر دی اور شہنشاہ ظفر نے جواب میں تسبیح عطا کی جسے واجد علی شاہ نے آنکھوں سے لگایا۔ بوسہ دیا۔ اور اُلٹے پاؤں پھر ایک مرتبہ کورنش بجا لائے۔ اس طرح سرزمین برصغیر پہ تاریخی ملاقات "اسیری و جلاوطنی" کا آخری داغ تھا جو دونوں بادشاہوں کے دل پر لگا"

یہ روایت خیالی نقشوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ البتہ دلچسپ ضرور ہے۔ اور اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جب واجد علی شاہ کو مٹیا برج میں بہادر شاہ ظفر کی آمد کی اطلاع ہوئی ہوگی تو ان کا دل ضرور ان سے ملنے جلنے کے لئے بےچین ہوا ہو گا۔ اور ان کے دل کی حالت عجیب و غریب ہوئی ہوگی۔

رنگون کی بیکسی کی زندگی

بہادر شاہ ظفر کو کلکتہ میں ٹھہرنے کا بھی موقعہ نہیں ملا۔ ان کو دوسرے کلکتہ سے جہاز پر گوروں کے سخت پہرہ کے ساتھ سوار کرا دیا گیا۔ اسی طرح جب جہاز رنگون پہنچا تو وہاں بھی سخت پہرہ تھا۔ جہاز سے اتارتے ہی انہیں گوروں کے زیر حراست صدر بازار رنگون کے ایک دو منزلہ بنگلے میں لے گئے جو گھوڑ دوڑ کے پرانے مکان کے قریب تھا۔ آجکل اس سڑک کا نام "ڈائل روڈ" ہے۔ اس دو منزلہ بنگلہ کے نیچے منزل کے نصف حصہ میں انگریزی گارد رکھی گئی اور نصف میں گھوڑے باندھے گئے۔ جو اس دستہ کا نگراں اعلیٰ تھا اسے ایک کوٹھی ساز و سامان سے آراستہ دی گئی۔ بادشاہ کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں تھا چھپر کھٹ تھا نہ مسہری۔ بلکہ ایک کھری چارپائی بھی دے دی گئی۔ اور معمولی قسم کے برتن ان کے لئے مہیا کئے گئے۔ بادشاہ کی صحت اس سمندری سفر میں بہت خراب ہو گئی تھی۔ نہ حکیم احسن اللہ خاں تھے کہ نبض دیکھتے نہ ادویات تھیں جو مہیا کی جاتیں۔ ہوتی بھی کیونکر ایک کمینہ خصلت دشمن کے ہاتھ میں شہنشاہ اور ان کے خاندان کی آبرو اور قسمت چلی گئی تھی۔ گورے سپاہی شہنشاہ کی تکلیفوں پر قہقہے مارا کرتے تھے۔ اور نگراں ان کی بیکسی پر مسکراتے تھے۔ ابتدا میں اخراجات کے لئے کوئی رقم مقرر نہیں کی گئی تھی چنانچہ نواب زینت محل کے زیورات فروخت ہوتے تو ان روپیوں سے پیٹ پلتا تھا۔ آخر رنگون کے ایک اخبار نے بہادر شاہ ظفر کی غربت کی

داستان شائع کی۔ مگر بہادر شاہ ظفر نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا
عوام کے بہت کچھ جستجاج کرنے کے بعد چھ سو روپے ماہانہ خرچ کے لئے
مقرر ہوا۔ بہادر شاہ ظفر سے قید خانہ میں ملاقات کرنے کی کسی کو اجازت
نہیں تھی۔ حکام اعلیٰ جس سے چاہتے تھے ملوا دیتے تھے۔

بہادر شاہ کو بدنام کرنیکی چال

ایک انگریزی جوڑے کو بہادر شاہ ظفر سے ملنے کا شوق
پیدا ہوا۔ انھوں نے حکام اعلیٰ سے ملنے کی اجازت لی۔ اور بادشاہ کی خدمت
میں گئے۔ لڑکی جوان اور حسین تھی بہادر شاہ ظفر سے ملکر بہت متاثر ہوئی
اور اس کو بادشاہ سے ہمدردی بھی ہو گئی۔ وہ برابر گارد سے اجازت
لے کر بادشاہ کو دیکھنے کے لئے آتی رہتی۔ اور کئی دنوں تک آتی رہی
جب وہ نہ آتی تو بادشاہ گارد سے پوچھتے۔ انگریزی محافظ نے اس
آمد و رفت کے متعلق افسران بالا کو رپورٹ بھیجی اور لکھا کہ بادشاہ کو
اس لڑکی سے عشق ہو گیا ہے۔ حکم آیا کہ لڑکی جس کا نام "سولینا" تھا اس کو
ہدایت کی جائے کہ وہ بن سنور کر بادشاہ کے پاس جایا کرے۔ اور دن کے
بجائے رات کو جائے۔ لڑکی نے ایسا ہی کیا۔ وہ آتی۔ بادشاہ اس کو
دیکھتے اور سکوت اختیار کرتے کوئی بات نہ کرتے۔ انگریزی محافظ متحیر
تھا۔ کوئی قابل گرفت بات اس کے ہاتھ نہیں لگی۔ آخر دوسرا حکم آیا
کہ لڑکی کا آنا جانا بند کر دیا جائے۔ جب لڑکی بادشاہ کے پاس کچھ
دنوں نہیں آئی۔ تو بادشاہ نے گارد سے معلوم کیا۔ اس کے بعد

"سولینا" کو خوب بنا سنوار کر شب کو بادشاہ کے پاس بھیج گیا۔ گارڈ کو یقین تھا کہ آج "مقصد پورا ہو جائیگا۔ کیونکہ لڑکی کو بے تکلفی کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ چنانچہ وہ تاک میں رہا۔ بہادر شاہ ظفر نے اس سے جس خواہش کا اظہار کمرہ زنداں میں کیا وہ یہ تھی۔

"بیٹی یہاں آؤ کیا تم بھی اس تنہائی سے گھبرا گئیں بیشک ایک غمزدہ باپ کے پاس تمہاری جیسی ناز پروردوں کے لئے سامان آسائش اور سامان دلبستگی کہاں۔ بہرحال میری خواہش تھی کہ میں تمہیں وہ کچھ دیتا جو کبھی دے سکتا تھا۔ مگر آج تمہارے مفلس اور قیدی باپ کے پاس محبت و خلوص کی دعاؤں کے علاوہ اور کیا ہے"۔

محافظ حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے جو جال بوڑھے قیدی بادشاہ کیلئے بچھایا گیا تھا اس کے تار و پود بکھر رہے ہیں۔ لڑکی کا خاوند محافظ کے پاس کھڑا ہوا تھا اندر داخل ہو گیا۔ اس نے بادشاہ کو سلام کیا اور ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے رو پڑا۔ بادشاہ نے اس کو مخاطب کیا۔ اور فرمایا۔

"صاحبزادے یہ ایک غریب باپ کی بیٹی ہے ظفر کی جو کبھی تاج و تخت کا مالک تھا۔ آج اس کے پاس کچھ نہیں ہے مگر محبت ضرور ہے اور بادشاہ نے "عبا"، جو عظمت دلی کی واحد اور آخری یادگار تھی سرہانے سے نکالی اور "سولینا"

کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ یہ لو میری آخری نشانی اور سب سے
عزیز تحفہ ہے۔ اس کے بعد بادشاہ پھر اس کے شوہر کی جانب
مخاطب ہو کر بولے۔ تمہارے پاس بیٹا یہ بیٹی میری امانت
ہے۔ اسے کسی وقت تکلیف نہ دینا۔ اور اسے یہاں آنے
سے نہ روکنا۔"

دونوں تر آنکھوں کے ساتھ شاہی قید خانہ سے باہر نکل آئے۔ دوسرے
ہی دن محافظ کی رپورٹ آنے کے بعد دونوں کا بوریہ بستر رنگون سے
کلکتہ روانہ کر دیا گیا۔"

یہ واقعہ جناب عبدالحمید صاحب شملوی ایڈیٹر نئی روشنی کراچی نے
اپنے اخبار مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۵۷ء کے ایک مضمون میں لکھا ہے جس کتاب سے
انھوں نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کاش اس کا نام بھی لکھنے کی تکلیف
گوارا فرماتے تاکہ اس کے مستند ہونے کا ثبوت مل جاتا۔ ایسی حالت
میں یہ واقعہ ایک کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

انگریزوں نے لکھا ہے کہ ایام اسیری میں بہادر شاہ کے لئے
آٹھ کہار مہیا کر دئے گئے اور ایک گاڑی بھی دی گئی تھی۔ لیکن بہادر
شاہ کبھی باہر نہیں نکلے۔ کشف الاخبار ۱۸۔ دسمبر ۱۸۶۲ء کے شمارہ
میں انگریزی اخبار سے یہ خبر نقل کی تھی کہ بادشاہ اس کی بیگم دو بیٹوں
جواں بخت اور عباس اور ایک بیٹے کی بیوی کو کشادہ جگہ میں رکھا
گیا تھا۔ چلنے پھرنے کی اجازت تھی اس پر بھی بادشاہ اس مکان

میں رہتے تھے۔

بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے انتقامی شکنجے میں کستے کستے آخر اس حالت میں پہنچا دیا تھا کہ ان کے پوست استخواں پر سایہ کا گمان ہوتا تھا۔

بہادر شاہ کے جسم کے زخموں میں کیڑے پڑے ہوئے تھے

ایک انگریز سیاح جو پارلیمنٹ کا ممبر تھا وہ رنگون گیا۔ اس نے بادشاہ سے ملاقات کی اور جس حالت میں ان کو دیکھا۔ اس نے اپنے بیان میں اس کا اظہار کیا ہے۔ اس کا یہ بیان ایک گجراتی اخبار کے دیوالی نمبر صفحہ ۲۶ میں شائع ہوا ہے۔

"میں نے بہادر شاہ کو ایک کھری چارپائی پر پڑا ہوا دیکھا۔ ایک بوسیدہ اور پھٹا ہوا ٹاٹ انھوں نے اوڑھ رکھا تھا اوپر کے ٹاٹ کو ہٹا کر بادشاہ نے اپنے بازو دکھلائے جو لے بچھونے کی چارپائی پر پڑے رہنے کے باعث زخمی ہو گئے تھے اور زخموں میں کیڑے پڑے ہوئے تھے۔"

بہادر شاہ ظفر ان مصیبتوں کو سہتے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ اور موت کے منتظر رہتے تھے۔ یاد الٰہی اور استغفار میں مصروف رہتے تھے۔ آخر موت کا انتظار رہا۔ وہ قید فرنگ اور قید حیات کو ختم کرنے کے لئے، ۷ نومبر ۱۸۶۲ء مطابق ۱۴ جمادی الاول ۱۲۷۹ھ بروز جمعہ کو آئی اور نواسی سال کی عمر میں اپنا شکار بنا کر لے گئی۔ تاریخ وفات اردو اور فارسی میں کافی کہی گئیں[1]۔

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی اول ص۶۲۰

نداند ورد ہاتف بہر سالش — بہادر شاہ از دنیا برفت آہ

سراج دیں ابو ظفر نبیرۂ جنت بہار آشیانہ — کہ جس کے باعث منور تھی یہ جھلک پایا چراغ دہلی

جو تھے وہ دلی علم کا سال ہے سیاہ بھی مطابق اسکے — مرزا غیبی نے سال رحلت کہا بجھا چراغ دہلی

وفات کے آخر لمحوں میں بہادر شاہ ظفر کے پاس سوائے زینت محل، جواں بخت اور زوجہ جواں بخت اور ایک چھوٹی سی بچی کے کوئی موجود نہیں تھا جب حکام نے اجازت دی تو تجہیز و تکفین ہوئی۔ اسی بنگلے کے احاطہ میں دفن ہوئے، کچی قبر تھی۔ سرہانے بیری کا درخت تھا یہی درخت مدت تک مزار کا نشان بنا رہا۔ بہادر شاہ ظفر کو اپنے مزار کی جگہ بھی ایسی پسند تھی۔ قدرت نے پوری کرائی۔ ایک شعر میں اس کا اظہار کیا ہے

شاہوں کے مقبرے سے الگ دفن کیجیو — ہم بیکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

یہ احاطہ داس نام کے ایک انگریز نے ٹھیکے پر لے لیا تھا۔ اور بہادر شاہ ظفر کے مزار پر فاتحہ خوانی کی بھی ممانعت کر دی تھی۔ بہادر شاہ ظفر سے مولوی عبدالسلام کو بڑی عقیدت تھی۔ رنگون پہنچ کر مزار کو تلاش کیا واقف کاروں سے تصدیق کرائی۔ حکومت برما سے خط و کتابت کی تب کہیں جاکر قبر پر حسب ذیل مضمون کا انگریزی زبان میں کتبہ نصب کرایا۔

"دلی کا معزول بادشاہ بہادر شاہ، نومبر ۱۸۶۲ء کو رنگون میں فوت ہوا۔"

مرنے کے بعد اخبارات میں اس بات کا بھی چرچا ہوا کہ بہادر شاہ ظفر
نے نزع کی حالت میں دو وصیتیں کی تھیں۔

(۱) میت کو فی الحال سپرد زمین کیا جائے پھر اسے یہاں سے منتقل
کر کے دہلی پہنچا دیا جائے جہاں خاندانی مقبرے ہیں۔

(۲) میری اولاد کو قید سے آزادی دی جائے۔

دونوں وصیتیں انتہائی معقول تھیں۔ لیکن یہ انگریز سے کیسے
ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی کینہ پروری اور انتقامی جذبہ کو ختم کر دیتا۔

زینت محل صاحبہ کافی عرصہ اس بنگلہ میں رہیں۔ نہ معلوم کس مصلحت
کی وجہ سے ان کو دوسرے مکان میں منتقل کر دیا گیا۔ زینت محل صاحبہ
بے نیازی میں شوہر کی جانشین تھیں۔ بہادر شاہ کے انتقال کے بعد پانچ
سال تک کبھی حکومت کی طرف نگاہ نہیں کی ۱۸۶۷ء میں
پانچ سو روپے ماہانہ کا وظیفہ منظور ہوا۔ زندگی ہی میں اکلوتے بیٹے جواں بخت
کو زینت محل صاحبہ سے علیحدہ کر کے دہلی بھیجدیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۴ء
میں جواں بخت کا انتقال ہوا۔ اس غم نے ان کو بالکل گھلا دیا تھا۔ آخر
محلوں میں رہنے والی تنہا ۱۷ جولائی ۱۸۸۶ء کو فوت ہوئیں۔ انا للہ و
انا الیہ راجعون۔

گھوسیوں اور قصائیوں کے ساتھ بہادر شاہ نے ڈیرہ ڈال دیا

بہادر شاہ ظفر مرحوم مغفور

کے دل میں حمیت کا بہت خیال تھا۔ اور حق پسندی کو اپنا شیوہ بنا رکھا تھا

عدل و انصاف میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ رعیت کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھتے تھے اور اس کو حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

دہلی کے انگریزی حکام نے قصابوں کو حکم دیا کہ تم اپنی دکانیں بند کر دو۔ اور شہر کے باہر لیجاؤ۔ قصاب پریشان ہوئے۔ روٹی کا سوال تھا۔ سب نے مل کر اپنے گھر بار، بال بچوں کو لے کر شاہی محل پر جھروکے کے نیچے ڈیرہ ڈالدیا۔ فریاد کی۔ بادشاہ نے ان کی مصیبت سنکر حکم دیا کہ ہمارا ڈیرہ خیمہ بھی جمنا کے کنارے ان کے پاس لگا دو۔ یہ خبر رزیڈنٹ کو معلوم ہوئی تو بادشاہ کے پاس دوڑا ہوا آیا۔ اور عرض کی کہ حضور اگر ایسا کریں گے تو شہر خالی ہو جائے گا۔ اور آپ کے ہمراہ شہر کے لوگ نکل کھڑے ہوں گے۔

بادشاہ نے کہا جہاں میری رعیت وہاں میں، رعیت مثل میری اولاد کے ہے ان کو اپنے سے کیوں کر جدا کر دوں، کہیں گوشت بھی ناخن سے جدا ہوتا ہے۔ آج تو تم نے قصابوں کو شہر بدر کر دیا۔ کل نہیں معلوم کس قوم کو کرو گے۔ اسی طرح اگر سلسلہ چلا تو لازماً شہر خالی ہو جائیگا اگر تم کو شہر خالی کرانا ہے تو مجھ سے کہدو۔ شہر کے لوگوں کو ہمراہ لے کر چلا جاؤں۔ رزیڈنٹ نے کہا آپ ایسا خیال نہ فرمائیں۔ ابھی ان لوگوں کو شہر میں آباد کرتا ہوں۔

کچھ عرصے کے بعد گھوسیوں کو بھی انگریزی حکام نے حکم دیا کہ تم

اپنی گائیں اور بھینسیں لیکر شہر سے نکل جاؤ۔ یہ لوگ بھی مع بال بچوں اور گائیں بھینسوں کے ریتی پر آپڑے۔ بادشاہ کو کہاں تاب تھی کہ زیادتی کو دیکھ سکیں پھر اپنا خیمہ ریتی میں لگا دیا۔ اور ریزیڈنٹ سے صاف طور پر کہدیا۔ کہ میری موجودگی میں میری رعیت کو گھر سے بے گھر نہ کرو۔ بعد میرے تم کو اختیار ہے کہ دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادو۔[1]

ہندو مسلمانوں میں ظفر امتیاز جائز نہیں رکھتے تھے

ہندو، سکھ عیسائی اور

مسلمان ان کے نزدیک برابر تھے۔ چنانچہ ان کا مقولہ تھا۔ جیسے مسلمان میری آنکھ میں۔ ویسے ہی دوسری آنکھ ہندو ہیں۔ اسی طرح رعیت کی خواہ مسلمان ہو یا ہندو ہو خوشی و راحت و دکھ درد کے شریک ہوتے تھے جب کنور سالگ رام کے لڑکے کنور گوپال کی شادی ہوئی تو بادشاہ نے خلعت فرخ سیری۔ جامہ، کمربند، سہرا کلغی روانہ فرمایا۔ اور کنور کا لقب دیا۔ اور حکم دیا کہ شاہی خرچہ سے کنور گوپال سنگھ کی شادی کا جلوس شاہانہ تزک واحتشام کے ساتھ نکالا جائے

کسی کی حق تلفی کی جائے بادشاہ کو گوارا نہیں تھی۔ خواہ وہ کسی بڑے سے بڑے آدمی حتی کہ وزیر سے سرزد ہوجاتی تو اس سے بھی جواب طلب کر لیتے تھے۔

ملازموں کی تنخواہیں کیوں نہیں دیں وزیر سے جواب طلب

نواب

[1] دلی کی جان غدر صفحہ ۳۷

حامد علی خاں وزیر شاہ تھے۔ ان کے متعلق بادشاہ کے پاس شکایتیں آئیں کہ ملازمین کی تنخواہ ٹھیک طور پر تقسیم نہیں ہوتیں۔ تو آپ نے فرمایا مرزا شاہرخ کو حکم دیا کہ نواب حامد علی خاں سے کہنا تنخواہوں کی رسید کے کاغذات ہمارے ملاحظہ کے لئے پیش کریں۔

ایک مرتبہ کنور رنگت سنگھ کی عرضی بادشاہ کے پاس آئی کہ میرا چھ ہزار روپیہ پیشکار مرزا تیمور شاہ کے ذمے نکلتا ہے۔ ان سے تاکید کیجائے کہ وہ جلد روپیہ ادا کردیں۔ بادشاہ نے اس عرضی پر کنور صاحب کو تحریر کیا کہ حساب کے کاغذ ہمارے پاس بھیجدو۔ اور ایک شقہ مرزا صاحب کو لکھا کہ تمہارے قرضخواہ ہم کو عرضیاں بھیجتے ہیں۔ تم کو چاہیئے کہ اپنا قرضہ خود ادا کرو۔ ورنہ تمہاری تنخواہ قرضداروں میں تقسیم کردی جائیگی۔

اسی طرح ولیعہد کی شکایت پہنچی تو بادشاہ نے ان کو شقہ بھیجا کہ بیگم مرزا شاہرخ بہادر مرحوم نے نالش کی ہے کہ ولیعہد کے ملازمین ہمارے آدمیوں کو گلابی باغ میں آنے جانے سے روکتے ہیں۔ لہذا تم کو چاہیئے کہ تم اپنے نوکروں کو سمجھا دو کہ یہ بات اچھی نہیں ہے۔ اس طرح رنگ سے ان کی حق تلفی ہوتی ہے جو بادولت کی ناخوشی کا بھی باعث ہے۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو مجھے تمہیں باغ کی تولیت سے سبکدوش کرنا پڑیگا میں کوئی بات ایسی کرنی نہیں چاہتا جو حق و انصاف کے خلاف ہو۔

موجودہ جمہوری دنیا کے مقابلہ میں بادشاہی	ملزم پکڑا نہ جائے تو خواجہ سرا کو بند کردو

دور میں جرائم کم ہوتے تھے۔ اس لئے کہ ان بادشاہوں کا طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی جرم ہوتا تو اس کی ذمہ داری متعلقہ حکام پر ڈال دی جاتی تھی جب تک جرم کا پتہ نہیں لگتا اس کو قید میں ڈال دیا جاتا تھا چنانچہ بہادر شاہ بھی یہی طریقہ اختیار کرتے تھے۔

۱۸۵۲ء کا واقعہ ہے کہ مرزا رحیم بخش جو جعلسازی کے جرم میں نظر بند تھے وہ موقعہ پا کر بھاگ گئے۔ بادشاہ نے مجسٹریٹ کو لکھا کہ اس کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا جائے اور اس کی تلاش میں چاروں طرف سپاہیوں کو متعین کر دیا جائے۔ ناظر قلعہ اور سپاہیوں کو حکم ہوا کہ خواجہ سرا اور پیادے جو چوکی پر نگرانی کے لئے مقرر تھے ان کو قید کر لیا جائے۔ اگر مرزا رحیم بخش گرفتار ہو جائیں تو ان کو رہا کر دیا جائے[1]

بیوی کا زیور بیچکر سپاہیوں کو دینا

بہادر شاہ کو اپنی رعایا سے بے پناہ محبت تھی جب بادشاہی سپاہیوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں دلی کے مہاجنوں اور مسلمان دولتمندوں کو بہت تنگ کیا تو بادشاہ نے ان سے تین مرتبہ فرمایا۔ کہ میرا اور میری بیوی کا تمام زیور لے کر اپنے کام میں لاؤ۔ اور میرے شہر کو مت ستاؤ[2]

بہادر شاہ ظفر کا اچھے شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔ ولیعہدی کے زمانہ میں آپ شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے۔ شاہ نصیر جب دکن چلے

[1] بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱ [2] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ صفحہ ۲۶۰

گئے تو حضرت ذوقؔ مرحوم اور مرزا غالب رحمۃ اللہ علیہ کی بنا کلام دکھانے لگے تھے۔

آپ کے کلام میں نازک خیالی اور روشن خیالی پائی جاتی ہے کثرت کے ساتھ آپ کے اشعار موثر ہیں دلوں کو تڑپا دینے میں۔ میر تقی میرؔ مغفور کا رنگ آپ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ نے دہلی میں بھی ایک سال زمانہ اسیری گذارا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ کی غزلوں کا انتخاب پیش کیا جائے۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا سینہ غم سے فگار ہے

جو شہر دہلی یہ تھا چمن سب طرح کا یاں تھا امن
وہ خطاب اس کا جو مٹ گیا فقط ایک اجڑا دیار ہے

یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہوں کیسی ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے

شب و روز پھولوں میں جو تلیں بھلا خارِ غم کو وہ کیا سہیں
گلے میں طوق، پاؤں میں بیڑیاں، کہاں گل کے بدلے یہ ہار ہے

جو سلوک کرتے تھے اور سے، ہیں وہ دیکھو اب بُرے طور سے
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے، رہا تن پہ ان کے نہ تار ہے

یہ ستم کسی نے کبھی سُنا، دی ہے پھانسی لاکھوں کو بے گناہ
وہی کلمہ گویوں کی طرف سے ابھی ان کے دل میں غبار ہے

یہ حال تنگ جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرت رب کا ہے
یہاں بہار میں تو خزاں ہوئی، وہاں خزاں انہوں کو بہار ہے

نہ دبایا زیر چمن انہیں، نہ دیا ہے گور نہ کفن انہیں
نہ کیا کسی نے دفن انہیں، بے ٹھکانا ان کا مزار ہے

جسے غم دیا ہے برملا، خوشی بھی وہ دے گا وہی خدا
اسے ہر بشر ہے جانتا کہ خزاں کے پیچھے بہار ہے

کیا ظفر وہ ڈر تجھے حشر کا، جو خدا رکھے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسول کا وہ تیرا حامی کار ہے

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے وہ اک مشت غبار ہوں

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں اور آ کے پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں کہ میں بیکسی کا مزار ہوں

کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہار حسن دکھا گئے
میرے دل کو داغ لگا گئے، یہ نیا شگوفہ کھلا گئے

یہی ہے دعا نہ آئے دل کوئی بیوفا نہ ستائے دل
وہ جو سمجھتے تھے دوا ملائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

اجی پوچھتے ہو کس کے گھر ہم ہی عاشقوں کے ہیں تو گھر
انہی بستی والوں کے ہیں گھر جو تمہارا ظلم اٹھا گئے

میرے پاس رہتے تھے دم بدم، جدا نہ ہوتے تھے ایکدم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم، وہ ہمیں سے آنکھ چرا گئے

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامن باد نے سر شام ہی سے بجھا دیا
مجھے دفن کر چکو جس گھڑی تو یہ کہنا کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشق زار تھا تہ خاک اس کو دبا دیا
پس مرگ قبر پہ اے ظفر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں سے مٹا دیا

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے — بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے
نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی — خوشی سے آئے تھے روتے اس انجمن سے چلے

نہیں حال دہلی سنانے کے قابل — یہ قصہ ہے رونے رلانے کے قابل
اجاڑے لٹیروں نے وہ قصر اسکے — جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل
نہ گھر ہے نہ در ہے رہا اک ظفر ہے
فقط حال دہلی سنانے کے قابل

شہید شعراء

آغا مرزا آغا جان دہلوی

آغا مرزا آغا جان۔ عرف آغا صاحب، دہلی کے باشندے تھے۔ اصل میں عیسائی تھے۔ فہم و فراست میں انتہائی تیز تھے[1]۔ مگر اپنے استاد سید محمد امیر پنجہ کش کی ہدایت و تلقین سے مسلمان ہو گئے تھے۔ پکیتی پٹے میں بھی وہ کمال حاصل تھا کہ بڑے بڑے استاد ان کے سامنے ہیچ نظر آتے تھے۔ خوشنویسی میں ایسی مہارت حاصل کی تھی کہ میر پنجہ کش کے شاگردوں میں ان سے بہتر کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ سر سید مرحوم آثار الصنادید میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ صاحب کمال شاگرد رشید سید امیر صاحب مرحوم کے اور اس ضمن میں ایسا کمال بہم پہنچایا کہ استاد کو ان کے کمال پر ناز ہے۔ اور اس فن کی تکمیل کے سبب اساتذہ سلف سے ممتاز ہیں۔ علاوہ اس کے فن پکیتی میں اقران روزگار سے گوئے سبقت لے گئے۔ اور اہلیت و صلاحیت ایسی ہے جس کا بیان نہیں"۔

---

[1] تاریخ تحفہ راجستھان ص ۴۸۲

کچھ عرصہ ریاست جھجر میں ملازم رہے تھے۔ وہاں نواب صاحب نے ایک لاکھ روپیے کے عوض سے ایک نہایت بیش بہا اور قابل قدر گلستان ان سے لکھوائی۔ پھر الور میں ملازم ہوئے۔ ویسی ہی دوسری گلستان پچاس ہزار روپیہ لاگت کی بنے سنگھ والیٔ الور کی ایما پر لکھی دونوں نسخے خوشخطی اور خوبیٔ نقش و نگار کے باعث عدیم النظیر ہیں جھجر والی گلستاں مہاراجہ منگل سنگھ مرحوم والیٔ الور نے خرید کر دوران سیاحت پنجاب میں ۱۸۷۰ء میں مہاراجہ راجندر سنگھ مغفور والیٔ پٹیالہ کو بطور ہدیہ دی تھی۔ دوسرا نسخہ اب تک الور کے کتب خانہ کی زینت ہے۔ اس پر متعدد نمائشوں میں تمغہ بھی ملا ہے۔

الور کے مہاراجہ بنی سنگھ نے آغا صاحب کو مکیتی کا استاد بنا دیا تھا۔ یہ فن وہ ان کو سکھاتے تھے۔ مہاراجہ صاحب ان سے محبت کرتے تھے اور ان کو قابل اعتبار سمجھتے تھے۔ ان کو دیوانی کے کاموں کے لئے ایک قابل و دیانتدار آدمی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مہاراجہ نے ان سے مشورہ کیا۔ انھوں نے نواب امین الدین عرف منشی عمو جان کا نام تجویز کیا۔ حکم کے مطابق منشی عمو جان دہلی سے طلب ہوئے۔ منشی عمو جان سنجیدہ اور متین و لائق انسان تھے۔ انہیں عہدہ دیوانی پر مقرر کیا گیا۔[۱]

آغا صاحب آخر عمر کے حصہ تک ریاست الور میں ملازم رہے ایام غدر ۱۸۵۷ء میں یہ دونوں استاد میر پنجہ کش اور شاگرد آغا صاحب

[۱] آئینہ تاریخ المعروف مرقع الور صفحہ ۱۲۳

گوروں کے ہاتھ سے گولیاں کھا کر راہی ملک بقا ہوئے۔ آغا صاحب کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ دو شعر دستیاب ہو سکے[1]

کوئی دارا کوئی جم کوئی اسکندر ہوا ۔۔۔ داغ سر اپنا ہمیں نام خدا افسر ہوا
سرخ ہے رو باف قاتل آج دیکھا چاہیئے ۔۔۔ قصد اس قاتل کا اب ہے کس کے خنجر پہ ہوا

احمد، مرزا احمد بیگ دہلوی

مرزا احمد بیگ ابن عاشور بیگ مرزا فاضل بیگ کے چچا زاد بھائی تھے علم تسخیر و عملیات کے مانے ہوئے عامل تھے۔ چنانچہ صاحب گلستانِ سخن ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مرد خوش خلق، نیک اطوار، عزائم خوانی و تسخیر اجنہ میں مشہور ہے روزانہ اثری اعمال میں السنہ خلائق پر مذکور ہے"۔

کبھی کبھی موزونی طبع کی وجہ سے فکر سخن بھی کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے دوران حکومت انھوں نے نشو و نما پائی تھی۔ اپنے والد ماجد مرزا عاشور بیگ کے ہمراہ فرنگیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے اور شہادت کا درجہ پایا[2]۔

انھی اپنی گور سے سب کہتے ہیں اٹھا ۔۔۔ اس خرام ناز سے کیا فتنۂ محشر اٹھا
پاؤں پھیلا کے ہے ہر محفل میں کینہ در کر ۔۔۔ محفل اشتاکی دل الفت سے طرح بستر اٹھا

---

[1] مرقع خاندان بابر، جلد اول ص ۹۹ [2] کارنامۂ سروری ص ۱۱۱

کس کی مژگاں کا الٰہی ہے مرے دل میں خیال | کہ کھٹکتا ہے مرے سینے میں اک خار نیا
بنے جو خاک اس کوچے میں تو یہ آبرو اپنی | لگے سو بار قدموں سے لگے سو بار دامن سے
ہنگام نزع میں بھی ہمیں انتظار تھا | آتا ہے یا نہیں وہ ستمگار دیکھئے

آشتی مرزا غلام محی الدین دہلوی

مرزا غلام محی الدین عرف مرزا امن کے والد مرزا غلام حیدر تھے اور حضرت شاہ عالم مرحوم کے آپ نواسے تھے۔ قلعہ دہلی میں رہتے تھے۔ شروع میں فخر الشعرا میر نظام الدین ممنون سے مشورہ کرتے تھے اس کے بعد مفتی محمد صدر الدین صاحب آزردہ سے استفادہ کیا۔[1] خوش فکر طبع رسا رکھتے، ذہن سلیم تھا۔ اطوار حمیدہ، عادات پسندیدہ ان کی ذات میں پائی جاتی تھی۔ قد لمبا تھا۔ سفید پوش رہا کرتے تھے۔ صورت پر تقدس برستا تھا۔[2]

۱۲۶۱ھ میں ان کی چالیس برس کی عمر تھی۔ شہزادوں کے ساتھ غدر میں شہید ہوئے۔[3] آپ کے کلام میں ایک خاص لطف پایا جاتا ہے زبان سلیس اور شستہ ہے ؎

کب دل سے چھٹے عشق تری زلف دوتا کا | دام ازلی وہ یہ گرفتار سدا کا
کیا پاس کسی کا ہے کہ مرتا ہوں ولیکن | شکوہ نہیں کرتا شب ہجراں کی جفا کا

۱ سخن شعرا صفحہ ۱۳ ۲ طبقات الشعرا صفحہ ۴۲۲ ۳ خمخانہ جاوید صفحہ ۴۲

قسمت تو دیکھو پھر آنا مہ بر اس دم ۔ جس وقت مرے سر پہ تقاضا ہی قضا کا

لے آئے تو نہ دشمن کے خطرے سے مرے گھر میں ۔ اے رمغنت میں بدنام کیا نام حنا کا

سجدے میں گرے دیکھ کر تصویر بت اس کی

معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ریا کا

قبر میں بھی سوز غم تیرا لگا کر لے گئے ۔ داغ ہم سینے کا سینے میں چھپا کر لے گئے

صبر تھا امانت بھی دل تھا کیا ہمارا پاس تھا ۔ ہوش باقی تھا سو کل وہ بھی تمام کر لے گئے

حشر کو کھینچے لگا کیا گر اب دم بسمل یہاں ۔ دامن اپنا میرے خون سے تم بچا کر لے گئے

گو رقیبوں سے چھپاتے پر ہمارا مدعا

وہ نگاہوں کی نگاہوں میں جتا کر لے گئے

احوال ہمارا نہ عبث پوچھ مسیحا ۔ یہ درد ہے دل میں کہ بیاں کر نہیں سکتے

کیوں حسرت ابیں پوشیدہ نہیں آپ پہ ہیں جی ۔ آہیں تو تہ تیغ بے اندازہ گماں کر نہیں سکتے

ایجاد۔ شاہزادہ مرزا رحیم الدین

شاہزادہ مرزا رحیم الدین مرزا حسین بخش کے صاحبزادے تھے بڑے خلیق، ملنسار، آزاد منش، ظرافت پسند، بذلہ گو نوجوان تھے۔ مرزا قادر بخش صابر ان کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"طبیعت مضمون خیز، چاشنی سخن انگبیں ریز، بنائے کلام استوار، گوہر الفاظ آبدار، دل الفت پیوند، قدم راہ

صدق و صفا میں سرگرم"۔

صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر کے تلمیذ رشید تھے۔ ان سے قرابتداری بھی تھی۔ مولینا امام بخش صہبائی کی نظر التفات آپ پر خاص تھی۔ اکثر غزل کی اصلاح وہی فرماتے تھے۔

غدر کے زمانہ میں ۳۵ یا ۳۶ برس کی عمر میں پھانسی پائی۔ فن سخن میں طبیعت نہایت رسا، عالی تھی۔ کلام میں تاثیر ہے اور پر درد ہے[1]۔

بتخانہ میں تھا یا کہ میں کعبہ کے قریں تھا — اے زاہد نادان تجھے کیا میں کہیں تھا
ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا — پر دل وہ بلا ہے کہ جہاں تھا وہ وہیں تھا
دیکھو تو مری ضد کہ کسی شب وہ ستمگر — آیا بھی تصور میں تو دشمن کے قریں تھا

وہ دن میں ہوا حال یہ اسکا کہ مری جاں
دیکھا تو وہ ایجاز ہی گویا کہ نہیں تھا

شب جا کے وہاں اپنا تو کچھ دل سا بھر آیا — سب تجھ تری محفل میں کہ ایجاز نہیں تھا

اس محفل میں کھولیں گے جو زنداں سے کے نہ در کو
مرجائیں گے دیوانے، ترے پھوڑ کے سر کو
یہ باتوں میں بہلائے وہ دل چھین کے لیجائے
کیا یاد دیں ہم صبر کو تیری اندر نظر کو
ہم کو نہ اٹھا بزم سے ابھی کہ میری جان
ہم آپ ہی بجھ جائیں گے جوں شمع سحر کو

---

[1] خمخانۂ جاوید اول صفحہ ۲۳۵

لگے ہم سے نظر اپنی چرانے — نہ سمجھے جس گھڑی لطفِ نظر کو
سبب سمجھا جو بیماری کا نہ شوخ — نہ آیا پھر کبھی میری خبر کو
نظر کی برق مجھ پر ہی گرے گی — نہ دیکھے گو ادھر کیا اُدھر کو

کتنا ہی کروں خشک یہ دامن تر ہے — خجلت سے ہوا جاتا ہے نم اور زیادہ
کرتے ہیں میرا چارۂ غم جس قدر ایجاد
اتنا ہی یہ ہوتا ہے الم اور زیادہ

بسمل عبدالحکیم دہلوی

بسمل صاحب کا نام عبدالحکیم اور ان کے والد کا نام حکیم پیر بخش تھا آپ شہید فرنگ امام بخش صہبائی کے برادر زادۂ حقیقی تھے۔ حکیم پیر بخش اپنے زمانہ کے مشہور حکیم اور فن طب کے ماہر مانے جاتے تھے۔

بسمل صاحب نے علم طب اپنے والد ماجد سے حاصل کیا تھا فن سخن میں حضرت صہبائی سے اصلاح لیتے تھے۔ اس فن میں ایسا ملکہ حاصل کیا تھا کہ ان کے طبائع و ذہانت کے سب ہمعصر معترف تھے۔ کلام میں صفائی، شستگی، بندش کی چستی، نزاکت خیال و معانی اور رسائی ذہن میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے ایک ہمعصر صاحب گلستان سخن مرزا قادر بخش صابر ان کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اس کے کلام جوہر نظام میں خوبیٔ معنی، خوش اسلوبی ترکیب
شائستہ تشبیہہ اور حسن استعارہ حدِ طاقت بشری سے باہر
ہے۔ اللہ تعالیٰ یوماً فیوماً جودتِ ذہن اور قوتِ طبع میں
افزائش کرے۔"

علامہ ان علمی کمالات کے جوان وجیہہ، فصیح زبان صاف دل پاک
طینت اور ثمرۂ جوانی سے متمتع تھے۔ نہایت ستودہ صفات اور پسندیدہ
اطوار تھے، فارسی کے بہترین ماہر تھے۔ اردو ان کے گھر کی لونڈی اور باندی
تھی۔ اس خاندان کے علم کی روشنی سے تمام ہندوستان مستفیض و مستفید
ہو رہا تھا۔ غدر میں نوعمر تھے۔ اپنے چچازاد بھائیوں اور چچا کے ساتھ
گوروں کے ہاتھوں مارے گئے۔ کیا معلوم تھا کہ ان کا یہ شعر ان کے
حسب حال ہوگا۔[1]

قفس کے گر میرے نزدیک گلستاں ہوتا	نوائے بلبل دلسوز سے چمن تو آجاتی

نمونۂ کلام

نہ اتنا بدگماں ہو تو تڑپیں گے نہ تڑپینگے	خدا کے واسطے منہ کھول زخم دل نمکداں کا
دیکھ دیوانہ بتوں کو تو دل اپنا بس نہ تھا	یہ وہ ہیں جن کے کوئی ہاتھ سے جانبر ہوا
شب فرقت میں آئے اجل شتاب کہیں	کہ کر رہے ہیں عدم زادے انتظار اپنا
قصہ سنے ہے کون عذاب و ثواب کا	ساقی شتاب دے مجھے ساغر شراب کا
ہے آج کون بام پہ جلوہ نما جو یوں	اڑتا ہے رنگ میری طرح ماہتاب کا

[1] خم خانۂ جاوید جلد دوم

گر دیں گے ہم زمانہ پیری کو حشر تک — اب کیوں نہ مے پئیں کہ ہے عالم شباب کا
انداز گر یہی رہے ظالم ترے تو گھر — اُجڑے گا آج کل کسی خانہ خراب کا

حضرت بسملؔ کی حالت دیکھکر بولا کوئی — پیر و مرشد خیر تو ہے آپ کو یہ کیا ہوا

عاشقوں پر تیرے کب حشر بپا نہ ہوا — اک قیامت ہو گئی ظالم ترا چلنا ہوا

تا عمر پھر آئے یوں کہ خدا خیر ہی کرے — میری طرح سے بچھڑے اپنی خبر نہیں
تاثیر شوق کی مرے حق میں ہوئی یہ زہر — ٹکتا زمیں پر قدم نامہ بر نہیں
سن کر مرے فسانہ ہجراں کو یہ تنگ — جیب تھا نہ اس طرح سے کہ گویا خبر نہیں
ہر ہر جگہ ہے بسملؔ شوریدہ سر کی دھوم — تیرے جگر فگار کے چرچے کدھر نہیں

اے بلبلان باغ رہائی سے فائدہ — سر پر خزاں بھی آگئی جب ہم رہا ہوئے
بسملؔ ان ہی کی یاد میں سب کچھ بھلا دیا — ناداں یہ صنم نہ ہوئے کچھ خدا ہوئے

شیخ مے کو بُرا بتاتے ہو — اسکا تم کو مزا چکھائیں گے ہم
ناصحا توبہ، لے خدا کا نام — دل لگانے سے باز آئیں گے ہم

کھلیگا جس جگہ حق ہم وہیں جھکا دینگے — نہ ہم کو ربط کچھ کافر سے نے نفرت مسلماں سے

ثنائی مرزا عاشور بیگ دہلوی

مرزا عاشور بیگ، مرزایان دہلی سے تھے۔ ان کے والد مرزا اکبر بیگ اور دادا مرزا جیون بیگ تھے۔ ان کے والد عربی فارسی کے ماہر تھے۔ سیاح تھے۔ اور علوم ریاضیات ہیئت و ہندسہ وغیرہ کے

علاوہ فن نجوم و رمل میں یدطولیٰ رکھتے تھے اور ان علوم کی تکمیل کی غرض سے دور دراز ملکوں میں سفر کیا تھا حتیٰ کہ اس زمانہ میں حج زیارت کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔ براہ مصر اطالیہ پہنچے اور وہاں علم ریاضیات حاصل کیا۔ وہاں سے مغرب اقصیٰ کی سیر کرتے ہوئے حیدرآباد دکن واپس آئے۔ مہاراجہ چندو لال کے ہاں مہمان رہے۔ ان سے رخصت ہو کر دہلی واپس ہوئے اور اپنے مکان شیش محل میں گھنٹہ گھر کھڑا کیا۔ جو اس وقت تمام ہندوستان میں کہیں نہیں تھا۔ مرزا اکبر بیگ کے مرزا عاشور بیگ مرزا عباس بیگ اور نواب آغا مرزا تین صاحبزادے تھے۔

مرزا عاشور بیگ بھی ایک عالم دین تھے۔ عربی و فارسی میں یکتا اور علوم ریاضیہ ہیئت و ہندسہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے نہایت حسین و جمیل تھے۔ بہت گورا بلکہ بھورا رنگ تھا۔ آنکھیں سنہری مائل کربخی ریش و بروت دونوں سر کے بھورے اور سنہرے تھے۔ قد نہایت بلند و بالا تھا۔ دوہرا جسم کسرتی سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ غصہ ان کے مزاج میں بلا کا تھا۔ تمام اہل خاندان میں سوائے مرزا نوشہ (غالب) کے سب ان سے مرعوب تھے۔

باوجود وفور علم کچھ ذرا سی جنون کی لٹک تھی جس چیز کا شوق کرتے تھے اس میں محو ہو جاتے تھے۔ اور اس کو انتہا تک پہنچا دیتے تھے اور یہ کا شوق ہوا تو معاجین، جوارشات و حبوب وغیرہ شیشوں میں بھری طاقوں میں دھرے رکھتے تھے۔ اور یہ سب خود تیار کرتے تھے۔

کیمیا کا شوق ہوا تو ہجوم کیمیا سازوں کا باہر دیوان خانہ میں شب و روز
جمع رہتا تھا - اور یہ سب قورمہ پلاؤ. کباب، حلوے، مربے وغیرہ
مزے مزے کے کھانے کھاتے تھے - ہر قسم کے ست اور کشتے تیار ہوا
کرتے تھے۔

ایک دن مرزا عاشور بیگ بہت خوش اپنی والدہ کے پاس
پہنچے اور والدہ کو ایک چھوٹا سا ٹکڑا چاندی کا دکھایا کہ یہ ہم نے
بنایا ہے۔ اس چاندی سے ایک تختی نقش کندہ نواب آغا مرزا
خاں بہادر سرور جنگ مرحوم کے گلے میں ڈالی یہ اُن کے بھتیجے تھے۔
اس طرح شیشہ گری کا شوق ہوا تو ہر قسم کے ظروف بنا ڈالے۔ شاہ
رفیع الدین کے مرید ہوئے تو تمام رات ہو حق کے نعرے لگاتے رہتے۔[1]

سنہ ۱۲۴۵ء کا واقعہ ہے کہ دہلی میں بنارس کا ایک برہمن آیا ہوا تھا
جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ چھپے ہوئے خزانے اور دفینے کا عامل
بتا دیتا تھا۔ مرزا عاشور بیگ کو جب اس برہمن کا علم ہوا تو انھوں
نے اس کو بلایا۔ اور بتایا کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ ہمارے
اس مکان میں دفینہ ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ کس جگہ ہے آپ
بتائیے کہ کہاں ہے۔ برہمن نے حساب لگایا۔ اور ایک جگہ بتائی۔
چند گز زمین کھودی گئی۔ تو بارہ ہزار روپے اور ایک ہزار اشرفی نکلی
برہمن کی بڑی شہرت ہوئی۔ اور مرزا عاشور بیگ مالا مال ہو گئے۔[2]

[1] کارنامہ سروری صفحہ ۲۲ - [2] بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۵

مرزا عاشور بیگ بہادر اور دلیر انسان تھے۔ ان کے دل میں وطن کی محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ غلامی کی لعنت ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایام میں دستار و کمر بستہ بہادر شاہ ظفر کے پاس گئے۔ ان سے فوج طلب کی۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم کو شوق جنگ ہے تو فوج کے امیروں سے معاملہ کر لو۔ چنانچہ فوجی افسر تیار ہو گئے۔ یہ ایک دو پلٹن لے کر شہر سے باہر نکلے۔ "بانک پربت" پر گوروں سے مقابلہ ہوا۔ کئی چھکڑے غنیمت کا مال لیکر گھر واپس کئے۔

جس دن انگریز شہر پر حملہ آور ہوئے۔ اور کشمیری دروازہ پر قابض ہو گئے۔ تو اہل شہر بد حواس اور سراسیمہ گھر سے نکلکر بھاگنے لگے تھے۔ اس وقت نواب ضیاء الدولہ مع اپنے ملازمین اور چند جوان فرزندوں کے ماکین کے کوچے میں چلے آئے کہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں نواب ضیاء الدولہ وغیرہ نے چاہا کہ سب مستورات، بیگمات و بیبین ذکور و اناث شہر سے نکل جائیں۔ اس لئے کہ انگریز شہر میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ مگر مرزا عاشور بیگ راضی نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو علوم نجوم رمل پر بڑا ناز تھا اور یہ حکم لگا رکھا تھا کہ انگریزوں کو شکست ہو گی۔ مرزا احمد بیگ جوان کے صاحبزادے تھے یہ بھی رمل و نجوم سے واقف تھے۔ اور اپنے والد کے ان علوم میں شاگرد تھے۔ انھوں نے والد صاحب سے اجازت لے کر قرعہ ڈالا تھا۔

اور یہ حکم لگایا تھا کہ فلاں روز انگریز شہر میں داخل ہوں گے۔ مرزا عاشور بیگ نہایت برافروختہ ہو گئے۔ اور بیٹے سے کہا افسوس تو ان فنون میں ابتک نالائق رہا۔

جب سنا کہ انگریز شہر میں داخل ہو گئے ہیں تو مرزا عاشور بیگ مع اپنے فرزند اکبر مرزا احمد بیگ و دیگر عیال و ملازمین اور نواب ضیاء الدولہ مع اہل و عیال سب ہتیار بند و کمر بستہ چاندنی چوک میں آ گئے بڑھے تھے کہ سامنے سے گوروں کی جمعیت نظر آئی۔ آگے آگے اس کے سرتھیا فلس مکانات جلاتا آ رہا تھا۔ اس نے فوراً سب کو گھیر لیا۔ مرزا احمد بیگ نے تلوار میان سے نکالی۔ مگر ان کے والد نے ان کو منع کر دیا۔ اور کہا کہ بس اب شہادت کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اور کلمۂ توحید کا ورد کرو۔ سر تھیا فلس نے مردوں کی رسن بستہ قطار کھڑی کر دی اور مارنے کا حکم دیا۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ اسی وقت ایک انگریز نے ضیاء الدولہ کا ہاتھ پکڑ کر اس زور سے گھسیٹا کہ وہ زمین پر گر پڑے۔ باقی رسن بستہ قطار مثل مرغان مذبوح لوٹنے لگے۔ نواب ضیاء الدولہ مع عورتوں اور بچوں کے بچ گئے[1]

مرزا عاشور بیگ کشن گنج تیلی واڑے میں دفن کئے گئے۔ مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں اپنے شہید دوستوں کے ساتھ ان کا بھی ذکر کیا ہے لکھتے ہیں۔

---

[1] کارنامہ سروری۔

"غم مرگ میں تلعۂ نامبارک سے قطع نظر کرکے اہل شہر کو گنتا
ہوں میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا اسکا
بیٹا احمد مرزا انیس برس کا بچہ، مصطفٰی خاں ابن اعظم الدولہ
اس کے دو بیٹے ارتضٰی خاں اور مرتضٰی خاں، قاضی
فیض اللہ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا۔

مرزا عاشور بیگ عربی کے مانے ہوئے شاعر تھے۔ اردو میں تو کہتے ہی
نہیں تھے۔ فارسی میں کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ ایک شعر ان کا
گلستان سخن میں درج ہے [1]

از جفائے تو خزاں بر سر ما غم زدہ اند
از ستم ہائے خزاں بحر اغم زدہ اند

خضر۔ مرزا خضر سلطان دہلوی

مرزا خضر سلطان دہلوی بہادر شاہ ظفر کے سب سے چھوٹے صاحبزادے
تھے۔ یہ وہی خضر سلطان ہیں جن کی پیدائش پر غالب نے کہا تھا [1]

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

جب انگریزوں نے دہلی پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے پے در پے
کوشش کی اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں انگریزوں سے مقابلہ

---

[1] گلستان سخن ص۱۸۳

مقابلہ ہونے لگا تو ہر ایک شہزادے نے خواہ وہ اصول جنگ سے واقف نہیں تھا۔ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔

چنانچہ ایک روز بہادر شاہ صبح کو دیوان خاص میں چاندی کی کرسی پر رونق افروز ہوئے درباری اہلکار اور عمائدین شہر اپنے اپنے قرینے سے کھڑے ہوئے۔ مرزا ظہیر الدین عرف مرزا مغل خلعت فاخرہ اور خطاب سپہ سالاری سے سرفراز کئے گئے۔ اور مرزا ابوبکر مرزا فخرو مرحوم کے بیٹے کو باغیوں کے کل سواروں کی افسری دی گئی، مرزا خضر سلطان کو پلٹن ہاٹ کی کرنیلی دی گئی اور محمد بختاور شاہ الگزنڈرا پلٹن کے کرنیل مقرر ہوئے۔ مرزا عبداللہ کو پلٹن بیلی کی افسری ملی۔ اور مرزا قویاش پلٹن کی کرنیلی پر مامور ہوئے۔ اور مرزا عبداللہ پسر مرزا شاہرخ مرحوم کو پلٹن جایسر کی کرنیلی مرحمت ہوئی۔ اور مرزا معین طبو پلٹن کپتن کی افسری پر متعین ہوئے۔ اور نواب محمد حسن خاں مرزا خضر سلطان کے نائب ہوئے۔ اور مرزا معین حسن صاحب کو مرزا مغل کی نیابت سونپی گئی۔ اور میر نواب یاقوش کے نائب بنائے گئے۔

۱۰ مئی کو میرٹھ میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی۔ ۱۱ مئی کو محبان وطن دہلی پہنچے اور دشمنان ملک کو پریشان کرتے رہے کافی دنوں تک چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔

اچانک یکم جون ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت تلنگوں کے لشکر میں خبر پہنچی کہ گوروں کی فوج غازی آباد کے میدان میں جمع ہوئی ہے

یہ سنکر ادھر سے مرزا خضر سلطان، مرزا عبداللہ، میر نواب اور میر محسن خاں تین چار
چھ سو سوار اور چھ توپیں اور بہت سا میگزین لیکر مقابلے کے لئے روانہ ہو گئے۔
ان لوگوں نے ہینڈن ندی کے پل کے قریب مقام کیا۔ لوگ ابھی اپنے
مورچے بھی قائم نہ کرنے پائے تھے کہ انگریزی فوج نے تابڑ توڑ گولے اور
گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ تلنگوں کی فوج ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی
تھی کہ مستعد ہو کر مقابلہ میں ڈٹ گئی۔ پھر تو دونوں طرف سے گولوں
اور گولیوں کا وہ مینہہ برسا کہ الہی توبہ۔ تمام میدان دھواں دھار ہو گیا
اتفاقاً انگریزی سپاہیوں نے کچھ ایسی تیزی سے گولے برسائے کہ
تلنگوں کو شکست ہوئی۔

دو ڈھائی مہینے دہلی والے کالے خاں گولہ انداز کے کمالات دیکھتے
رہے۔ لیکن جب بارود کی جگہ ریتی آنے لگی تو کالے خاں گولہ انداز کیا
کرتا۔ انگریز دہلی میں داخل ہو گئے۔

جامع مسجد پر جب فوج کا ایک حصہ سر طامس جنکا نس کے ماتحت
تھا وہ اپنی فوج کو ایسے راستوں سے لے آیا جہاں حملے بہت کم تھے
وہ جامع مسجد تک پہنچ گیا جس جگہ آج کل ہسپتال ہے۔ اس وقت جامع
مسجد میں ہزاروں مسلمان نماز کے لئے جمع تھے۔ ان کو معلوم ہوا کہ انگریز
مسجد کو یا معدے اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان سب کے پاس تلواریں تھیں
بندوقیں نہیں تھیں۔ ان کا ایک آدمی منبر پر چڑھا۔ اور اس نے مسلمانوں
سے پکار کر کہا۔

"تمہارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ اب انگریز تمہاری مسجد کو ڈھانے آرہے ہیں میں تم کو مرنے کا بلاوا دیتا ہوں تم میں سے کون کون جان دینی چاہتا ہے۔ دشمن سامنے کھڑا ہے جس کو مرنا ہو وہ میرے ساتھ شمالی دروازے کی طرف کئے اور جس کو جان پیاری ہو وہ جنوبی دروازے کی طرف چلا جائے کہ اُدھر دشمن کی غرض نہیں ہے۔"

یہ تقریر سنکر مسلمانوں نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا۔ اور ان میں سے ایک آدمی بھی جنوبی دروازے کی طرف نہیں گیا۔ ان سب نے تلواریں میانوں سے کھینچ لیں اور سب سے پہلے میانوں کو کاٹ کر پھینکدیا۔ گویا انھوں نے یہ ارادہ کرلیا کہ اب ہماری تلواریں میان میں نہیں جائیں گی۔ نعرۂ تکبیر بلند کرکے شمالی دروازے کی طرف دوڑے۔ جونہی دروازے کے باہر آئے مٹکاف نے بندوقوں کی ایک باڑ ماری جس سے دو سو آدمی شہید ہوکر گر پڑے اور مسجد کی سیڑھیاں ان کی لاشوں سے بھر گئیں مگر یہ لوگ اس پھرتی سے دوڑے کہ دوسرا گراب مارنے کی فرصت مٹکاف کو نہ ملی اور تلواروں کی دست بدست لڑائی ہونے لگی۔ مٹکاف ان پرجوش آدمیوں کا مقابلہ نہ کرسکا۔ انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ سامنے سے ہٹ جائیں۔ چنانچہ وہ اور ان کی فوج وہاں سے بھاگی۔ محبانِ وطن کشمیری دروازے کے گرجا تک ان کا تعاقب کرتے رہے لیکن جب انھوں نے یہ دیکھا کہ گرجا کے قریب انگریزوں کی اور

بہت سی فوج موجود ہے تو وہ سب واپس چلے آئے۔

غرض بادشاہ اور شہزادوں کے علاوہ باہر والوں اور دہلی والوں نے اپنے ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دی تھی لیکن غداروں نے یہ دن دکھایا کہ بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔

بادشاہ کی گرفتاری کے دوسرے دن منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش نے انگریزی حاکموں کو خبر دی کہ مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر بادشاہ کے بیٹے اور ایک پوتے بھی مقبرہ ہمایوں میں موجود ہیں اور یہ وہی ہیں جنہوں نے قلعہ میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ میجر ہڈسن اس خبر سے جوش میں آگیا اور جنرل ولسن سے اجازت لے کر شہزادوں کے قتل کے لئے روانہ ہوا۔ ان کے ساتھ سیکڑوں ابلد اور منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش تھے۔ مرزا مغل مرزا خضر اور مرزا ابوبکر تینوں مقبرے کے اندر تھے۔ ہڈسن باہر کھڑا ہو گیا اور شہزادوں کو اطلاع بھیجی میں آپ کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔ شہزادوں کے ساتھ بہت سے جنگجو اور بہادر آدمی تھے۔ انھوں نے شہزادوں کو مشورہ دیا۔

"تیموری خاندان کے لوگ اس طرح مجبور ہو کر قید نہیں ہوا کرتے تلوار اٹھاتے ہیں اور لڑتے ہیں پھر یا قسمت یا نصیب کا معاملہ ہوتا ہے۔ دارا شکوہ کو جب اورنگ زیب نے قتل کرنا

چاہا اور قاتل قید خانے میں آئے تو دارا بہ کاری چھیلنے کی چھری لیکر کھڑا ہو گیا۔ اور کچھ دیر لڑنے قاتلوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ ہم کو بھی دلیرانہ کام کرنا چاہیئے۔ ہڈسن اور اس کے سو سواروں کو ہم تھوڑی دیر میں شکست دے سکتے ہیں۔ اول مرنا آخر مرنا پھر بہادری کی موت کیوں نہ مریں۔“

شہزادوں نے اس مشورہ کو پسند کیا مگر مرزا الٰہی بخش نے نصیحت کا دفتر کھولدیا جس کی وجہ سے اپنے ارادہ سے شہزادے باز آگئے اور بلا کسی شرط کے ہڈسن کے پاس چلا جانا قبول کرلیا۔

جس وقت شہزادے ہڈسن کے سامنے آئے اس نے ان کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔ مگر خاموش کھڑا رہا۔ اور رتھوں پر سوار ہو جانے کو کہا۔ شہزادے سوار ہو گئے۔ ہڈسن ان کو لے کر شہر کی طرف روانہ ہوا۔ اور جب شہر ایک میل رہ گیا تو رتھوں کو ٹھہرایا اور شہزادوں کو حکم دیا کہ رتھوں سے باہر آجائیں اور اپنے کپڑے اتار ڈالیں۔ شہزادوں نے یہ حکم سنکر آپس میں ایک دوسرے کو دیکھا ان کو یہ امید ہرگز نہیں تھی کہ ان کو اسی جگہ قتل کیا جائیگا کیونکہ مرزا الٰہی بخش نے ان سے کہا تھا کہ جنرل ولسن کے اختیار میں یہ فیصلہ ہے اور جنرل سے جس وقت سفارش کی جائے گی تو وہ بادشاہ کی طرح تم کو بھی جان کی امان دیدیگا ہڈسن صاحب کو نہ امان دینے کا اختیار ہے نہ قتل کرنے کا۔

آخر وہ رتھوں سے اُترے اور اُنھوں نے اوپر کے لباس شہزادگی جسم سے جدا کر دیا اور ہڈسن کو دیکھنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہتا ہے ان کو خیال تھا کہ شاید یہاں سے وہ ہمکو مقید کر کے پیدل لے جائیگا؟

ہڈسن نے جب ان کو لباس اُتارتے ہوئے کھڑا دیکھا تو وہ غصہ سے دیوانہ ہو گیا اور اس نے ایک سوار سے بھری ہوئی قرابین مانگی اور اس کو ہاتھ میں لے کر تڑ تڑ تین فیر کئے گولیاں شہزادوں کے سینہ میں لگیں اور وہ ہائے دھوکہ کہکر زمین پر گر پڑے اور خاک میں لوٹنے لگے اور کچھ دیر کے بعد مر گئے۔ جب وہ مر گئے تو ان کی لاشوں کو لیکر ہڈسن کوتوالی پھر آیا۔ اور لاشوں کو ایک رات دن سر بازار لٹکائے رکھا۔

یہ روایت منشی ذکاء اللہ صاحب نے تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ میں تحریر فرمائی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے جو تواتر کے ساتھ لوگوں کی زبانی چلی آرہی ہے۔ اور اس کو مرزا الٰہی بخش کے ایک مصاحب نے خواجہ حسن نظامی مرحوم کے والد سے بھی بیان کیا تھا کہ[1]

مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان، مرزا ابوبکر اور مرزا عبد اللہ، چار شہزادوں کو رتھوں سے اُتارا اور اپنے ہاتھ سے ان کو قتل کر کے ایک ایک کا خون لیا اور کہا۔ اگر میں ان کا خون نہ پیتا تو میرا دماغ خراب ہو جاتا کیونکہ ان لوگوں نے میری قوم کی بے کس عورتوں اور بچوں کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ ان کے دیکھنے سے میرا خون جوش کھاتا تھا۔

---

[1] دہلی کی جانکنی صفحہ ۵۳

شہزادوں کے قتل کئے گئے بعد ان کے سر کاٹے گئے اور سر ان کی بادشاہ
کے سامنے لایا گیا۔ ہڈسن نے کہا یہ آپ کی نذر ہے جو بند ہو گئی تھی اور
جس کو جاری کرانے کے لئے آپ نے غدر میں شرکت کی تھی۔ بہادر شاہ
نے جوان بیٹوں اور جوان پوتے کے کٹے ہوئے سر دیکھے تو حیرت انگیز
استقلال سے ان کو دیکھ کر منہ پھیر لیا اور کہا: "الحمد للہ تیمور کی اولاد ایسی
ہی سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتی ہے"۔ اس کے بعد شہزادوں
کی لاشیں کوتوالی کے سامنے لٹکائی گئیں اور سر جیل خانے کے سامنے
خونی دروازے پر لٹکا دیے گئے۔

مرزا خضر کو جب شہید کیا گیا تو ان کی عمر چھبیس سال کی تھی
مرزا خضر سلطان صاحب اولاد تھے۔ مرزا عثمان بیگ لڑکا کئی
برس ہوئے انتقال کر گیا۔ لڑکی مرزا مجاہد الدین شاہی خلعت مرزا
مغل سے منسوب تھی۔

مرزا خضر سلطان شعر اچھے کہتے تھے اور تلاش مضامین و الفاظ
بھی بری نہیں تھی نشست الفاظ بھی درست ہے۔ زبان شستہ سلیس
ہے۔ بعض شعر بہت موثر اور دردناک ہیں۔ نمونہ کلام ؎

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر ‏ — غیروں پہ کرم ہو یہ ستم بھی نہیں تھوڑا

ہوں میں سبک نظروں میں اگر دیکھ لیں تجھ کو ‏ — آنکھوں سے کہا ہم نے ذرا دیکھا تو کہا

نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی نہ سن سکتے ہیں تیری ‏ — ہیں اس وقت میں اے بیوفا کیا تو کیا اچھا

جام جمشید کو، آئینہ سکندر کو ملا ‏ — خضر میں ہوں کہ حصے میں مرے دل آیا

چھٹوں کس طرح پھندے سے ترے کہ — مجھے کچھ بن نہیں آتی ہے خدایا

تارِ نفس سے ہے یہ الجھا ہوا یہ تار — نکلے گا دم بھی ساتھ جو نالہ رسا ہوا

گالی سے کون خوش ہو مگر حسنِ اتفاق — جو تیری خوشی تھی وہی میرا مدعا ہوا

کہتے ہو وہ بھی ہوس پیشہ ہی جیسا تو ہے — مجھ سے اک چھیڑ ہوئی شکوہ عدو کا ہوا

کہتے ہو ایک دن تجھے قتل کریں گے — پر یہ بھی کہا اے شوخ ستمگر نہیں آتا

وہ بھی کیا دن تھے کہ فتنہ راتدن بلند تھا
خط سے وہاں رخ سادہ یہاں آئینہ زنگار تھا

تیری خاکِ کفِ پا سے نہ بدلوں — کوئی دے گر مجھے اکسیر آ کر

پتھر گئے چٹانے سے ہو تلوار کو برش — سرمہ جو دیا ہو گئی ان کی نظر اب تیز

میکشوں کے مزار پر رکھنا
ہوں جو بھیگے ہوئے شراب کے پھول

ظلم ہم پر ذرا سمجھ کے کرو — اے بتو بندۂ خدا ہیں ہم

وہ انکا خط کب آیا ہے، فرطِ ضعف سے
کھولنا مشکل ہے خط بالِ کبوتر سے ہمیں

داؤد - حافظ داؤد دہلوی

نجم الدولہ، خلیفۃ الملک حافظ داؤد خاں داؤدِ مستقیم جنگ حافظ
داؤد، کے نام سے مشہور تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے ان کے والد مشہور قاری

حافظ محمد خلیل صاحب سے قرآن مجید پڑھا تھا خود حافظ صاحب نہایت عالی حوصلہ، سخی اور باہمت رئیس تھے۔ درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ میں ایک وسیع باؤلی ۱۲۶۳ھ میں بنوائی جس میں تقریباً پچیس تیس ہزار روپے کی لاگت آئی ہوگی۔ چاوڑی بازار میں ایک وسیع مکان بہ "حافظ داؤد کا گھر" کافی عرصہ تک ان کی یاد دلاتا رہا۔ بیگم دوجانسنے اس کو خرید لیا تھا۔

۹ جنوری ۱۸۴۶ء کو قدسیہ باغ تشریف لے گئے اور سیر و تفریح میں وقت گذارا۔ قدسیہ باغ کے داروغہ حافظ داؤد نے دو روپے اور دو ڈالیاں نذرانے کے طور پر پیش کیں۔ حکم شاہی ہوا کہ تم روزمرہ کا خرچ اور موری خانے کا خرچ اپنے ذمے لے لو۔ حافظ داؤد نے عرض کیا حکم عالی سر آنکھوں پر، میں انشاء اللہ حضور اقدس کے فرمان پر عمل کروں گا۔

۶ نومبر ۱۸۴۶ء کا واقعہ ہے کہ بادشاہ سلامت حضور قطب الاقطاب کے مزار پُر انوار پر حاضر ہونے کی غرض سے قلعہ معلّےٰ سے باہر تشریف لائے۔ ایک ہزار روپیہ دیگر بعض ضروری اخراجات اور مزار کی مرمت کے لئے حافظ داؤد کو مرحمت فرمایا۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم اپنی تالیف "غدر کا نتیجہ" میں لکھتے ہیں:

"حافظ داؤد قلعہ میں معلم تھے پھر لکھنؤ چلے گئے، ان کی میڈھو رسالدار سے بہت قریبی رشتہ داری تھی۔ اس وجہ سے وہاں بہت

کچھ روپیہ پیسہ پیدا کر کے دہلی چلے آئے اور یہاں امیرانہ طریقے سے رہتے تھے یہ بھی گرفتار ہو کر دہلی کوتوالی میں بند کئے گئے۔ لیکن ایک ہزار روپئے کی ضمانت پر رہا ہو گئے۔"

لیکن صاحب خم خانہ جاوید لکھتے ہیں۔

"یہ خود ابتدائے تخت نشینی ابو ظفر سے غدر تک داروغگی نذر و نیاز اور علاقہ خانسامانی شاہی سے مشرف رہے ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔"

اس کے برعکس تاریخ اودھ کے مولف سید کمال الدین حیدر حسینی لکھتے ہیں۔

"حافظ داؤد جیسے معلم بادشاہ کے اس ہنگامہ غدر میں گھر سے باہر نکلے اور مارے گئے۔"

غدر کے واقعات بہت کچھ لوگوں کے کہنے سننے پر لکھے گئے ہیں اور خاص طور پر ہر مصنف نے یہ احتیاط برتی ہے کہ غدر کے شہیدوں کا ذکر بہت کم کیا جائے اور اگر کیا بھی جائے تو ان کو غدر کے شہیدوں میں نہ بتایا جائے۔

خواجہ حسن نظامی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ لکھنؤ چلے گئے تھے گویا دہلی میں کنگال تھے۔ اس لئے لکھنؤ سے بہت کچھ پیدا کر کے دہلی چلے آئے۔ صاحب خم خانہ جاوید تحریر فرماتے ہیں کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ابتدائے تخت نشینی ابو ظفر سے غدر تک داروغگی کی ذمہ داری نبھاتے رہے۔

صاحب خم خانہ جاوید کی رائے صحیح ہے جو آدمی ایک زمہ داری کی جگہ پر مامور ہے جب تک اس کو وہاں سے نہ ہٹایا جائے تو وہ کیسے دوسری جگہ جاسکتا ہے۔ رہا ان کی شہادت کا واقعہ وہ زیادہ قابل اعتبار ہوسکتا ہے، اس لئے کہ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے ایک ایک متعلقین کو چنگر گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔

حافظ داؤد کی طبیعت موزوں تھی مگر شعر کم کہتے تھے۔ دو چار غزلیں حافظ قطب الدین مشیر اپنے عزیز کے مشورے سے کہی تھیں چند شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

نگہ سے ناز سے غمزے سے اور ادا سے پھڑے
بزور عشق نہ ہم کون سی بلا سے پھڑے

گو بظاہر نہ منہ دکھاؤ گے
کیا کبھی خواب میں نہ آؤ گے

مر چکا داؤد کب کا اس کے غم میں ہم نشیں
دم چرانے کا ابھی تک اس صنم کو دھیان ہے

راسخ۔ نواب ظفر یار خاں

نواب ظفر یار خاں راسخ، والد فتح یاب خاں تھے اور ان کے دادا محمد دیدار خاں خلف حافظ رحمت یار خاں صاحب مرحوم تھے نواب محبت خاں محبت خلف حافظ رحمت خاں کے صاحبزادے

محمد منصور خاں مہر کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں رہنے لگے تھے۔

فن شعر سے عشق تھا شبانہ روز شعر و شاعری میں مشغول رہتے تھے خواجہ آتش اور ناسخ کے ہمعصر تھے اور اپنی کثرت مشق کی وجہ سے وقعت و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں راسخ بریلی چلے گئے تھے۔ جب انگریزوں کا بریلی وغیرہ پر قبضہ ہو گیا تو آخری وقت خاں بہادر خاں نے اپنے رشتہ دار ظفریاب خاں اور ان کے بھائیوں کو جو چھاؤنی اشرف خاں متصل بریلی میں رہا کرتے تھے بلایا اور فرمایا۔ اس وقت خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ میں ترائی کے جنگلات میں مستقر بنا کر جنگ کروں گا۔ جو عورتوں اور بچوں کی حفاظت تمہارے سپرد ہے۔ خاندان کے بزرگ ظفریاب خاں صاحب تھے اور انھوں نے بغاوت میں بھی سرگرم حصہ لیا تھا۔ اس لئے انگریزوں کے نزدیک باغیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا[1]

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ان کو پہلے پھانسی کی سزا دی گئی لیکن اپیل پر رہا کر دیے گئے۔ بلکہ ظفریاب خاں صاحب کو پھانسی بھی دی گئی رہا نہیں کیا گیا۔ جب خان بہادر کو شکست ہوئی تو ان کے بعد آپ بھی شہید خدنگ ہوئے۔ نمونہ کلام ؎

انگڑائی اس نے نشہ میں لی جب اٹھا کے ہاتھ
دریائے حسن اور بھی دو ہاتھ بڑھ گیا

مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں
اس آب حیات سے جدا ہوں

---

[1] مضمون سید مصطفیٰ بریلوی العلم کراچی جنگ آزادی نمبر جون ۱۹۵۸ء

دلِ بے آرزو کون و مکاں کا ہے تماشائی
رکھا خالی ازل سے ہم نے آغوشِ تمنا کو

گو مگو اس شوخ کا اقرار ہے بھی اور نہیں
میرے ملنے سے اسے انکار ہے بھی اور نہیں

ہر گھڑی لیتا ہے گہہ سینہ پہ رکھتا ہی وہ ہاتھ
سانس لینا اب ہمیں دشوار ہے بھی اور نہیں

خامشی سے دل جلے ہے کہنے سے جلتی ہے زباں
حال اپنا قابلِ اظہار ہے بھی اور نہیں

جن نے دیکھے نہیں اور دیکھ جاتی ہی رہا
وہ تجلی قابلِ دیدار ہے بھی اور نہیں

خیالِ زلفِ پیچاں شامِ غربت کی سیاہی ہے
تصور روئے تاباں کا خیالِ صبح گاہی ہے

عبورِ بحرِ آفت خیز ہستی ہے تحیر میں
سبکدوشی تعلق سے مری کشتی کا لنگر ہے

دکھایا صانعِ قدرت نے اب تیرے کفِ پا کو
سنا کرتے تھے ہم اعجاز روشن دستِ عیسیٰ کو

تیور چڑھا کے رہ گئے تم کیوں اٹھا کے ہاتھ
چھوٹا ہے نیمچہ تو لگا دو بڑھا کے ہاتھ

منزلِ مقصود کا پایا سراغ
خضر رہے پاؤں کا چکر ہوا

بے دیدۂ گریاں ہوں کہاں دل کی صفائی
ریشِ نفساں رہتے ہیں ہر وقت وضو سے

معتقدِ صنم یہ دل دیوانہ ہوا ہے
یہاں کعبہ نثارِ درِ میخانہ ہوا ہے

رسوا، مولوی فیض احمد بدایونی

مولوی فیض احمد بدایونی کا سلسلۂ نسب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ جنکا خاندانی شجرہ حسب ذیل ہے۔

مولوی فیض احمد بن حافظ غلام احمد بن مولوی شمس الدین بن مولینا محمد علی بن خطیب محمد لطیف بن خطیب عبداللطیف بن ملا محمد شفیع بن شیخ مصطفےٰ بن عبدالغفور، بن عزیز الشہون کریم الدین بن قاضی محمد بن شیخ معروف بن شیخ زندہ بن عبدالشکور، بن محمد راجی بن قاضی سعید الدین بن قاضی الفضلات قاضی رکن الدین الملقب بشمس الحق بن قاضی دانیال ابن شیخ شہید بن شیخ ابراہیم بن اسحاق بن عبدالکریم بن شیخ شریف بن نوراللہ، بن عبدالحی بن شیخ محمد فردوس بن شیخ انیس بن شیخ رافع بن شیخ عبدالکریم بن عبدالرحیم بن ابان بن سیدنا عثمان رضوان اللہ۔

مولینا فیض احمد صاحب کے مورث اعلیٰ قاضی دانیال عراق سے ہندوستان آئے اور بدایوں میں سکونت پذیر ہوئے اور قاضی کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ ان کی اولاد میں مولینا مصطفےٰ جو علم تصوف میں یگانۂ روزگار تھے اور ان علماء میں اُن کا شمار تھا جنہوں نے شیخ محی الدین ابن عربی کی کتب کی غواجبات کا حل کیا تھا۔ ان کے صاحبزادہ مولوی محمد شفیع ان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے جو عالمگیر

مولوی فیض احمد رسوا بدایونی

علیہ الرحمتہ کے عہد کے اجلہ علماء میں سے تھے ان کی عمر گرانمایہ کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں گذرا۔ انھوں نے بارہ سو صدی کی ابتدا میں رحلت فرمائی [1]

مولوی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے مولوی عبداللطیف بدایوں کی مسجد کے خطیب تھے جس کو سلطان شمس الدین التمش نے تعمیر کی تھی۔ ان کے پوتے مولوی محمد علی بدایونی تھے جو ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے قاضی مبارک گوپاموی اور قاضی مستعد خاں دہلوی سے بسلسلہ قادریہ میں مرید ہوئے تھے ۸۳ سال کی عمر میں ۲۵ ربیع الثانی سنہ میں وفات پائی۔ ایک شاعر نے حسب ذیل تاریخ کہی تھی [2]

از وفات مولوی معنوی — گشت تیرہ ہمچو شب روز جہاں
از خرد جستم چو تاریخش بگفت — کرد رحلت زیں جہاں قطب زماں

مولینا محمد علی صاحب کے صاحبزادے مولوی شمس الدین پوتے حافظ غلام احمد اور پڑپوتے مولوی فیض احمد صاحب بدایونی رحمہم تھے۔ مولینا فیض کے والد حافظ غلام احمد نواب مرشد آباد کے طبیب تھے۔ مولینا فیض احمد کی تین سال کی عمر تھی کہ ان کے والد ماجد فوت ہوگئے ان کی والدہ ماجدہ نے ان کو اپنے بھائی مولینا فضل رسول کے سپرد کر دیا۔ آپ نے اپنے بھانجہ کو تمام علوم منقول و معقول کی تعلیم دی

[1] تذکرہ علماء ہند ص۱۹۱ [2] ایضاً ص۳۲

اور چودہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل کر دیا۔ اور آپ کو درس تدریس کی اجازت مل گئی۔ بہت تھوڑی مدت میں آپ کی علمیت کی شہرت ہو گئی چنانچہ مولینا فضل رسول اپنی ملفوظات معینی میں لکھتے ہیں۔

"بفضلہ فیض احمد ہمشیر زادہ نور دیدہ لخت جگر قوت بازو و خاکسار است جامع کمالات انسانی ہست در علوم مروجہ بر معاصرین بالا دست و محبت و عقیدت صحیحہ با محبان محبوب خدا دارد۔"

مولینا فیض احمد مولینا عبد المجید جد مادری سے مرید ہوئے۔ پھر آگرہ تشریف لے گئے یہاں درس تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ آپ کو طلبا سے انتہائی ہمدردی تھی۔ ان کی خبرگیری فرماتے تھے اور بعض مرتبہ انکی مدد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ صاحب اکمل التاریخ تحریر فرماتے ہیں۔

"باوجود ثروت و وقار کے دل فقیرانہ، مزاج شاہانہ تھا۔ فقرا سے محبت اور غربا سے الفت طلبہ کے شائقین اہل علم کے شیدائی تھے۔ شاگردوں کی تمام ضروریات کے خود متکفل ہوتے تھے سلسلہ درس تدریس اقامت آگرہ میں برابر جاری رہا۔"

درس تدریس کے بعد آپ نے صدر نظامت آگرہ میں ملازمت کر لی۔ پہلے مسل خواں پھر پیشکاری پر مامور ہوئے۔ آخر میں بورڈ آف ریونیو

میں سررشتہ دار ہو گئے۔ اسی زمانہ میں ولیم میور جو اس وقت علاقہ نوج کا مجسٹریٹ تھا اور بعد میں لفٹنٹ گورنر صوبہ یو۔ پی ہوا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لائف آف محمد شائع کی تھی۔ اس کو آپ نے عربی پڑھائی تھی۔ انگریز عیسائی مذہب کو پھیلانے کے لئے ہر قسم کے جتن کر رہے تھے۔ مولینا بدایونی ان کی شرارتوں کا بغور مطالعہ کر رہے تھے مشنری ہندوستانیوں کے مذاہب کے خلاف جو کتابیں شائع کرتے تھے اس کو بھی پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر خاں آگرہ میں اسسٹنٹ سول سرجن تھے۔ ان کا دل و دماغ بھی مولینا صاحب کی طرح سوچتا تھا مولینا بدایونی سے ان کے گہرے تعلقات تھے اور انگریز دشمنی میں زیادہ مضبوط ہو گئے تھے۔ پادری فنڈر جو ہندوستان کی مشنریوں کا سرغنہ تھا اس نے ہندوستان میں اپنی تحریر و تقریر کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ایک کتاب ہندو اور مسلمانوں کے مذہب کے خلاف بھی میزان الحق شائع کی تھی خوف و ہراس کا عالم یہ تھا کہ کوئی پنڈت و ملا اس کے خلاف دراز اٹھانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب کے مشورہ سے حضرت العلامہ مولینا رحمۃ اللہ مرحوم نے پادری فنڈر سے مناظرہ کرنے کے لئے خط و کتابت کی جس میں ان کو کامیابی ہوئی۔ چنانچہ ۱۰ و ۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء کو کٹرہ عبدالمسیح آگرہ میں مناظرہ ہوا۔ مشنریوں کی جانب سے جناب کرسچن صاحب سکریٹری صدر بورڈ جناب سمتھ صاحب حاکم صدر دیوانی۔ جناب ولیم مجسٹریٹ علاقہ نوج جناب لیڈلی صاحب

جناب تیش صاحب نسیم گلبن اور مسلمانوں کی جانب سے حضرت مولینا رحمت اللہ
کرانوی صاحب، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب، منشی حافظ ریاض الدین
صاحب، جناب مولوی فیض احمد صاحب سررشتہ دار صدر بورڈ
جناب مولوی حضور احمد صاحب، و جناب مولوی امیر اللہ صاحب،
مختار راجہ بنارس، جناب قمر الاسلام صاحب امام جامع مسجد آگرہ
جناب منشی خادم علی صاحب مہتمم مطلع الاخبار اور جناب مولوی
سراج الحق صاحب ابن مولوی فیض احمد صاحب شامل مناظرہ تھے۔[1]
مناظرہ میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور پادری فنڈر اور
ان کے ساتھیوں نے مانا کہ انجیل شریف میں تحریف ہوئی ہے۔ مسلمانوں
نے اس کی روئیداد اُردو اور فارسی زبان میں شائع کی۔ پادری فنڈر
نے بھی اس مناظرہ کی روئداد سکندرہ کے چھاپہ خانہ آگرہ میں شائع
کرائی جس میں اپنی فتح کا ڈنکا بجایا۔ چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے
جو علماء شامل ہوئے تھے۔ "خطوط و محاکمہ"، ایک کتاب مولوی امین اللہ
صاحب نے شائع کی جس میں ان لوگوں نے اپنے تصدیقی دستخط ثبت
کئے کہ جو روئیداد کارروائی اس کتاب میں شائع ہوئی وہ صحیح ہے پادری
فنڈر نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔"[2] اس کتاب پر بھی مولینا فیض احمد
بدایونی اور ان کے صاحبزادے مولوی سراج الحق کے دستخط ثبت ہیں۔
۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی۔ اور

[1] البحث الشریف فی اثبات... و تحریف ص۔ [2] خطوط و محاکمہ ص

۱۱ مئی کو دہلی میں انقلابی چنگاریاں انگریزی اقتدار کو بھسم کرنے لگیں تو اس کی اطلاع آگرہ میں بھی پہنچی۔ آگرہ کے فوجیوں نے بھی بغاوت کر دی۔ انگریزوں نے آگرہ کے قلعہ کو اپنا جائے پناہ بنایا۔ جون میں شدید ہوئی اور جولائی میں تیزی آئی۔ مجاہدین کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد صاحب نے کی۔ جب حالات کا اندازہ لگایا اور دہلی میں فوج کی مانگ ہونے لگی تو ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد فوجیوں کے ساتھ دہلی تشریف لے آئے۔

مولانا بدایونی کو بہادر شاہ ظفر نے حاکم عدالت مقرر کیا۔ آپ مرزا خضر سلطان اور مرزا مغل کے ساتھ عدالت کیا کرتے تھے اس وقت آپ نے شہر میں ایک کوتوال اور تھانیدار مقرر کئے[۱] جب دہلی میں جنرل بخت خاں آگئے۔ شاہی ارکان شوریٰ میں ڈاکٹر وزیر خاں بھی شامل ہوئے۔ مولوی فیض احمد مرزا مغل کے پیشکار مقرر ہوئے اس کے بعد مولوی صاحب کو بلند شہر اور ضلع علی گڑھ کی تحصیل زر مالگزاری کے لئے مقرر کیا گیا۔ اور حسن بخش از کلی بھی ضلع علی گڑھ کی وصول یابی مالگزاری کے لئے متعین ہوئے۔ اور ولی داد خاں کے نام بھیجا گیا کہ وہ ان دونوں حضرات کے کام میں امداد کریں۔ راؤ گلاب سنگھ رئیس کچھ کے نام حکم تھا کہ وہ ان دونوں کو بارہ ہزار روپے ادا کرے ظہور علی خاں رئیس نحرم پور اور محمد داؤد خاں رئیس بھیکم پور اور راجہ

[۱] تاریخ بغاوت ہند علاوہ

دمن سنگھ کے نام احکام سے تھے کہ وہ زر مالگذاری فیض احمد اور حسن بخش کو ادا کریں۔[1] عبداللطیف مانپوری کو بھی لکھا گیا کہ وہ اس کی آمدنی فیض احمد اور حسن بخش کے ہمراہ بھیج جائے۔[2]

دہلی میں جنگ کے معرکوں میں جنرل بخت ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ جب دہلی میں انگریزوں کا تسلط ہونے لگا تو جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی مقبرہ ہمایوں میں بہادر شاہ ظفر سے جا کر ملے اور عرض کیا آپ ہمارے ساتھ چلیے۔ نواب الٰہی بخش نے بادشاہ کو ان کے ہمراہ جانے نہیں دیا۔ اس کے بعد یہ تینوں حضرات لکھنؤ تشریف لے گئے۔ ان کے ہمراہ فیروز شاہ شاہزادہ مع دو سو سوار اور پانچسو تلنگوں کے تھے۔ سلطان بہو صاحبہ کے مکان کے قریب ٹھیرے۔ پانچہزار روپے دعوت کے آئے۔ کئی دن کے بعد مرزا بلاقی نواسہ شاہ دہلی اور مرزا کوچک بہادر شاہ ظفر کے بیٹے نکہ گنج میں آئے۔ ان کے استقبال کے لئے مولوی میر مہدی آتالیق نواب میرازالدولہ اور نواب ممتازالدولہ گئے۔ ۱۵۔۱۵ اشرفیاں نذر کیں۔[3]

۱۹۔ رجب مطابق ۶۔ مارچ شنبہ کو جنرل مارٹن نے مورچہ قائم کیا جس کا انچارج یوسف خاں کے بھائی ممو خاں کو بنایا گیا۔ شرف الدولہ غلام رضا کے ذمہ رسد رسانی سونپی گئی۔ مولوی احمد شاہ نے

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ صفحہ ۹۰ [2] غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط صفحہ ۱۲۱

ککراں پر تیسرا مورچہ قائم کیا۔ سلطان پور سے انگریزوں کی جو تازہ دم فوج آئی تھی اس کا نواب شرف الدولہ سے مقابلہ ہوا۔ یہ کوکراں پر اپنے ساتھیوں سمیت کھڑے تھے۔ توپ کا گولہ ان کے ہاتھی پر جو لگا تو یہ گھبرا گئے اور اپنے گھر واپس چلے گئے۔ ادھر محلات پر گولہ باری ہونے لگی۔ تو بیگم زچ گئی۔ چکرا دلی کے مورچہ پر انگریزی فوج کا دباؤ پڑنے لگا تو شاہ صاحب مدافعت کرتے رہے حضرت محل بھی ممو خاں کے ساتھ فوج کے لڑنے میں سرگرمی دکھا رہی تھیں۔ شاہ صاحب نے اپنے مورچے کا رنگ بگڑتے دیکھا تو اپنے ساتھیوں سے کہا جسے ہمارا ساتھ دینا منظور ہو وہ علیحدہ ہو جائے جاں نثار علیحدہ ہو گئے۔ سب نے ڈٹ کر لڑنے اور نہ بھاگنے کی قسم کھائی۔ مورچہ کو بدلا۔ سرائے معتمد الدولہ میں آکر ٹھہرے عیش باغ میں ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ شہزادہ فیروز شاہ اور مولوی فیض احمد صاحب کو مع تلنگوں کے پل پر مقرر کیا۔ مگر نواب ممو خاں کی جلد بازی اور گھبراہٹ اور بے موقع میدان سے ہٹنے نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ حضرت محل برجیس قدر کو لے کر لکھنؤ سے نکل کھڑی ہوئیں مولوی احمد اللہ شاہ لڑتے بھڑتے رہے۔ بالآخر شاہ صاحب شاہزادہ فیروز شاہ، جنرل بخت خاں اپنے ساتھی مولوی فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں کو لے کر بدایوں روانہ ہوئے۔

شرر: ۷ اپریل ۱۸۵۸ء کو بدایوں میں نیاز محمد خاں کو یہ خبر

ملی کہ محسن علی خاں جس کو مسٹر ہوکرانٹ نے شکست دی ہے بریلی جاتے وقت ضلع بدایوں سے گذرے۔

اس خبر سے نیاز محمد خاں، ڈاکٹر نذیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے جنگی فضا اور ماحول کو ساز گار بنانے کے لئے دہلی میں جو جہادی فتویٰ شائع ہوا تھا اس کو بدایوں میں شائع کرایا۔ جس کی وجہ سے ککرالہ مجاہدین کا مرکز بن گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر وزیر خاں کو درجہ دوئم کا کمانیر مقرر کیا گیا۔ ۸۔ اپریل کو نواب خان بہادر خاں سے تین ہزار آدمی طلب کئے گئے۔ یہ انتظام کر کے مجاہدین نے حملہ کا ارادہ کر لیا۔

۲۷۔ اپریل کو جنرل سی مع ولسن لوتی، "تاتار پور کے گھاٹ سے گنگا عبور کر کے داوبہت کی طرف آیا۔ اس کے ساتھ دو سو لو جوان ڈھائی سو ملتانی سوار، ۳۵۳ جوان رجمنٹ ۹۴ کے ۲۲ جوان پنجابی، ۶۰ بلوچ پلٹن، ڈھائی سو گیارہ دیسی پلٹن اور چھ بھاری اور چھ ہلکی توپیں تھیں۔ کپتان گوں کو معین کیا گیا کہ ککرالہ کی سڑک سے چار میل کے فاصلہ پر نواب خان بہادر خاں کی فوج ہے یا تو ان کو بھگا دے یا گرفتار کر لے۔

۲۹۔ اپریل کو جنرل سی "چاندنی والی راتوں میں تیزی کے ساتھ فوج لیکر چلا اور داوبہت کے قریب پہنچ گیا۔

لہ اخبار الجمعیۃ دہلی یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء

انگریزی فوج کے کگرالہ پہنچنے سے ایک دن پہلے بچھم کے ایک
باغ میں جہاں قصبہ کا کھلیان تھا۔ ایک سوار آیا۔ چھوٹے خاں
اس وقت کھلیان کی حفاظت کر رہے تھے وہاں کچھ اور لوگ
بھی تھے جو سب معمر تھے۔ چھوٹے خاں نے سوار کی بہت آؤبھگت
کی۔ دوران گفتگو میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قصبہ کے لوگ
انگریزوں کے خلاف اور سب جہاد کے لئے تیار ہیں۔ سوار کو
یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی۔ اہل قصبہ کثرت سے جمع ہو گئے
سوار کے رفقا بھی ادھر گرد سے آ گئے۔ اب قصبہ والوں کو اس بات
کا علم ہو گیا کہ یہ سوار شہزادہ فیروز ہے۔ لوگوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی
انگریزی فوج نے آدھی رات کو کگرالہ کی طرف کوچ کیا۔ اور
آدھا راستہ طے کرکے دم لیا۔ تاکہ پیدل فوج بھی آ کر ان سے مل جائے
جب پیدل فوج آ گئی تو اس کو حکم ملا کہ وہ آہستہ چلے جلدی
کی ضرورت نہیں ہے۔

صبح صادق کا وقت تھا کہ مجاہدین کا ایک گروہ آتا ہوا
نظر آیا۔ جنہوں نے چار توپ گراب کی سرکیں۔ مگر کوئی زخمی نہیں ہوا
انگریزوں نے جوابی توپوں کے فیر کئے۔ مجاہدین نے وقع پاکر
انگریزی فوجوں کو تلوار پر رکھ لیا۔ اور تلہ بگلہ لڑائی شروع ہوگئی
انگریزی فوج نے مجاہدین کی شمشیر زنی کی تاب نہ لا کر درختوں
کی آڑ میں توپیں چلائیں۔ جس سے مجاہدین کا فی جانی نقصان ہوا

لیکن اسی کے ساتھ گولہ انداز کے نشانہ سے جنرل سی، کا سر اڑ گیا کسی مجاہد کی تلوار اس کا خون پی چکی تھی۔

سورج نکلنے پر کرنل جونس مع پیادہ فوج کے آکودا۔ اس فوج نے لکرالہ کے مجاہدین کو گھیرے میں لے لیا جس کی وجہ سے ایک ہزار محبان وطن شہید ہوئے۔ شہزادہ اور ڈاکٹر نذیر خاں کے ساتھیوں نے کچھ سامان اور فوج لیکر لکرالہ کے پچھم اور ضلع کھیڑا ئی سے پورب کی جانب سے ایک جھاڑی دار ٹیلہ کی آڑ سے مورچہ لگایا پھر بھی ناکامی ہوئی۔ بدایوں کی طرف مجاہدین روانہ ہوئے۔ توپ خانہ نے دور تک ان کا تعاقب کیا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر بدایوں لکھتا ہے کہ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یہ سرفروش جماعت ڈاکٹر نذیر خان کے رفقا کی تھی۔"

بریلی وغیرہ مقامات کو فتح کرنے کے بعد ۳۔ جون کو بریگیڈیر کلک مع ایک دستہ فوج کے شاہجہانپور سے اوبہت آیا۔ لب سڑک کے ان تین گاؤں کو جن پر مخالفین کا خیال تھا۔ آگ لگا کر جلا دیئے۔ اسی دن لکرالہ میں آگ لگائی۔ اس آگ میں عورتیں بچے بہت جلے۔ اور چاروں طرف گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ ایشری پرشاد مخبر ساتھ تھا۔ تقریباً پانچسو اشخاص گرفتار ہوئے۔ روزانہ سو آدمیوں کو سزائے موت اس طرح دی جاتی کہ سفید چونے سے حوالات میں سو آدمیوں کی پشت پر نشان لگایا جاتا۔ دو گھنٹے کے

نشان زدلے لوگوں کو ایک قطار میں کھڑا کرکے۔ ایک طرف سے کان پر گولی کا فیر کیا جاتا جس قدر لوگ اس فیر میں مرتے ان کو ایک کھونے میں ڈالدیا جاتا۔ جو زندہ رہتے پھر لائن میں کھڑا کرکے ان پر اسی طرح فیر کردیا جاتا۔

۴۔ مئی اتوار کو شاہجہانپور میں ہنگامہ بپا ہوا۔ فرنگی گرجا میں نماز پڑھ رہے تھے۔ کپتان مع فوج کے آگئے۔ سپاہی ہٹکر شہر پر حملہ کرنے چلے گئے۔ قلعہ پہنچکر نواب نادر علی کو ناظم شہر مقرر کیا۔ اور سند نظامت نواب خان بہادر خاں سے حاصل کی اور ضلع کا نظام اپنے ذمہ لیا۔ ایک سال یہ جنگ جاری رہی۔ اسی دوران میں جنرل بخت خاں۔ تجمل حسین خاں رئیس فرخ آباد۔ اور شاہزادہ فیروز شاہ۔ اور مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر علی خاں صاحب بدایوں وغیرہ سے ناکام ہوکے شاہجہانپور آموجود ہوئے۔ نانا راؤ پیشوا بھی آگئے۔ مولینا احمد اللہ شاہ صاحب نے تمام فوج منتشر کو یکجا کیا۔ اور بجیوریلہ کے قریب انگریزی فوج سے سخت مقابلہ ہوا۔ ۲۸۔ مئی ۱۸۵۸ء کو سر کالن کیمبل بڑی کثرت کے ساتھ فوج لے آیا۔ اس وقت سب کی یہ رائے ہوئی یہاں سے ہٹکر محمدی پور کی گڈھی پر قبضہ کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا محمدی پور کی گڈھی پر لیس بندی کی گئی اور اپنی حکومت شاہ صاحب نے قائم کردی۔ وزیر جنگ جنرل بخت خاں مقرر ہوئے۔ قاضی

القضات سرفراز علی جونپوری، نانا راؤ پیشوا دیوان بنے۔ کونسل کے ارکین مولوی لیاقت علی الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی۔ مولوی فیض احمد بدایونی۔ شاہزادہ فیروز شاہ منتخب ہوئے۔ سکہ شاہ صاحب کے نام کا جاری ہوا[1]

زد بر ہفت کشور خادمِ محراب شاہ   حامیٔ دین محمد احمد اللہ بادشاہ

سر کالن کمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کر دیا خوب مقابلہ رہا۔ باہمی نفاق نے ناکامی کا منہ دکھایا۔ ۱۵۔ جون ۱۸۵۸ء کو شاہ صاحب پرگنہ گڈھی میں راجہ بلدیو سنگھ کے کہنے سے نمودار ہوئے۔ تنہا ہتنی پر سوار تھے۔ بلدیو سنگھ کے بھائی نے پھاٹک بند کر کے گڈھی پر گولیوں کی بوچھاڑ ایک ساتھ کردی سینہ چھلنی ہو گیا۔ ڈاکٹر وزیر خاں حجاز روانہ ہو گئے۔ جنرل بخت خاں ایسے گئے کہ معلوم نہیں ہوا کہ کہاں پہنچے۔ مولوی فیض احمد بدایونی ۱۲۷۵ھ فرنگیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

مولٰنا بدایونی صاحب تصنیف اور صاحب دیوان تھے حاشیہ صدرا و حواشی خصوص نامابی ان کی تالیف ہیں۔ دیوان عربی و فارسی آپ کے تھے۔ آپ نے حضرت غوث الاعظم قدس سرہٗ کی شان میں قصیدہ فرمایا تھا[2] مولٰنا کا کلام پر مذاق اور سنجیدہ ہے۔ فصاحت کلام میں پائی جاتی ہے۔ زبان میں سلاست اور

---

[1] غدر کے چند علماء ص۴۹ [2] تذکرہ علماء ہند ص۱۶۲

روانی بھی ہے۔ نمونۂ کلام[1]

بت خانوں میں دیں پھر اذانیں — ناقوس بھی کعبہ میں بجایا
لیکن کسی نے یوں بھی پوچھا — بے وقت یہ راگ کس نے گایا

ہم جو چپ ہوں تو سڑی کہلائیں
شیخ چپ ہوں تو توکل ٹھہرے

تم جسے چاہو چڑھا لو سر پر — ورنہ یوں وضع یہ تاکل ٹھہرے
کربلیں بولیں پپیہے کوکے — روز و شب شیشے سے قلقل ٹھہرے

بد دماغی ہے فقط میرے ساتھ
کان کی بات مری غل ٹھہرے

محفل میں اسکی دور کھڑے ہیں ادب سے ہم — ہیں اسکے منتظر کہ اشارہ کرے کوئی
کرتا ہوں دیر اس لئے دینے میں جان کی — مجھکو پسند ہے کہ تقاضا کرے کوئی

کہتے ہیں جس نے چھوڑ دی خودی وہ خدا ہوا
درگذرے ہم خدائی سے بندہ کرے کوئی

رفعت، مرزا پیارے رفعت دہلوی

شاہزادہ مرزا پیارے رفعت گورگانی ۱۲۴۱ھ میں پیدا ہوئے
قلعہ میں رہتے تھے۔ اوائل عمر میں حافظ عبدالرحمٰن صاحب احسان

---

[1] خمخانۂ جاوید صفحہ ۴۴۴

سے مشورہ سخن کیا۔ بعد میں شہید فرنگ مولینا امام بخش صہبائی کو اپنا کلام دکھلانے لگے۔ صاحب گلستان سخن کے رفعت صاحب ہم عصر تھے۔ رفعت صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جواں خوبصورت، خوش سیرت، جادو رقم، عطا قلم، سحر ساز، معجزہ طراز، صاحب طبع سلیم، ذہن مستقیم، موجد عبارات سلیس گنجور معانی .... پیشہ عاشقی شعرا جرب زباں کی نقط قیل وقال ہے اندامں شیریں گفتار کا حال مدام۔ ماہر بیان شیریں کلام سے ہم صحبت اور ہمیشہ نیکوان خوش اندام سے ہم خلوت، معشوق ہائے ملیح کے خوان وصل سے نمک چیں اور خوبان صبیح کے بادۂ وصال سے قدح کش"

اپنے استاد مولینا امام بخش صہبائی کی صحبت کا اثر ان پر غالب تھا ان کے ہمراہ رہتے تھے۔ انگریز سے دلی نفرت تھی۔ انھوں نے بھی مولینا صہبائی کے ساتھ انگریز کی بیخکنی کرنے میں حصہ لیا ہی نہیں بلکہ اپنے شاگردوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگا۔ مرزا صلح الدین خلف مرزا حسین بخش نواسہ بہادر شاہ ظفر بھی ان کے ہم نوا اور ہم عمل تھے۔

جب انگریزوں نے دہلی فتح کر لی تو مولینا امام بخش صہبائی کے بعد مرزا رفعت الور چلے گئے تھے۔ مخبروں نے اطلاع دی تو مرزا رفعت

ایک سو آٹھ تیہ یوں کے ساتھ گرفتار ہوئے جن لوگوں کو راستے میں یعنی گوڑگانوہ میں گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ ان میں سے چند حسب ذیل حضرات تھے۔

(۱) نواب مظفر الدولہ ابن نواب حسام الدین حیدر نامی ابن آغا شفیع خاں تھے۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد الور چلے گئے تھے فورٹ صاحب کلکٹر گوڑگانوہ کے حکم سے ان کے گولی ماردی گئی۔ ان پر یہ الزام تھا کہ تم نے سفیر لکھنؤ کو کیوں اپنے گھر میں اتارا۔[1]

(۲) نواب اکبر خاں ابن فیض اللہ خاں بنگش ان کو دو سو پچاس روپے پنشن سرکار سے ملتی تھی۔ ایک سو روپے ان کی بیوی کی پنشن تھی۔ الور گرفتار ہو کر یہ بھی جب گوڑگانوہ میں آئے تو ان کو بھی پھانسی دی گئی ان کے بیٹے فیض محمد خاں عرف بدہن بچ گئے۔ متعلقین کو لے کر اجمیر شریف چلے گئے۔

جب الور سے مہمان وطن اسیروں کی شکل میں دہلی آئے تو مرزا رفعت کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کے بعد ان کے حسب ذیل ساتھیوں کو سلسلہ وار پھانسیاں دی گئیں۔ جن شہیدوں کے نام معلوم ہو سکے ان کے حالات تحریر کئے جاتے ہیں۔

(۱) مظفر الدولہ شہید کے بھائی حسین مرزا ناظم کرنال کے دو صاحبزادے۔ ایک طالع یار خاں اور اصغر یار خاں تھے یہ دونوں ایسے حسین و جمیل نوجوان تھے کہ دہلی میں ان کا کوئی مثل نہیں تھا۔

---

[1] تاریخ اودھ دوم صفحہ ۲۵۹

جس وقت یہ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تھے تو لوگ سکتہ کے عالم میں ہو جاتے تھے۔ یہ دونوں بھائی گھنشام چپڑاسی کنبٹی جے پور اور سپہدار خاں کی مخبری کرنے سے گرفتار ہوئے۔ دہلی لائے گئے اور دو مہینے جیل خانہ کی مصیبت جھیلنے کے بعد بغیر تحقیقات کے دونوں کو پھانسی دیدی گئی ان کے پھانسی پانے سے اہل شہر کو رنج وافسوس ہوا۔ اور جو حال ان کے باپ حسین مرزا کا ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ بقیہ عمر روتے ہی رہے۔

(۲) نواب امیر خاں بنشدار خلف نواب مرتضیٰ خاں جاگیردار ہلول مع اپنے نوجوان بیٹے عثمان خاں عرف دھولا الور سے گرفتار ہو کر دہلی لائے۔ اس جرم میں کہ مرزا عبداللہ کے دربار میں حاضر ہوتے تھے پھانسی دیدی گئی ان کے اہل وعیال دہلی سے حیران وپریشان ہو کر جاورہ چلے گئے۔ اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

(۳) میر محمد حسین میر خیراتی سررشتہ دار محکمۂ ایجنسی کے بیٹے اور بڑے بھاری بھر کم آدمی تھے اور بہت متمول تھے پہلے ریاست الور میں مرزا اسفند یار بیگ کے علاقہ میں ملازم تھے اکثر بخت خاں جرنیل فوج شاہی کی صحبت میں آتے جاتے تھے ان کی کوئی اولاد نہیں تھی روپیہ پیسہ بہت تھا۔ الور سے گرفتار ہو کر دہلی گئے۔ قریب دو مہینے کے کوتوالی دہلی میں قید رہے بعد میں ان کو پھانسی دیدی گئی۔[لہ]

(۴) عبدالصمد خاں ابن علی محمد خاں بادشاہ کی فوج میں رسالدار

لہ غدر کا نتیجہ صہ ۵۳

تھے۔ پھر واجد علی شاہ کے یہاں افسر فوج مقرر ہوئے۔ پھر الور گئے۔ وہاں سے ایک سو آٹھ آدمیوں کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ دہلی آئے گولی کا نشانہ بنے۔

مرزا رفعت بڑے نامور اور خوش فکر شاعر تھے۔ ان کے اشعار نہایت شیریں اور عمدہ ہوتے ہیں۔ صاحب دیوان تھے۔ اور ان کے کافی تلامذہ بھی تھے۔ جن میں قابل ذکر نام مرزا اسکندر بخت فدا ابن مرزا منور بخت خلف مرزا نیر بخت ابن شاہ عالم بادشاہ مرزا اکمل عشرت پسر مرزا حیدر شکوہ ابن طہماسپ شکوہ اور مرزا علیم الدین صالح ہیں۔ نمونۂ کلام ؎

ہم خوش تھے کہ محشر میں تو دیکھیں گے وہ دیدار
لیکن یہ قیامت ہے کہ محشر نہیں ہوتا

کس منہ سے کریں دل کی شکایت کہ برا ہے
تجھ سے تو جدا وہ کبھی دم بھر نہیں ہوتا

کم ہو گئی شاید بت و بتخانہ کی الفت
کچھ ان دنوں آپ ہے جدہ رہ کے خدایا

ہائے بیمار بھی چل نہ سکا دم مرگ — کوئی خبر گر یہ حسرت ترے بیمار کے پاس
تجھ کو لینی ہی تو لے وہ اجل لیتی ہے — جان جو کچھ ہے باقی ترے بیمار کے پاس

کچھ آنکھ کا گیا نہ گیا کچھ خیال کا
مارا گیا دل اور یہی بے قصور تھا

تھا ہدف غیر پر اپنا جو مقدر تھا دبیت — غلط انداز سے وہ تیر ادھر آ ہی گیا

ناصح بھی کرنے چاک گریباں کو لگے — باقی جب ان کو جائے نصیحت نہیں رہی

پہلے نہ لکھے ہیں تو ہوں بیوفا — تحریر میں بھی جائے شکایت نہیں رہی

اب انھیں ظلم کرنے کی عادت نہیں رہی — جب جسم میں سانس لینے کی قوت نہیں رہی

میں تجھکو نہ کہتا تھا حسینوں کو نہ دے دل
رغبت کرنی ان لوگوں سے جائز نہیں تھا

ان کو زمانے سے فرصت کہ ہم سے کچھ چھیڑ — نہ ہم کو ضعف سے یارا ستم اٹھانے کا

ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہے ان کو یارانہ — اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ ملنے کا

حسن کی خوبی سے بھی واقف نہ تھا اپنی وہ شوخ
دیکھتے ہی دیکھتے ایک آفت جاں ہو گیا

میخانہ کو سمجھا ہوں دل کعبہ کہ یہاں — جب میں آتا ہوں تو آنکھوں سے لگا جاتا ہوں

بعد مرنے کے بھی الفت گئی دل سے کہ میں — خاک ہو کر ترے دامن سے لگا جاتا ہوں

منہ میں جو آئے ترے واعظ تو کہہ — پر نہ کہیو کچھ بتوں کی شان میں

آج کچھ رفعت دل خستہ کا احوال ہے غیر
جو کہ دھڑکا تھا سو وہ پیش نظر آ ہی گیا

رند۔ منشی اکرام الدین دہلوی

منشی اکرام الدین رند دہلوی مولوی عبد العزیز عزیز زادہ مولوی عبد الکریم

سوزؔ خلف مولینا امام بخش صہبائی کے ماموں زاد بھائی تھے فارسی کی کتابیں اور شعر و شاعری کی مشق مولوی عبدالکریم سوزؔ سے کی، ذہین اور ذکی بلا کے تھے، علم طب میں دخل رکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں مولانا امام بخش کے ساتھ مع ۲۱ نفوس کے عالم جوانی میں شہید ہوئے مقطع میں تخلص کو خوب نبھاتے تھے۔ نمونہ کلام ؎

تری زلف بگڑی بکھری جو نہ دیکھتے کبھی ہم
تو نہ ہوتے یوں پریشاں نہ یہ حال زار ہوتا

نہ وصال اس سے ہوتا نہ اٹھاتے رنج فرقت
جو شراب ہم نہ پیتے تو یہ کیوں خمار ہوتا

مرے نام سے ہے ظاہر مرا حال مے کشی کا
مجھے سوزؔ رند کون کہتا جو نہ بادہ خوار ہوتا

تو نے جلا جلا کے ہمیں خاک کر دیا
اور خاک ہو گئے تو صبا نے اڑا دیا

تو نے ہماری یاد کو خاطر سے اپنی ہے
حرف غلط کی طرح سے ظالم مٹا دیا

ہم پر تو التفات نہ تھی لیک بزم میں
ساقی نے سوزؔ جان کے ساغر پلا دیا

پاس آ کر مرے خفا بیٹھے
بیٹھے گر اس طرح تو کیا بیٹھے

دل میں آنا ترا نہیں مشکل
ہو گئے جب غبار آ بیٹھے

رند پینے سے کب بچتا تھا بہت ہی لیکن
کچھ نہ کچھ یاروں کی صحبت کا اثر آ ہی گیا

شوقِ دیدار اٹھائے لئے جاتا ہے مجھے	ناتوانی پہ بھی کوچے میں ترے اے ظالم
ہے ابھی عہد ہی بگڑا ہوا زمانے کا	مگر نہیں ہے ہمیں کچھ ترے ستانے کا

وہ مر گئے تری صحبت کے یار کیا اے رِند
جو آج کل نہیں چرچا شراب خانے کا

سعید۔ نواب غضنفر حسین خاں فرخ آبادی

نواب غضنفر حسین خاں فرخ آبادی۔ کو اردو فارسی کے علاوہ سنسکرت میں بھی کافی دخل تھا۔ نواب تجمل حسین خاں کے حقیقی بھائی ہونے کی وجہ سے شعر و سخن سے اور زیادہ دلچسپی تھی۔ ابتداء ۱۸۵۰ء میں نواب غضنفر حسین خاں صبح کے وقت عبادت الٰہی میں مصروف تھے "لنڈسے" نامی کلکٹران کے قریب کھڑے ہو کر نازیبا الفاظ استعمال کرنے لگا۔ مقصد یہ تھا کہ کلکٹری کے رعب میں آکر عبادت چھوڑ کر میری طرف نواب صاحب متوجہ ہو جائیں گے۔ اس کی حرکت سے نواب صاحب غصہ میں تھے۔ عبادت الٰہی سے فارغ ہونے کے بعد اپنے ملازم کو حکم دیا کہ اس بندر کی ٹوپی گرا دو۔ اور کان پکڑ کر باہر نکال دو۔ حکم کی دیر تھی "لنڈسے" کو ملازموں نے کان پکڑ کر باہر نکال دیا۔ اس روز سے "لنڈسے" اپنے دل میں نواب کی طرف سے جذبۂ انتقام رکھنے لگا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں تمام خاندان سے بدلہ لیا۔

نواب غضنفر حسین خاں سعید

جنہیں ۱۴ دسمبر ۱۸۵۸ء کو فرخ آباد کے گھومنی

کے درخت پر پھانسی دیگئی

نواب پر مقدمہ چلا۔ فرخ آباد کے پیپل کے درخت میں پھانسی دلوا کر نواب صاحب کو شہداء کے زمرہ میں داخل کر دیا گیا۔

غضنفر حسین خاں کا تخلص سعید تھا۔ ان کا کلام زیادہ تر فارسی زبان میں ہے۔ صاحب سیرت فرخ آباد صفحہ میں نواب غضنفر حسین خاں کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"صاحب سخن ذی لیاقت بود و خوش طبیعت بود اسم پدرش نواب علی حسین خاں بود و لقب نواب غضنفر حسین خاں ہنر بر جنگ بود۔ پدرش عالی تبار رئیس اعظم بود شعرا دوست بود و خود... جلال الدین محمد بہادر شاہ ظفر سرفرازی حاصل نمود۔ تخلص او سعید بود، چند اشعار بطور نمونہ پیش کردہ شد"

روز عید است لب تشنہ می آید کنید — [illegible] آتشنہ لباں [illegible] کنید

[illegible] کہ ہست [illegible] — روز باشد بکف جام می اندود کنید

شربت [illegible] لب جاں بخش ایاز — نوش [illegible] دل خستہ محمود کنید

عرف بے صبر واعظ نتواں گرد بگوش — گوش بر نغمہ چنگ نے و عود کنید

ہست بہبود شما بندگی شاہ مراد — بہتر آنست کہ اندیشہ بہبود کنید

شیوۂ صدق چو سرمایہ ہر سود بود — ہست امید کہ ہم شیوہ بے سود کنید

[illegible] نواب غضنفر حسین خاں صاحب کلمی [illegible] سعید [illegible]

پدرش یافت رہ از طالع مسعود سعید
سعی دریافتن طالع مسعود کنید

اس غزل کے بارے میں قاضی عبدالودود صاحب نے توجہ دلائی کہ یہ غزل نواب صاحب کی نہیں ہے بلکہ محمد سعید داراشکوہی کی ہے جو مراۃ الخیال میں درج ہے۔ چنانچہ خدا بخش لائبریری میں مراۃ الخیال دیکھی۔ قاضی صاحب کے قول کی تصدیق ہوئی۔ صاحب سیرت فرخ آباد کو سہو ہوا۔ اس کے بعد فرخ آباد میں منشی الطاف الرحمن صاحب فرخ آبادی کی بیاض ص ۱۵۱ میں نواب صاحب کی حسب ذیل رباعی میری نظر سے گذری جو نقل کی جاتی ہے ملاحظہ ہو ؎

نہ تڑپاؤ دل کو یہ مجبور سا ہے ۔۔ محبت سے تیری یہ دل چور ہے
سعید اپنی مرضی بھلا کب چلی ۔۔ وہ سنتا نہیں میری مغرور ہے

سرور۔ مرزا عزیز الدین گورگانی

مرزا عزیز الدین گورگانی ابن مرزا معظم بخت نبیرہ شاہ عالم آپ کمال ہنر سے بہرہ ور تھے۔ بہادر شاہ کی سب سے زیادہ عزیز اور لائق بیوی آغا بیگم صاحبہ کے شوہر تھے۔ مروت و اخلاق میں بے مثل اور اہلیت و سعادت مندی میں بے نظیر تھے[1] حضرت ذوق کے شاگرد تھے۔

---

[1] ضمیر سخن ص ۱۲۲

ہنگامۂ غدر میں بہ جمع بہادر گڑھ سے دہلی میں گرفتار ہو کر آئے
اور ساٹھ برس کی عمر میں وفات، پھانسی پائی۔ کلام یہ ہے

شمع رو تو ہے بے پردہ کہ پڑا یہ جو تفت — دیکھ محفل میں ابھی رشک سے جل جائے گا

ہو گئیں آپ چیں بہ جبیں بات بات پر — یہ جو ڈھنگ ہے تو ہو چکی صورت نباہ کی

تقدیر سے تو وہ بھی جفا کار ہی نکلا — جس پر کہ بھروسہ تھا ہمیں ہمدرد کا

یہ بھی ہر چند ترک کیا چاہیے ولے
محبت جو ہم سے ان سے ہوئی یہ گناہ کی

سوز۔ مولوی عبدالکریم دہلوی

مولوی عبدالکریم سوز خلف اصغر و تلمیذ ارشد حضرت مولوی امام بخش صہبائی کا سلسلہ پدری حضرت عمر فاروق رض تک اور نسب مادری شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ عربی فارسی میں صاحب منطق، حکمت اور دیگر علوم و فنون میں فارغ التحصیل، خداداد کو فن سخن سے وہ نسبت تھی جو بلبل کو چمن سے یا روح کو جسم سے۔ اس جوان مرگ کی عالی خیالی واہ، اور بلند پروازی اور مضمون آفرینی سبحان اللہ۔ ابتدائے سن شعور سے کسب کمال کا شوق، شوکت الفاظ کے ساتھ اچھوتے مضامین پیدا کرنے کا ذوق۔ اور کیوں نہ ہوتا طبیعت اچھی ذہن رسا، اس پر صہبائی کی شاگردی اور شفقت پدرانہ۔

سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ جوانی میں اپنے کمالات اور ستودہ اخلاق کے باعث یکتا ہوئے، روزگار، خلیق، بامروت، ملنسار تھے۔ ہر وقت فکر سخن میں غرق رہتے تھے۔ اکثر زمینوں میں سامعین غزلیں کہکر اپنے شاگردوں سے پڑھوا دیتے تھے۔ داد لینے میں انجمن سے گوئے سبقت لیجاتے تھے خاقانی ہند حضرت ذوق کی وفات پر ایک قطعہ مسمی بہ واقعہ "غضب خیز" ایسا لاجواب لکھا ہے کہ دیگر صنائع بدائع سے قطع نظر اکثر مصرعوں سے سال رحلت نکلتا ہے۔ ۱۲۷۴ھ میں ۲۳ برس کی عمر پاکر بعالم شباب گوروں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اور گنج شہیداں میں مدفون ہوئے۔ نمونہ کلام:

ہمارے دل میں حسرتیں ہیں کارواں در کارواں
مگر نہ ہو جائے کہیں پیکاں تمہارے تیر کا

چمن سے جاتی ہے اس طرح سے بہار اور ہائے
کسی طرح نہیں صیاد مہرباں ہوتا

تو مر نہ جائے کہیں سوز غم میں رک رک کر
ذرا تو حال کہا کر کسی سے یار اپنا

ہر سبزہ ہے اندر ترے رنگ شوخ سے
اب کے کچھ اور رنگ ہے ظالم بہار کا

تمہیں واں رات کو غیروں میں عشرت بسر کرنا
ہمیں یاں روتے روتے شمع ساں وقت سحر کرنا

ابھی دل میں ابھی آنکھوں میں ابھی دامن پر
اشک میں بھی تیری شوخی کا اثر آ ہی گیا

کچھ تیرا شہرہ ہوا، کچھ مری رسوائی ہوئی　　رفتہ رفتہ یوں یہ راز پنہاں ہو گیا

نہ تم ہو نہ ہم ہیں نہ باتیں پہلی

تفرقہ تھا جو مقدر میں نظر آ ہی گیا

ہائے قسمت کہ خزاں میں ہی گزر گئی ہے　　اور بہار آئی تو صیاد جفا کار کے پاس

ہیں تو چمن کے اندر پر دور باغباں سے

آزاد پھر رہے ہیں گم کردہ آشیاں سے

یہ تو یقیں تم ہم میں ہی ہو، پر یہ نہیں کھلتا کس جا ہو

دل میں تمنا سینہ میں ارماں جان میں حسرت رکھتے ہیں

سینکڑوں تیری اس سادہ مزاجی پہ نثار

اور قربان ہیں ظالم تیری ہٹ کے لاکھوں

الفت میں تری ہائے ہیں اس طرح سے اجڑے ہوں

اور خانہ اغیار ہو آباد غضب ہے

صیاد پھونک دیوے یا برق پھونک دیوے

اب ہاتھ اٹھا لیا ہے ہم نے بھی آشیاں سے

سچ ہے کچھ تو تمنا کہ پڑے پھرتے ہو

کیوں یہ کہتے ہو نہیں اس سے سروکار مجھے

اس کو ہے شوق ستم مجھ کو ستم کی خواہش

میں ستمگار کو درکار ستمگار مجھے

شائی۔ مرزا بختاور دہلوی

صاحب عالم مرزا بختاور شاہ خلف الرشید ظل سبحانی بہادر شاہ ثانی۔ مرزا الٰہی بخش کے داماد۔ اور حافظ قطب الدین مشیر کے شاگرد تھے۔

غدر میں مرزا مغل اور جنرل بخت خاں کے زیر کمان بختاور شاہ الگزنڈر پلٹن کے کرنل تھے۔ خوش اخلاق نیک اطوار اور شریف الطبع نوجوان تھے۔ شاہزادوں کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ دہلی کے معززین کے ساتھ فوجی کمیشن کے سامنے پیش کئے گئے۔ کمیشن نے انہیں مجرم قرار دیا۔ جمنا کی ریتی میں ان کو اور شہزادہ مرزا مینڈھو کو گوروں نے لے جا کر باڑھ مار دی۔[۱]

شاعری کے متعلق یہی کہہ دینا کافی ہے کہ زبان تو خاص ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ جب دوسرے اہل علم ان کی صحبتوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔ پھر ان کے لطف بیان اور سلاست کا کیا کہنا۔ افسوس تذکروں میں ان کا کلام زیادہ دستیاب نہیں ہو سکا صرف دو شعر حاصل ہو سکے ملاحظہ کیجئے ؎

لائے اے آہ جگر تو اسے یا نالۂ دل ۔۔۔ کون دونوں میں کرے جلد اثر دیکھیں تو

ایک پر زخم، ایک پر ہے داغ ۔۔۔ دل تو وہ کچھ ہے اور جگر یہ کچھ

---

[۱] واقعات دارالحکومت جلد اول ص۶۸۳

شرر مرزا غیاث الدین دہلوی

مرزا غیاث الدین نام تھا دہلی کے رہنے والے تھے ان کے والد مرزا قمر الدین شیدا اور دادا شاہ عالم بادشاہ تھے۔ شرر شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے۔ قلعہ کے باہر کوچہ بلاقی بیگم کے قریب ایک باغیچے میں رہتے تھے۔ وضعداری میں طاق اور ملنساری میں شہرۂ آفاق تھے۔ صاحب گلستان سخن ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"نوجوان خوش طبع، ظریف مزاج، جامۂ اہلیت اس صاحب مروت کی قامت پر قطع ہوا ہے۔ گاہ گاہ فکر شعر کرتا ہے"

گانے بجانے، راگ و ناچ دیکھنے کا ان کو بہت ذوق و شوق تھا۔ گانا سننے کے لئے ایک طوائف بھی رکھ لی تھی۔ بٹیروں اور کبوتروں کے پالنے کا بھی شوق تھا۔ ۱۲۶۳ھ میں تیس برس کی عمر تھی ۲۰۔ شعبان ۱۲۶۱ھ کے ہونے والے مولوی کریم الدین کے مشاعرے میں شامل ہوئے تھے[1] اور دہلی کے مشاعروں میں شامل ہوتے تھے۔

۴۵ برس کی عمر تھی کہ غدر میں پھانسی پائی۔ نمونۂ کلام

دعوی ہی محبت میں جنہیں مہر و وفا کا | نہ تجھ سے گلہ خاک کریں جور و جفا کا
شرر خدا سے ڈرو کل تھے سجدہ بت میں | اور آج تم کو یہ دعویٰ ہے پارسائی کا
ہر جفا کو تری وفا کہئے | یہ نہ کہئے تو اور کیا کہئے

---

[1] طبقات الشعراء صفحہ ۲۲

تجھے دکھاؤں تماشا میں بے وفائی کا ... پہ کیا کروں کہ مجھے منہ ہے آشنائی کا

پہنچائے اگر خاک مری کوچہ میں اسکے ... احسان نہ بھولونگا میں کبھی باد صبا کا

چشم دنیا ہے خوں ہے یا طوفاں ... کیا بلا ہے یہ ماجرا نہ کھلا

دل میں تجھے رکھ لیجے کہ آنکھیں تجھے دیکھیں ... تو ایک ہے اور شوق ہے کیا کیا نہیں ہم کو

شرر ہیں جب سے بتخانے میں آج ... نظر آتے تھے کل تو باخدا ہے

دلا کچھ بھی ہے ناز و غمزہ کی حد ... تجھے کیا بت ملا دیں گے خدا سے

نگاہ ناز ستمگر ہے تیرے سیدھی ... نہ لیک شیوہ کا زمیں کج ادائی کا

لاکھ پردے میں نہ پوشیدہ رہا پر ہم نے ... دیکھا جب دل کی نگاہوں سے نظر آ ہی گیا

روز کے ظلم و ستم اٹھ نہ سکے اے ظالم ... تنگ آخر ترے ہاتھوں سے تر آ ہی گیا

شیدا۔ مرزا قمر الدین دہلوی

صاحب عالم مرزا قمر الدین عرف میر کلو نبیرہ شاہ عالم ثانی۔ ولد ابو ظفر بہادر شاہ۔ صاحب خمخانہ جاوید نے یہ غلط لکھا ہے کہ مرزا آغا جان کے بیٹے تھے بلکہ مرزا قیام الدین کے صاحبزادے تھے اور خاقانی ہند حضرت ذوق کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں پچھتر برس کی عمر تھی کہ انہیں پھانسی دی گئی۔ کلام یہ ہے۔

کہتے نہ تھے ہم اے دل مت نام لے وفا کا ... تو نے وفا کا ثمرہ خانہ خراب دیکھا

مولانا امام بخش صہبائی

ہم سے آئی نہ یاران ہمنشیں کی خبر | خبر نہیں کہ کہاں جا کے قافلہ ٹھیرا
آیا ہے ستم ہے یہی پہاڑ | نہیں معلوم کیا ہوا دل کو
ہم نہ کہتے تھے کہ شیدا اس پریوش کے نہ ہو | اک نگہ میں کر دیا دیکھا نہ دیوانہ مجھے
مارا گیا مگر شیدا اس گلی میں | لاشہ پڑا ہوا ہے آج ایک نوجوان کا
عرق دیکھی ہے رخِ نازنیں پر | پڑی اس بلبل گل یاسمن پر

ہم اس چمن میں غنچہ تصویر ہیں صبا
کب سے بہار میں ہوس وا شدن نہیں

غیروں سے اُن کو اتنی بھی فرصت نہیں کہ ہم
کرلیں اب اُن سے بیٹھ کے ایکجا کلام دو

صہبائی ۔ مولنا امام بخش دہلوی

مولنا امام بخش صہبائی ان اہل علم لوگوں میں سے تھے جو بہت کم اور مدتوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے جامع صفات بزرگ تھے جن کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کا باطن و ظاہر قول و فعل ایک تھا باطنی اور ظاہری کمالات کی وجہ سے یہ مقبول اور پسندیدہ خلائق تھے ہر فن مولا اور انتہائی مہذب الاخلاق تھے۔

ان کا سلسلہ نسب والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی تک اور والدہ ماجدہ کی جانب سے حضرت محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانی

رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔[1]

آپ کے جد امجد بھی غریب سے دلسنت آئے۔ آپ کے والد ماجد تھانیسر سے دہلی آئے اور کوچہ چیلاں میں رہنے لگے۔

آپ کے والد صاحب کے دو صاحبزادے، مولانا امام بخش صہبائی اور حکیم پیر محمد بخش تھے۔ دونوں بھائی اپنے کمالات میں بے مثل تھے۔ اور دونوں کے صاحبزادے اپنے دور کے مشہور شاعر اور اہل کمال مانے جاتے تھے۔ مولانا صہبائی کے صاحبزادے مولوی عبدالکریم سوز اور مولوی عبدالعزیز عزیز تھے۔ اور حکیم پیر محمد بخش کے صاحبزادے عبدالحکیم بسمل تھے۔ یہ تینوں صاحبزادے اپنے خاندان کے اکیس افراد کے ہمراہ مولانا صہبائی کے ساتھ فرنگیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے جس کا ذکر آگے اپنی جگہ پر آئے گا۔

تعلیم

مولانا صہبائی نے علامہ عبداللہ خاں علوی سے عربی اور فارسی پڑھی۔ استاد کا اثر شاگرد پر بھی پڑا۔ اور مولانا صہبائی نے فارسی میں کمال حاصل کیا۔ اور عربی میں معقول استعداد بہم پہنچائی۔ شعر و سخن میں بھی وہ نام پیدا کیا۔ کہ نوعمری میں مرزا قتیل کے ہم پایہ عالم سمجھے جانے لگے۔ جس سے استاد کے نام کو بھی چار چاند لگے۔

مولانا عبداللہ خاں علوی کا اصل وطن جہاں آپ پیدا ہوئے شمس آباد تھا۔ لیکن بچپنے سے دہلی میں بود و باش اختیار کی تو گویا یہی

[1] آثار الصنادید صفحہ

وطن بن گیا۔ مولینا علوی کی فارسی دانی کا سکہ ہندوستان کے باہر کے ملکوں میں بھی تھا۔ عربی زبان میں کمال حاصل تھا۔ بہترین حکیم تھے تشخیص امراض میں مشہور رہے۔ گردش روزگار نے اتفاقاً فرخ آباد پہنچا دیا۔ وہاں حکمت شروع کی۔ خوب چلی۔ لوگوں کو فیض پہنچا۔ مریضوں کو اللہ تعالیٰ نے شفا عنایت فرمائی۔ مرزا دہلانے ان کے کمالات کا چرچا سنا تو ان کو اپنی رفاقت میں لے لیا۔ بڑی قدر کی وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ سنہ ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا۔[۱]

مولینا علوی کی انشا، صفیر بلبل، بہجت نامہ علوی وغیرہ کافی کتابیں ہیں۔ شعر و شاعری میں اپنے وقت کے مسلم استاد تھے۔ عربی فارسی کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ اُردو میں بہت کم شعر کہا کرتے تھے۔ ~

کیا دم تھا کل جو دیکھنے یار نسیم صبح	غنچہ کی طرح پھول گئے پیرہن میں ہم
دل غم سے تنگ ہو رہا یا الٰہی خوب	لائیں ہیں بخت غنچہ مگر اس چمن میں ہم
دامن سے جو ہوا نہیں کوئی بھی چراغ	جلتے میں سوز عشق لیے یوں کفن میں ہم
مت پوچھ سرنشیں کہ یہ ایام فراق کی	کس طور سے ہیں کاٹتے رنج و محن میں ہم

مولینا صہبائی کے علم و فضل کو جلا دینے والا ان کا علمی و ادبی ماحول تھا جس کے درخشندہ ستارے علامہ فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، حکیم مومن خاں مومن، حکیم آغا جان عیش، مولوی مملوک علی، مولوی کریم الدین، مرزا غالب، شیخ محمد ابراہیم ذوق۔

---

[۱] گلستان سخن ص ۲

شاہ نصیر، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، سید غلام علی وحشت، سرسید
اور ڈاکٹر سپرنگر وغیرہ تھے۔ سرسید آپ کے جگری دوست تھے چنانچہ
خواجہ حالی لکھتے ہیں۔

"مولانا صہبائی سے ان کی دوستی اخوت کے درجے کو
پہنچی ہوئی تھی"۔[1]

اس کے علاوہ مرزا غالب سے بھی آپ کے گہرے تعلقات تھے۔ مرزا
غالب فرماتے ہیں ؎

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شان

مولانا صہبائی ابتدا میں سوداگری کیا کرتے تھے۔ مدت کے بعد
جب ان کی لیاقت و علمیت اور فارسی دانی کا چرچا دہلی میں ہوا
تو امیروں کے بچوں کو پڑھانے لگے۔ چنانچہ گڑھ والوں اور بعض متمول
کشمیریوں اور متفرق مقامات کے طالب علموں کو پڑھا کر اپنا پیٹ
پالتے تھے۔ اس کے بعد نواب حامد علی خاں کے بچوں کو تعلیم دیتے رہے۔[2]
۱۸۴۲ء میں جبکہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا مسٹر
ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ ہند جو آخر میں اضلاع شمال و مغرب
کے لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے۔ مدرسین کے امتحان کیلئے دہلی آئے
اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر
ہے اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے مرزا

[1] حیات جاوید ص ۔ [2] طبقات الشعراء ص

نوشتہ صاحب کو بلایا گیا۔ مرزا پالکی میں سوار ہو کر سکریٹری کے ڈیرے پر پہنچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ اُنھوں نے فوراً بلا لیا۔ مگر یہ پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھہر گئے کہ دستور کے موافق سکریٹری ان کو لینے آئیں گے۔ جب بہت دیر ہوگئی اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے نہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائیگا۔ لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں۔ اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لئے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا کہ قاعدہ سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا مجھکو اس خدمت سے معاف رکھا جائے اور وہ گھر چلے آئے[1]۔ مومن خاں نے بھی انکار کیا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اُنھوں نے یہ خدمت چالیس روپئے ماہوار کی قبول کر لی۔ بعد میں پچاس روپئے ہو گئے[2]۔ کچھ عرصے کے بعد پرنسپل بوترس کے عہد میں آپ مدرس اول کے عہدے پر سرفراز کیے گئے۔

دہلی میں مشاعرے کی بنا قاضی سراج الدین خاں آرزو نے ڈالی تھی۔ اس زمانہ سے لیکر قلعہ معلیٰ تک یہ سلسلہ شاندار طور سے جاری رہا۔ خاص طور پر بہادر شاہ ظفر کے عہد میں دہلی کے مختلف مقامات دہلی کالج اور قلعہ معلیٰ میں تاریخی یادگار کثرت کے ساتھ

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۳۲ [2] مرحوم دہلی کالج صفحہ ۱۵۳

مشاعرے ہوتے تھے۔ چنانچہ قلعہ میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں مولینا صہبائی اور مرزا غالب کی ہم طرح غزلیں تھیں۔ دونوں غزلوں کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ مولینا صہبائی کی غزل کے اشعار یہ تھے:۔

نہ کس یارب علاج درد ہجرانم نمی آید
شدم خاک و ہنوز آن ترک جولانم نمی آید

نیازم پاس ناموس تمنا کرد در بزمش
سخن تا لب نگہ تا نوک مژگانم نمی آید

چو نشنیدم غالب آزردہ را از بند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید

مرزا غالب:۔

چہ عیش از وعدہ چون باور ز عنوانم نمی آید
بہ نیرے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

دلّی اس وقت آج کی جیسی دلّی نہیں تھی۔ مولینا صہبائی ذوق، غالب، نیر، آزردہ، شاہ نصیر وغیرہ جیسے کتنے سخنوران باکمال کا جمگھٹا تھا۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا اور جل مرتا ہوگا۔

ادبی، علمی و سیاسی محفلیں

مولینا فضل حق خیرآبادی کے رحمتہ اللہ علیہ کے یہاں ان کے والد ماجد مولوی فضل امام صدر الصدور کے وقت سے روزانہ بعد نماز عصر مشاہیر دہلی کی صحبت رہا کرتی تھی۔ معمولی لکھے پڑھے لوگ وہاں جا نہیں سکتے تھے۔ رات کو مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے یہاں محفل جمتی۔ مولینا صہبائی دونوں محفلوں کے بیٹھنے والے تھے مفتی صدر الدین کا مکان ٹیا محل کے قریب حویلی عزیزآبادی

اور مسجد دو جانہ کے سامنے ہے جو ابھی تک اُن کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ اور حویلی صدر الصدور کے نام سے مشہور ہے۔ ٹیا محل میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ رہتے تھے۔ مکان کوٹھی نما تھا۔ مغربیت و مشرقیت کے نمونہ کا تھا۔ ان محفلوں کا نقشہ مولینا ابوالکلام صاحب آزاد نے کھینچا ہے:۔

"والد مرحوم دہلی کے دیوان خانوں کی مجلس کے جو افسانے سنایا کرتے تھے۔ بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اجالا تھے۔ مرحوم دہلی کی ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی۔

مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا گرمی، برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی نو وارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو یک مجلس دیکھ لے وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رخ کرتا۔ ان صحبتوں کے رکن ایک حضرت صہبائی بھی تھے۔ کالج سے لوٹتے گھر آتے پھر شام کو ہوا خوری کے بجائے مولینا فضل حق خیر آبادی کے یہاں جاتے وہاں سے پھری ذاکبات کھاتے۔ شب میں بعد نماز عشا مفتی صاحب کے یہاں جاتے۔ یہاں کی محفل برخواست ہوتی تو گھر جاتے۔"[1]

---

[1] غالب صفحہ ۲۹

ان دیوان خانوں میں علمی مذاکروں کے ساتھ سیاسی تبادلۂ خیالات بھی ہوتے تھے۔ قلعہ معلّٰی کے حالات اور بہادر شاہ ظفر کی بے بسی اور انگریزکے دن بدن بڑھتے ہوئے اقتدار پر تبصرے بھی کئے جاتے تھے اور خاص طور پر دہلی کالج کے مشنریوں کی حرکات کا بھی جائزہ لیا جاتا تھا۔ دہلی کالج دہلی کے عیسائی مشنریوں کا گڑھ بنا ہوا تھا اور ان کا سرغنہ دہلی کالج کا پرنسپل ٹیلر تھا۔ جو اپنی ابلہ فریبیوں سے ہندوستانیوں کے مذہب کو بدلوانے اور عیسائی بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ اور اپنے پرفریب اخلاق اور محبت آمیز سلوک سے طالب علموں کو مسحور و گرویدہ کرلیا کرتا تھا۔ اور میٹھی میٹھی باتیں کرکے عیسائی مذہب کی فوقیت اور افضلیت دلوں میں بٹھا دیتا تھا۔ چنانچہ اس کے دو شاگرد ماسٹر رامچندر اور ڈاکٹر چمن لال ۱۱ جولائی ۱۸۵۲ء کو عیسائی ہوگئے جسکی وجہ سے دلی والوں میں بڑی بےچینی پھیل گئی تھی۔ اور طالب علموں نے کالج سے اپنے نام کٹوانے شروع کردیئے تھے۔

دہلی کالج کا مسٹر ٹیلر کی کوششوں سے جو ماحول پیدا ہوگیا تھا، اور طالب علموں کے دماغوں پر عیسائیت کا غلبہ مسلط کیا جاتا تھا اسکا ذکر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم نے اپنے ایک لیکچر میں کیا ہے [۱]۔

"سائنس کی صدائیں کالج کے در و دیوار میں بڑی گونج رہی تھیں

---

[۱] لیکچروں کا مجموعہ دوئم صفحہ ۲۲۳

بلکہ ایک وقت تو ایسا آگیا کہ گو بجتے گو بجتے ڈھول بجنے
لگے یعنی سائنس کے پروفیسر جناب ماسٹر رامچندر جو علمی
سوسائٹی میں بڑے آدمی تھے اصطباغ لینے پر آمادہ ہوگئے
اور انھوں نے ڈنکے کی چوٹ عیسائی ہونا چاہا تو تمام
شہر میں ڈھنڈورا سا پٹ گیا۔ اور جا بجا مباحثے کی
مجلسیں گرم ہو گئیں۔ عربی جماعتوں کے مولوی اور
طالب علموں کے ساتھ بھی آئے دن چھیڑ ہوتی رہتی تھی۔
لیکن میں دیکھتا تھا کہ مولوی چپ تو نہیں ہوتے تھے کچھ
نہ کچھ کہے ہی جاتے تھے۔ مگر وہ کہنا سمجھنے والے کے نزدیک
لاجواب ہونے کے برابر تھا۔ اس لئے کہ یہ لوگ عیسائی
مذہب کے گہرے بھید سے محض ناواقف تھے۔ ان کو
خبر ہی نہیں تھی کہ عیسائیوں میں کہاں پانی مرتا ہے ورنہ
تمام معارضہ بالمثل ماسٹر صاحب کو بند کرنے کے لئے بس
کرتا تھا۔ غرض بات کہوں صاف سائنس کے زہر نے
باوجودیکہ میں نے اس کو ذرا کی ذرا چکھا ہی تھا میرے
ایمان کو ڈانواں ڈول کر دیا تھا۔"

مولینا فضل حق اور مفتی صدرالدین آزردہ کے دیوان خانوں میں
بیٹھنے والے مولینا امام بخش صہبائی روزانہ بحیثیت صدر مدرس اور
مفتی صدرالدین آزردہ ہمراہ امتحان لینے کے لئے جاتے تھے دہلی

کالج کی سازشی چالوں کے پھیلنے کا نقشہ دیکھتے تھے نوابوں راجاؤں کی سلطنتیں چھنکر ان کو بے دخل کیا جا رہا تھا۔ وہ بھی ان کے آنکھوں میں نقشتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف کافی مواد پک چکا تھا۔ دلی میں آزادی کی تحریک ۱۸۵۷ء میں شروع ہو چکی تھی مولانا فضل حق کے ساتھیوں نے جہاد کا فتویٰ مرتب کیا اس کی تائید تصدیق مفتی صدر الدین آزردہ نے فرمائی۔ عمل مولینا امام بخش صہبائی نے کیا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ بھی پروگرام کے مطابق دلی داخاں کے ساتھ بغاوت کی آگ لگانے میں مصروف ہو گئے۔ معرکے ہوئے۔ جنگی صلاحیت قوم میں نہیں تھی اس لئے شکست ہوئی۔

شہادتِ خاندان

دہلی میں سب سے زیادہ کوچہ چیلاں میں رہنے والوں پر مصیبت آئی۔ قلعہ معلی کا قرب بھی اس محلّے کو حاصل تھا۔ اس محلے میں بڑے بڑے عالم، فاضل اور نامور علما اور اہل فن رہتے تھے۔ بڑے صاحب کمال لوگوں کا مخزن تھا۔ مولینا شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبد العزیزؒ دہلوی کا گھرانا اسی محلہ میں آباد تھا۔ سر سید احمد کا خاندان بھی اسی محلّے کے ایک حصہ میں رہتا تھا۔ منشی ذکا اللہ بھی اسی محلّے کے باشندے تھے۔ مولینا صہبائی اور ان کا خاندان بھی اسی محلّے میں سکونت پذیر تھا۔

چند معتبر راویوں کی زبانی اس محلّے کے لوگوں کی تباہی اور خاص طور پر مولینا امام بخش صہبائی کے پورے خاندان کی بربادی و ہلاکت کی

داستان سنئیے۔

"معین الدین صاحب جو غدر کے زمانہ میں پہاڑ گنج کے تھانیدار تھے اپنے چشم دید حالات لکھتے ہیں۔

"نواب شیر جنگ خاں کے صاحبزادے محمد علی نے جو دادری کے راجہ کے بھتیجے تھے اپنے تحفظ کے لئے مکان کے دروازے بند کر لئے تھے۔ چند گوجروں اور لوہنیوں نے جو شہر میں لوٹ مار میں مصروف تھے۔ دروازوں کو کھولنے کی کوشش کی۔ کوشش ناکام رہنے کے باعث وہ دیواروں پر چڑھ گئے۔ ایک انا جو یہ نظارہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی اپنے گود میں بچہ کو لیکر کنوئیں میں گر پڑی گھر کی دیگر خواتین نے اس کی تقلید کی اور اسی کوئیں میں گر کر ہلاک ہو گئیں محمد علی نے وسط مکان سے بندوق چلائی۔ اور تین لوہنیوں کو مار گرایا۔ اس پر ایک بڑی فوج مکان پر حملہ آور ہوئی۔ اور تمام اہل خانہ کو قتل کر ڈالا محمد علی بھی مقتولین میں تھے۔ مگر آخر وقت تک لڑتے رہے تھے۔ ساٹھ ہتیار بند آدمی جس میں شیخ امام بخش صہبائی اور ان کے صاحبزادے بھی شامل تھے جو اسلامی کالج سے متعلق تھے باغی سمجھکر قتل کر دیئے گئے۔ اس میں فلاح اللہ خاں بھی تھے جو اپنے زمانہ میں مشہور ر

طبیب بنتے تھے۔"

منشی ذکاءاللہ مرحوم نے جو روایت اپنی تالیف "تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ" میں بیان کی ہے وہ یہ ہے۔

"مسلمانوں کا کوچہ چیلوں کا بالکل قتل ہوا۔ اس پر آفت آئی کہ اس میں کوئی سپاہی انگریزی لشکر کا زخمی ہوا، یا مارا گیا۔ سپاہی کو کسی نے گھائل کیا۔ اس کے باب میں روایات مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ نواب شیر جنگ کے بیٹے محمد علی خاں نے کوئی کہتا ہے حکیم فتح اللہ خاں نے ایک سپاہی کو اس لئے زخمی کیا کہ ان کے زنانہ میں بدنیتی سے جانا چاہتا تھا۔ غرض اس قصور میں کہ اس محلہ میں ایک سپاہی قتل ہوا، حاکموں نے حکم دیا کہ اس کوچے کے سارے مردوں کو مار ڈالو، پکڑ کے لے آؤ بہت سے مردوں کو تو سپاہیوں نے ان کے گھروں میں مار ڈالا کوئی گھر ایسا نہ تھا کہ جس میں کوئی مارا نہ گیا ہو۔ کچھ آدمی زندہ بھی گرفتار ہوئے۔ جن کو حکم ہوا کہ جمنا کی ریتی میں قلعہ کے نیچے گولی سے مار دیئے جائیں۔ سپاہی ان کو ریتی میں لے گئے۔ ان پر سپاہیوں نے صرف گولیوں کی ایک باڑھ ماری۔ ان میں سے تنہا آدمی مرزا مصطفیٰ بیگ[1]

[1] غدر کی صبح و شام ص۳

اور وزیرالدین زندہ بچے۔ جو اس قتل کا حال بیان کرتے ہیں کہ ہم سب اس بستہ جمنا کی ریتی میں گئے۔ گولیوں کی باڑھ ہم پر سپاہیوں نے صرف ایک دفعہ ماری پھر وہ چلے گئے۔ بہت سے تو گولیوں کے لگتے ہی سرد ہو گئے۔ بعض ان میں سے دریا کی طرف بھاگے۔ آگ سے بچے مگر پانی میں ڈوب کر مرے۔ ان دو آدمیوں میں سے مصطفےٰ بیگ قلعہ کی طرف بھاگ گئے۔ ان کے کوئی گولی نہیں لگی تھی اور وزیرالدین مہابت خاں کی ریتی کی طرف دوڑے ان کی ساق میں ضعیف سا گولی کا زخم لگا تھا۔ یہ دونوں بچکر زندہ سلامت رہے۔ ان مقتولین میں بے گناہ ایک صاحب کمال مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے کنبے کے اکیس مرد تھے۔ جن میں سے مولوی صاحب کا بھانجا جو داماد بھی تھا وزیرالدین بچا باقی سب فنا ہوئے... دوسرے ایک صاحب کمال جو بے گناہ قتل ہوئے وہ سید احمد میاں میر پنجہ کش خوشنویس تھے۔ جو خوشنویسی میں سارے ہندوستان میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔"

دہلی کے مشہور شاعر سید ظہیر الدین دہلوی نے بھی ایک کتاب "داستان غدر" لکھی ہے وہ اس دردناک واقعہ کو اس انداز سے ضبط تحریر میں لائے ہیں۔

جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے ان میں کئی اشخاص نامور مثلاً فرزند زکار مارے گئے ہیں جو دہلی کی ناک اور یگانۂ آفاق تھے جن کی نظیر آج تک پیدا نہیں ہوا اور نہ ہوگا میاں محمد امیر پنجہ کش خوشنویس جنکا ثانی روئے زمین پر نہیں مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹے اور میر نیاز علی واقعہ خواں اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف خاندانی لوگ، سنا گیا ہے کہ اس محلے کے چودہ سو آدمی گرفتار کرکے راجگھاٹ کے دروازے سے دریا پر لیجا کر بندوقوں کی باڑیں ماردی گئیں۔ اور لاشیں دریا میں پھنکوا دی گئیں۔ عورات کا یہ حال ہوا کہ گھروں میں سے نکل نکل بچوں سمیت کنوؤں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچے کے تمام کنوئیں لاشوں سے پٹ گئے تھے؛

اس المناک حادثے کو مختصراً مصور غم علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ نے میر تادر علی سے نقل کیا ہے[۱]

"مولینا تادر علی صاحب مولینا صہبائی کے حقیقی بھانجے تھے اور ان ہی کے ساتھ ان کے گھر میں رہتے تھے ایک موقعہ پر بیان کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولینا صہبائی کے ساتھ کٹڑہ مہرپرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا۔ کہ گورے دندناتے آپہنچے۔ پہلی ہی رکعت تھی کہ

[۱] دلی کی آخری بہار ص۳۵

امام کے عمل فسے ہماری شکلیں کس طرح بگڑ گئیں شہر کی حالت
نہایت خطرناک تھی اور دلی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی
ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں
دیدی تھیں۔ اس لئے ہم سب گرفتار ہو کر دریا کے کنارے
پر لائے گئے۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آن کر کہا کہ موت
تمہارے سر پر ہے۔ گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا
تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں
وہ دریا میں کود پڑیں۔ میں بہت اچھا تیراک تھا۔ مگر
ماموں صاحب یعنی مولینا صہبائی اور ان کے صاحبزادے
مولینا سوز تیرنا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے دل نے گوارا
نہیں کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں لیکن ماموں صاحب
نے مجھے اشارہ کیا۔ اس لئے میں دریا میں کود پڑا۔ پچاس
یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان
میں آئیں۔ اور صف بستہ گر گر گئے۔"

مولینا صدر الدین آرزدہ نے جب مولینا صہبائی کی شہادت کا ذکر
سنا تو بے اختیار چیخ اٹھے۔

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو | قتل اس طرح بے جرم جو صہبائی ہو

حضرت اکبر آبادی اس غمناک واقعہ کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں ؎

نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بے جرم و قصور | ماریں گولیاں بایا جسے کچھ ذی مقدور

ہے غم صہبائی جو تھے حبیب ناز دلِ نصیل ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

مولینا صہبائی ہی کو فرنگیوں نے شہید ہی نہیں کیا بلکہ مولینا صہبائی کا مکان بھی کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا تھا۔[1] مولینا صہبائی کے صاحبزادوں اور بھتیجے کے علاوہ مولینا کے شاگرد مرزا رحیم الدین ایجاؔ مرزا ایلچی رفعت اور ان کے قرابتدار منشی اکرام الدین رندؔ بھی فرنگیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ ان کے علاوہ احمد مرزا خلف محمد جان صاحب جو عالم مرزا مغل سپہ سالار اعظم کے مشیر کار تھے کوچہ چیلان کے یہ بھی باشندے تھے۔ جب مولینا صہبائی گرفتار ہوئے۔ اور گوڑگانوہ میں دوسرے لوگوں کے ساتھ فورٹ گوڑگانوہ کے کلکٹر کے حکم سے ان کے گولی مار دی گئی۔

مولینا صہبائی کی قابلیت و لیاقت کا ہر اہلِ علم پر سکہ تھا۔ ان کے ہمعصر ادیب اور ناقدان کی خداداد ذہانت و فراست کے معترف تھے ان کے ہمعصر مولینا کریم الدین طبقات الشعراء میں لکھتے ہیں۔

"فارسی میں بڑی قدرت رکھتے تھے ہمارے زمانہ میں کتب فارسی میں مثل ان کے کوئی ماہر نہیں تمام کتب فارسیہ پر عبور ہے۔

سر سید مرحوم "آثار الصنادید" میں اپنی رائے لکھتے ہیں۔

"کمالات ظاہری اور جلائل باطنی اور حسن خلق اور محامد اطوار میں پسندیدہ خالق و مقبول خلائق ہیں.... ایسی جامعیت کے ساتھ کم کوئی نظر سے گذرا ہے اور طرفہ یہ ہے کہ فنون متعارفہ سخن وری مثل تحقیق لغت اصطلاحات

---

[1] تاریخ ادب اردو سکینہ ص ۸۱

زبان دری، اور تحقیق مقالات کتابی، اور تکمیل عروض و قافیہ اور استکمال فن معمہ وغیرہ میں ایسا کمال بہم پہنچایا ہے کہ ہر فن میں یک فنی کہنا چاہیئے۔"

تصنیف و تالیف مولینا صہبائی کا تدریس و تدریس کے بعد تمام وقت تصنیف و تالیف میں گذرتا تھا۔ فارسی میں بکثرت سے کتابیں لکھیں۔ مولینا نے صحیح معنوں میں اردو کی خدمت کی ہے۔ سر سید کی مشہور تاریخی کتاب "آثار الصنادید" کی ترتیب میں صہبائی صاحب نے کافی حصہ لیا۔ "گلستان سخن" بھی آپ کے مشورے کی مرہون منت ہے۔

مولینا صہبائی نے ۲ مئی ۱۸۴۳ء "انگوٹھی جواہر" مع فرہنگ سہ نثر ظہوری کی طرز پر لکھی تھی جس میں بہادر شاہ ظفر کی ستائش لکھی گئی ہے۔ جس وقت بہادر شاہ ولیعہد تھے۔

۱۲۵۰ھ میں دین دیال منشی ایجنسی بھوپال نے مولینا صہبائی کی فارسی مضامین اور مختصر رسالوں کو جمع کرکے کلیات صہبائی اس کا نام مرتب کرکے طبع کرایا۔

اعلاد الحق در جواب رسالہ احقاق الحق سراج الدین علی خاں آرزو: مولینا صہبائی نے خان آرزو کے جواب میں لکھا۔ جس میں آرزو کے اعتراضات کا معقول جواب دیا ہے جو خان موصوف نے شیخ علی حزیں کے کلام پر کیئے ہیں۔ آپ نے شیخ علی حزیں کی حمایت کی ہے اور آرزو کے اعتراضات کو حسد و بے انصافی پر محمول کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"معلوم نیست کہ قول معترض نتیجۂ غلبات حسد بے انصافی
ہست یا از کم توجہی ہائے دوراندیشان نشآت فصحا۔۔۔۔

ایک اور اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"صاحب دماغان عالم انصاف می دانند کہ زکام نرسوزن
گیہائے دماغ حسادرا چہ علاج"[1]

۱۸۴۲ء میں "خلاصۂ دیوانہا" شائع ہوا جس میں اُردو کے مشہور شاعر
ولی۔ درد۔ سودا۔ میر۔ جرأت۔ جسن۔ نصیر۔ ممنون۔ ناسخ۔ برجیند
ذوق اور مومن کے کلام کا انتخاب ہے۔ انتخاب کے ساتھ شاعروں
کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ جس کو ایک قسم کا تذکرۂ شعرا کہنا چاہیئے
یہ کتاب اُردو زبان میں ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں مولٰینا صہبائی
نے ہندوستانی شاعری اور اس کی زبان کی خاص خاص نظموں کی
بحروں پر بحث کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بہترین مثالیں دی ہیں۔[2]
منشی شمس الدین فقیر کی تصنیف "حدائق البلاغت" کا اردو
ترجمہ ۱۸۴۴ء میں کیا۔ جو صرف کہنے کو ترجمہ ہے ورنہ اصل میں اُردو
میں فن بلاغت کو مرتب کیا ہے۔ یہ اردو میں اس فن کی پہلی مکمل و مستند
کتاب ہے۔

"اردو صرف و نحو پر بھی ایک مفید کتاب لکھی ہے جس کے آخر
میں ترتیب کے ساتھ حروف تہجی اردو کے محاورات اور کہیں کہیں

---

[1] کلیات صہبائی صفحہ ۷۶ [2] خطبات دتاسی صفحہ ۹۵

غرب الامثال بھی درج ہیں۔"

ایک سالہ معمے کے حل میں ۱۸۶۸ء میں لکھا تھا اس میں ایک شعر سے سات سو نام نکلتے ہیں۔

حلیہ مولینا صہبائی کا درمیانہ قد تھا۔ کھلا ہوا گندمی رنگ، منہ پر چیچک کے داغ، مہندی سے رنگی ہوئی سرخ داڑھی پرانی وضع کا لباس، ایک برکا سفید پاجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری شال کا جبہ، سر پر چھوٹا سا سفید عمامہ ہوتا تھا۔ دبلے پتلے تندلاغر اندام تھے۔

مولینا صہبائی ایک معلم ہی نہیں بلکہ ادیب از زمانے ہوئے شاعر تھے۔ اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ فارسی میں انہوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن اردو میں ان کا کلام دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ میں نے جستجو کی۔ ایک روز اتفاقاً بحر الفصاحت مولفہ مولوی حکیم محمد نجم الغنی کا مطالعہ کر رہا تھا۔ تو اس میں مولینا صہبائی کے حسب ذیل تین شعر اردو کے نظر پڑے :-

دیکھنا منہ لال ہو جائینگے کس کس کے ابھی ... سامنے میرے جو برگ سبز پان تجھ نے دیا

آتش غم ایسی کچھ بھڑکی کہ دل میں رہ گیا ... داغ دل سے آفتاب روز محشر آشکار

مجھے دیکھکر تیغ کو دیکھتے ہیں ... غرض یہ کہ ہو خون ناحق کسی کا

فارسی کلام:[۱]

یارب آں کن مجنوں دل دیوانہ ما ... کہ شود بال پری نالہ مستانہ ما

[۱] دلی کی آخری شمع ص۲۳

قبول خاطر کونین را نمی ارزم — ز بیکسی لحد آہ و درد کنار مرا
شد دلم جلوہ گر حسن تو و جانم سوخت — آتش از خانہ من سر زد و سامانم سوخت
آتشے بود کہ خبر کعبہ نباشد سنگش — برق آن کفر کہ در خرمن ایمانم سوخت

مولینا صہبائی کے لاتعداد شاگرد تھے۔ علما کے علاوہ بہت سے امیروں اور شاعروں نے ان کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ قلعہ معلیٰ کے اکثر شاہزادے اور متوسلین ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کی تخصیص نہیں ہے۔
ان کے شاگردوں کا مختصر سا حال اور چند شعر نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں تاکہ ان کے ساتھ ان کے سعادتمند شاگردوں کا بھی ذکر خیر آجائے۔

(۱) آہی | میر عبدالرحمٰن خلف ارشد میر حسین تسکین شاگرد اور برادرزادہ حکیم مومن خاں مومن تھے درسی کتابیں مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھی تھیں معمے کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ اور سرکار رامپور سے وظیفہ پاتے تھے۔ عربی و فارسی کی تحصیل عالمانہ درجے تک پہنچی ہوئی تھی، صاحب مذاق سلیم، سخن فہم بے نظیر۔ بڑے علیم خلیق اور ملنسار زندہ دل لوگوں میں سے تھے مومن نے ان کو متبنّیٰ کر لیا تھا۔

شکوہ کہاں کا کیسا گلہ جی نکل گیا — شرما کے یار نے جو نہی نیچی نگاہ کی
اٹھ کہیں ہے آمد آمد اس ستمگر کی یہاں
اہل محشر مجھکو یہ مژدہ سنا کر لے گئے

(۲) **اختر** | منشی عبدالرزاق خلف منشی عبدالرحمن تمنا۔ خنا گرد صہبائی دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ بہت مدت تک مولانا صہبائی کی خدمت میں رہ کر زبان فارسی اور فن سخن میں کمال حاصل کیا۔

کلام پاکیزہ اور پر لطف ہے۔

پہلو میں درد سینہ میں چاک، اشک آنکھ میں
مجھ سے تو کہہ اختر ترا دل لگا کہیں

عشق بتاں میں خاک بسر ہے تو اے اختر
دنیا خراب اور ترا دیں بھی خراب ہے

(۳) **اوج** | لالہ جگل کشور دہلی کے رہنے والے تھے، نیک نہاد صاف طینت۔ ان کا سینہ محبت کا گنجینہ تھا۔ اردو میں شعر نہیں کہتے تھے فارسی میں فرمایا کرتے تھے۔

بباز ارش نبودم زاں متاع طاعت خود را
کہ می بینم گراں آنجا بہائے جنس عصیاں را

آں کیست کہ باز ست کشد از راحت عاشق
تو خود نہ پسندیدہ آرام دل ما

(۴) **بسمل** | نواب امیر حسن خاں ساکن دارالامارۃ کلکتہ کے مزاج میں باوجودیکہ دولت مند تھے مسکینی تھی۔ متواضع بحد تھے۔ بقول صاحب گلستان سخن۔

"دقائق سخن سے آگاہ، صنائع و بدائع میں کامل دستگاہ، نظم و نثر میں باوجود صفائی الفاظ و رشتگی عبارت

کے تلاش معنی کا رتبہ نہایت کو پہنچ گیا تھا۔

یہ بھی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ٥

سرمۂ خون بچشم کم منگر | دیدہا زین غبار روشن گشت
لالہ را خلعت گلگوں صلۂ یک شوخی است | بہر من چیست کہ نامم از شمار افتادہ

(۵) بلبل پنڈت گوری شنکر لاہور کے رہنے والے تھے۔ نوجوان خوش مزاج تھے۔ اتفاقاً دہلی میں گئے اور مولینا صہبائی کی خدمت سے مستفید ہوئے۔ ٥

اگر بچشم جہاں نیست عزتے غم را | چرا کنند سر سالہا محرم را

(۶) تمنا عبدالرحمن تمنا مولوی محمد حسن ہجر کے برادر حقیقی تھے قصبہ جیور کے قاضی زادوں میں سے تھے۔ مولینا صہبائی سے دہلی میں آکر فارسی پڑھی اور فارسی کلام کی اصلاح بھی مولینا صہبائی سے لی۔ بہت خوش اسلوب تھے اور طبیعت سلیم کے مالک تھے۔ ٥

ایں قدر آشفتگی ہر زم چرا بودی مرا | آشنا گر اول بت آں نا آشنا بودی مرا

(۷) حسرت منولال کایستھ تھے۔ لالہ پیارے لال وکیل کے صاحبزادے تھے۔ کتب فارسی مولینا صہبائی سے پڑھی اور اصلاح سخن بھی ان سے لی۔ ٥

کریم در خزانہ دل جمع نقد داغ | لالہ چو زر کواۃ ہے بے حساب مرا

(۸) حیرت حافظ عبدالرحمن جھنجانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ فن شعر میں مولینا صہبائی سے استفادہ کیا

اور فن طب کی تکمیل حکیم احسن اللہ خاں دہلوی سے کی۔ محکمۂ دیوانی میں ملازم ہوئے۔ سر سید احمد مغفور آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ رسالہ تہذیب اخلاق کی بنیاد آپ کے ہاتھوں قائم ہوئی۔ سید محمود کے بھی اُستاد تھے۔ پینتالیس سال تک سر سید مرحوم کے پاس رہے اور تا دم مرگ ان سے جدا نہ ہوئے۔ فن شعر کے اصولوں سے خوب واقف تھے۔ اعلیٰ درجہ کے مشاق تھے۔ صفائی و سادگی کے ساتھ ان کا کلام بامزہ ہے۔ ؎

کچھ دل میں بے کلی ہے کچھ ہے جگر میں سوزش
ہیں عشق کی بدولت مجھ پر عذاب کیسے

نہ کھلا ہائے مرا غنچۂ امید کبھی
حسرتیں دل کی ہیں دل ہی میں کیا باقی

(۹) رحمت رحمت علی رحمت مولٰنا صہبائی کے قرابت دار تھے مثنوی "نالۂ بلبل"، "حدیقہ رحمت" اور مثنوی "شکایت فلک" ان کی یادگار ہیں۔ کتب درسیہ اور رسائل عروض مولٰنا صہبائی سے پڑھے ؎

ابر بہار کی سی مجھے چشم تر ملے
جوں برق اضطراب مجھے یارب جگر ملے

تیرا ہی کچھ یہ طور نرالا جہاں سے ہے
ورنہ یہ رسم ہے کہ بشر سے بشر ملے

(۱۰) زار حافظ امام بخش نابینا تھے۔ تھانیسر کے رہنے والے تھے مولٰنا صہبائی سے کتب درسیہ فارسی پڑھی تھی۔ علم موسیقی و علم دعوت میں کمال حاصل تھا۔ ۱۲۸۰ھ میں انتقال ہوا ؎

دکھلاؤں چارہ گر کو جو زخم جگر تو وہ — نوڑ کے یوں کہے ہی کہ اسکا نہیں علاج
ذکر یوں نہ پتا ہو کسی مسکین اہل غمناک کو — ابکے ہی لاتا ہے اس آشنا بیباک کو

(۱۱) **سحر** | احمد علی خاں سحر۔ والد کرم علی خاں تھے۔ سحر نوجوان تھے کتب درسی فارسی مولانا صہبائی سے پڑھی۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ کلام بامزہ اور لذیذ ہے۔

ہوئی زخمی مژہ کی اور نگاہ چشم دلبر کی — نہیں محتاج ہم نوک سنان اور دم خنجر کے

(۱۲) **شرر** | منشی امام شرر [illegible] کا بستہ تھے۔ علم فارسی و عربی مولانا صہبائی سے پڑھی۔ اور اشعار کی اصلاح ان سے لیتے تھے۔ جوان متین۔ صاحب خلق پسندیدہ اطوار تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔

صبحدمے نالہ کشم بادل داغ از جوش جنوں
گل ہم آغوشی کند با بلبل شیدائے ما

(۱۳) **شفقت** | سید محمد حسین گلاؤٹھی کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مولانا امام بخش صہبائی سے عربی و فارسی فنون حاصل کئے تھے۔ ذہین و فہیم نوجوان تھے۔

کس کس سے میں بچاؤں دل ناتواں کو آہ — اس فتنہ گر سے یا فلک بد شعار سے
وہ دن گئے کہ خواہاں تھے وصل کے اور اب تو
ایک لطف کی نگہ کے امیدوار ہیں ہم

(۱۴) **شوق** | عنایت اللہ شوق۔ فرید آباد کے رہنے والے تھے۔ فارسی اردو کلام مولانا صہبائی کو دکھاتے تھے۔ شعر بدیہی

کرنے کے لئے پنجاب میں چلے گئے تھے۔

کروں میں شکوۂ اغیار کس طرح جب بخت ہی — ملا ہو یار ہی قسمت سے بیوفا مجھ کو
ایک عالم کو ہے آرام کی خواہش پر دل — نہیں معلوم غم زدہ کا خواہاں کیوں ہے

(١٥) صابر | مرزا قادر بخش صابر خلف مرزا اکرم بخت نبیرۂ مرزا امیر الدین جہاندار بادشاہ دہلی مولٰنا صہبائی اور عبدالرحمٰن خاں احسن کے شاگرد تھے۔ صاحب دیوان ہیں۔ "تذکرہ گلستانِ سخن" ان کی تالیف ہے۔

مجھ سے ہی چاہتا ہے نہ سر ستم کی داد — سمجھا ہے اپنے ظلم کا اک قدرداں مجھے
محفل میں ہم تو اس لب میگوں کے سامنے — نام شراب لے کے گنہگار ہو گیا

(١٦) عیش | رائے عزت سنگھ منشی دفتر خالصہ تھا۔ نوجوان خوش خلق و نیک نہاد تھا۔ علوم ضروری سے آگاہ اور قواعد سخنوری سے واقف تھا۔ فارسی اشعار کی اصلاح مولٰنا صہبائی سے اور اردو میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتا تھا۔

رہے جب تک کہ نیچے تھا زمیں پر خود بخود — بنگی کیا ناک پر اب نگاہ یار اونچی ہے
ہو پست و بلند دہر سے غافل تو اے منعم — کہیں نیچی کہیں یہ راہ ہموار اونچی ہے

(١٧) غریب | غریب اللہ غریب شاہ آباد کے رہنے والے تھے۔ شروع میں مومن سے استفادہ کیا۔ انگریزی پلٹن میں ملازم ہوئے۔ باہر چلے گئے تو مولٰنا صہبائی کو اصلاح لینے کے لئے کلام بھیج دیتے تھے۔

خضر نہ عیسیٰ نہ جام آب حیات — لب سے کچھ ہمسری نہیں رکھتے

(۱۸) **فدا** مرزا بلند بخت دہلوی خلف شہزادہ مکرم بخت برادر حقیقی مرزا آقا ندبخش صاحب صاحب گلستان سخن مولانا صہبائی کے شاگرد تھے۔ سخن فہم اور نیک نہاد تھے۔

حشر میں پرسش مری پہلے ہو یارب ورنہ میں
جب ملک چپکا رہوں گا جی مرا گھبرائیگا

(۱۹) **فغاں** پنڈت لالجی پرشاد جیہہ علیم نوجوان تھے۔ علم فارسی کے بڑے ماہر تھے۔ مولانا صہبائی کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔

کاش از بہر سادات من خصم فلک — تہر بالطف ترا عام بہر جا میگرد

(۲۰) **قلق** سلطان خاں قلق پٹھان تھے۔ علوم رسمی اور فنون متداولہ میں کامل تھے۔ اکثر فنون مولانا صہبائی سے حاصل کئے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔

مرکے بھی اسکے نظارے کی تمنا نہ گئی — کونسا سبزہ کہ وہ نرگس شہلا نہ ہوا

(۲۱) **مبتلا** پنڈت اجودھیا پرشاد مبتلا خوش مزاج، دوست نواز اور نکتہ طراز اور سعادتمند نوجوان تھے۔ کتب فارسی مولانا صہبائی سے پڑھیں اور مشق سخن بھی انہیں سے بہم پہنچائی۔ فارسی میں اچھا کہتے تھے۔

از دل ما بر نفس بیرون نیاید غیر آہ — جز الف دیگر نخوانداین طفل ابجد خوان ما

(۲۲) نامی — بلدیو سنگھ نامی کو تاریخ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ بہ مدت گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ کتب درسیہ اور اصلاح سخن مولانا صہبائی سے حاصل کی۔ فارسی گو شاعر تھے۔ ؎

فروغ حسن او کاشانۂ ام را کند روشن — اگر در شب خیال من شود آئینہ در پیش را

(۲۳) نثار — میر نثار علی ابن مولوی عبداللہ بڑے خاندانی تھے مولوی رحمت ان کے جد اعلیٰ محمد شاہ کے استاد اور ان کے پرنانا مولوی اشرف صاحب استاد عالمگیر تھے۔ تحصیل کتب مولوی امام بخش صہبائی سے اور خط نستعلیق میر پنجہ سے سیکھا۔ ؎[۱]

مانع گریہ شود جوعۂ عشق ورنہ — ہست در دیدۂ من مایۂ طوفانی چند

(۲۴) نگہت — حافظ غلام نگہت مولانا صہبائی کے قریبی رشتہ دار ہیں ان ہی سے کتب درسیہ فارسی و عروض و قرأنی کو حاصل کیا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ؎

ہم صاحب احتیاط ہیں زاہد نہ کر تو منع — کرتی نہیں ہے اپنے تو دامن کو تر شراب

(۲۵) نور حق — شاہ محمد جمیل دہلوی خلف خواجہ محمد خلیل شاگرد مولانا صہبائی کسب باطن مولوی قطب الدین، شاہ آل احمد جعفر نصیر محمدی سے کیا تھا۔ ؎

دنیا میں ہوا عدم سے آنا اپنا — اندر آکے ہوا نہ یہاں ٹھکانا اپنا
نے جانے کی راہ ہے نہ رہنے کی جگہ — دشوار ہوا ہے منہ دکھانا اپنا

---

۱ روز روشن ص [illegible]

(۲۶) ہجر | مولوی محمد حسین ہجر تمام کتب نثور منظوم فارسی مولٰنا شہبائی کی خدمت میں حاصل کیں اور مشق سخنوری بھی انہیں سے کی۔ انشائے نظم و نثر میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔

در جواب شکوہ ہائے گرم نگاہ ہائے ناز
ہر گہ گویا سیکند چشم ترا ناز مرحبا
ندارد تاب بخشش دیدہ حسن بے جوابش را
کہ باشد حیرت چشم نقابی آفتابش را

ضبط۔ کرنل امیر خاں عرف کالے خاں

کالے خاں گولہ انداز دہلی کی ان بہادر و نامور اولوالعزم مشہور و معروف ہستیوں میں گذرے ہیں کہ اگر ان کو صحیح طور پر دہلی کی جنگ آزادی کے دوران میں رسد ملتی رہتی اور انگریزوں کا سازشی جال ناکام ہو جاتا تو یقیناً شاہی فوج ہی کو فتح نہ ہوتی بلکہ ہندوستان انگریزوں کا غلام نہ بنتا۔

صاحب گلستان سخن کالے خاں کے بارے میں لکھتے ہیں "ان کے حالات ہم کو تفصیل سے معلوم نہیں ہیں۔ البتہ یہ سابقہ انگریزی پلٹن میں اٹھائیس روپے ماہانہ پر سپاہ رہ چکے ہیں۔ کافی مدت سے اس ملازمت سے علیحدہ ہیں۔ کبھی حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ؒ اور کبھی سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کی فیضیاب درگاہ کی زیارت سے باطنی استفادہ کرتے ہیں۔ معتبر لوگوں کا خیال اور ظن انکے

متعلق یہ ہے کہ "نماج اعلیٰ رکھتے ہیں"؛

ایسے صاحب دل بزرگ جب ملک اور قوم پر مصیبت آتی ہے تو تماشہ بیٹھکر سیر نہیں دیکھتے۔ علم کے خلاف عملی قدم اُٹھانا فرض سمجھتے ہیں چنانچہ ۸ جون ۱۸۵۷ء کو جب بہادر شاہ مرحوم کی طرف سے فوج کی بھرتی کے لئے اعلان ہوا تو جہاں اور بہت سے انگریزی پنشن خوار سپاہی، سوار توپچی آکر شاہی ملازمت سے منسلک ہوئے اسی طرح کالے خاں نے بھی بہادر شاہ ظفر کے جاں نثاروں کی فہرست میں ملک و وطن کی آزادی کی راہ میں قربان ہونے کے لئے اپنا نام لکھوایا[1] انگریزی فوج سے مقابلہ کیا۔ اور جو بہادرانہ اور ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے اُس کی شہادت و تصدیق کے لئے تاریخ کے اوراق موجود ہیں شاہی فوج کی شکست کے بعد بالآخر یہ بھی انگریزوں کے مجرموں کی صف میں آگئے۔ اور فرنگی کی گولی کا نشانہ بنے۔ یہ موری دروازے کے گرگج پر سے انگریزی لشکرگاہ پر توپیں چلاتے تھے۔ اور ان کی نشانہ بازی کی کہانیاں روزانہ مشہور ہوتی تھیں۔

کالے خاں بہادر دل کے ساتھ شاعرانہ دل بھی رکھتے تھے جس میں بزرگان دین کی عظمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ جو کچھ فرماتے تھے ان بزرگوں کی مدحت میں فرماتے تھے۔ اور وہ بھی فارسی زبان میں کبھی کبھی فرمالیا کرتے تھے۔ چنانچہ صاحب گلستان سخن، کو

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۶۵۵

حضرت کلے خاں شہید فرنگ کا صرف ایک شعر وہ بھی حضرت نظام الدین
اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی منقبت میں جو انھوں نے کہا تھا یاد رہا۔ وہ
نقل کیا جاتا ہے۔ ؎

عالم از بہر فیض در شیخ بکام است — سلطان سلاطین جہاں شیخ نظام است

ضیا۔ حکیم محمد حسین شاہجہانپوری

حکیم محمد حسین صاحب کے جد امجد حافظ رحمت اللہ خاں والیٔ کٹھیر
تھے اور نانا نواب محبت خاں محبت تھے جو علوم عربیہ میں علمائے عصر
سے سبقت لے گئے تھے۔ فارسی میں استادوں کے استاد تھے۔ نیز زبان
سنسکرت میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ عربی۔ فارسی۔ پشتو اور اردو
میں بکثرت یادگار کلام تھا، جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں تلف ہو گیا۔ انکی ایک
مثنوی اسرار محبت مشہور تھی۔ فارسی قواعد کا ایک آمدنامہ اور ایک چھوٹی
لغت بھی ترتیب دی تھی۔ فنون سپہ گری کے ماہر تھے۔ علم موسیقی بھی
اچھی طرح جانتے تھے۔ اکثر نواب آصف الدولہ ان کو دور ہی سے دیکھکر
فرماتے تھے۔ کہ "آمد برادر آمد" نواب محبت خاں وجیہہ و شکیل تھے۔
ان کی شادی تحصیل فرید پور ضلع بریلی میں عبدالستار خاں کمال کی
کی صاحبزادی کے ساتھ ہوئی تھی۔ نواب محبت خاں خواجہ میر درد
جرأت اور حسرت کے شاگرد تھے۔ ۵۹ سال کی عمر میں ۱۰ صفر ۱۲۲۳ھ

مطابق سنہ ۱۸۰۹ء کو لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ متصل باغ کشور گنج میں دفن ہوئے۔

نواب محبت خاں کے اٹھارہ صاحبزادے تھے۔ چھوٹے صاحبزادے شمس الدین خاں تھے جن کے دو صاحبزادے قمر الدین خاں اور حکیم محمد حسین خاں ضیا تھے۔ چنانچہ حیات حافظ رحمت خاں کے مولف سید الطاف حسین علیگ بریلوی لکھتے ہیں۔

"نواب محبت خاں کے صاحبزادوں میں محمد منصور خاں آرزو اور محمد عظیم خاں عظیم۔ پوتوں میں محمد حسین ضیا۔ احمد حسن خاں جوش اور محمد سلیمان خاں اسد (مولف تاریخ سلیمانی) پر پوتوں میں عابد علی خاں خورشید اور محمد علی خاں قمر وغیرہ بہت اچھے شاعر گذرے ہیں"۔

حکیم محمد حسین خاں مشہور طبیب تھے۔ نیک سیرت اور نیک اطوار تھے۔ حکیم مرزا محمد علی کے شاگرد رشید تھے۔ زندگی نہایت سادہ گذارتے تھے۔

حکیم محمد حسین خاں ۱۸۵۷ء کے پرآشوب زمانے میں شاہجہاں پور میں قیام پذیر تھے۔ یہ ناظم شاہجہاں پور کے ہم نوا بن گئے تھے۔ ان کے ساتھ تحریک آزادی میں حصہ لیا تھا۔ آخر کسی گورے کی گولی کا نشانہ بنے۔[۵]

کافی جستجو کے بعد بھی ان کا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

---

۵ قیصر التواریخ۔

عاجزؔ نواب شبر علیخاں مرادآبادی

نواب شبر علی خاں مرادآباد کے مشہور، معروف اہل علم اور بااثر و معتمد لوگوں میں سے تھے۔ ان کا کلام اپنے دور کے کثیر الاشاعت اخباروں میں نمایاں طریقے سے شائع ہوا کرتا تھا۔ نواب شبر علی خاں نواب مجو کے بہنوئی تھے اور نواب عظمت اللہ خاں والئی رعیل کھنڈ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب مجو خاں وغیرہ کے ہمراہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ جب ۲۵۔ اپریل ۱۸۵۸ء کو انگریزوں نے مرادآباد پر مکمل قبضہ کر لیا تھا۔ گرفتاریاں شروع کی تھیں تو نواب شبر علی خاں بھی گرفتار ہوئے۔ اور فرنگی کی گولی کا نشانہ بنائے گئے۔ ان پر تین الزامات لگائے گئے تھے اول یہ کہ یہ نواب مجو خاں کے بھائی (بہنوئی) ہیں اور عیسائیوں اور انگریزی افسران کو انھوں نے قتل کیا ہے۔ اور مرادآباد کی جنگ آزادی میں بخت خاں سے ساز باز رکھتے تھے اور نواب مجو خاں کے ساتھ شرکت کی تھی۔ دوسرا جرم تھا کہ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی شبیر علی خاں کو بہادر شاہ ظفر دہلی کے دربار میں بھیجا کہ انگریزوں کے خلاف دہلی کی جنگ میں شریک ہوں اور سند کیفر بادشاہ سے حاصل کریں۔ چنانچہ شبیر علی خاں بہادر شاہ کی طرف سے پہاڑی کے مورچوں پر انگریزوں سے لڑتے اور مقابلہ کیا۔ اور جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو مفرور ہو گئے تیسرا

الزام یہ تھا کہ فیروز شاہ کے ساتھ بھی جنگ میں شریک تھے۔[1]

نواب شبر علی خاں کی شہادت کے بعد نواب مجو خاں کے صاحبزادے امیر الدین کے ہمراہ ان کے چھوٹے بھائی نواب شبر حسن خاں گرفتار ہوئے۔ تین مہینے بعد جبکہ ملکہ کا اعلان ہوا تو یہ دونوں رہا کر دیئے گئے۔

نواب شبر علی خاں صاحب تنہا تخلص کرتے تھے۔ مرادآباد کے مشہور شاعر تھے۔ ستر سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ کلام میں پختگی پائی جاتی تھی۔ اکثر نعتیہ غزلیں کہا کرتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں۔ عاشقانہ کلام کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔[2]

چٹکیں نہیں یاد آ گیا جب چھڑانا — جھٹک کے وہ شوخی سے دامن کسی کا
بہت پاؤں پھیلائے اے اشک تو نے — مگر ہاتھ آیا نہ دامن کسی کا
کھنچ گیا یار تک نگاہ کے ساتھ — ناتوانی ترا گلہ نہ رہا

۱۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو نواب شبر علی خاں شہید جنگ کی ۴ مئی ۱۸۵۸ء کی حسب ذیل ضبط شدہ جائیداد کی فہرست منگل سین نائم مقام مجسٹریٹ مرادآباد کی عدالت میں پیش ہوئی۔ یہ کاغذات اندر نواب مجو خاں کے خاندان کے مقدمات جائیداد کے کاغذات محافظ خانہ فوجداری دیوانی مرادآباد میں اب تک محفوظ ہیں۔ اس مثل کا عنوان ہے "قرقی جائیداد شبر علی خاں مقتول"۔

[1] روبکار عدالت فوجداری باجلاس رابرٹ والسن ڈپٹی مجسٹریٹ رجسٹر ۱۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

[2] خمخانہ جاوید دوم صفحہ ۱۵

جائداد دیہات اراضی از نصف موضع دولہ پور یہ گاؤں ایک ثلث شبر علی خاں و دو ثلث اعلیٰ علی خاں کا تھا۔

موضع موھڑا دو ثلث شبر علی خاں ایک ثلث سلطان علی خاں کلہے۔ جائداد حسینی بیگم زوجہ شبر علی خاں۔ واقعہ پرگنہ کاشی پور مہوکھیڑا، بھوبرا، بہادر گنج ایٹی جنوبی، مونڈالہ محمد اماپور، نصیر بنگلہ ابناری عزت علی گڑھ۔ لونڈی پور، ملک خوشحال پور، کوٹھی پور۔

جائداد پرگنہ سنبھل شبر علی خاں:۔ موضع مان پور شراکت سرنان علی خاں، امداد علی خاں، مسماۃ نصیب النساء، امیر النساء کریم النساء عزیز النساء و رحیم النساء۔

جائداد شبر علی خاں باغی۔ دیہات پرگنہ مرادآباد۔ بسیر پور، پیلی نانگ، ملوکپور، چھتر پور، مکن پور۔ گوہر پور، محبت پور، بھگونت پور ناظر پور۔ ماپور، نرائن پور۔ اراضی کسر نلی بیرون بادہ منڈی باغ گنج واقع شیر یکشیاں۔

جائداد غیر منقولہ شبر علی خاں واقع مرادآباد۔ محلہ ڈھیر یا میں ایک حویلی وہ کھپریل۔ مغل پورہ کہنہ میں ایک مکان پسیع۔ منڈی بانس میں گاؤ خاں: محلسرائے مع دیوانخانہ چند مکانات۔ حویلی کہنہ میں مکان سکونہ مع دیگر مکانات مع قطع اراضی۔ سرائے لال چند میں تیس ۳۰ مکان۔ سرائے کنجری متصل گودام میں ۲۴ مکان خشت پزاں میں ۵۷ مکان، بازار چوک میں دو مکان۔ بانس منڈی میں ستر ۷۰

سکان حویلی کہنہ میں ۲۷ مکان تھے۔

نواب شبر علیخاں شہید فرنگ کے وارثوں اور حق داروں نے اپنے حصے لینے کے لئے درخواستیں دینی شروع کردی تھیں۔ چنانچہ حسینی بیگم زوجہ نواب شبر علی خاں شہید فرنگ نے ۲۹۔ دسمبر ۱۸۵۸ء کو اور علی کبریٰ نے ۱۴۔ جنوری ۱۸۵۹ء کو درخواستیں عدالت میں دائر کردی تھیں۔ کیا کس کو ملا۔ اس کی تفصیل دینا ضروری نہیں ہے۔ جبکہ واپس دینے کا سوال انگریز کمشنر ایک بجائز اندر وا نہیں تھا۔

نواب شبر علی خاں صاحب شہید قادرالکلام شاعر تھے ساغر تخلص تھا۔ یہ اردو میں کلام نہیں کہتے تھے۔ فارسی میں کہا کرتے تھے عشقیہ کلام سے بھی گریز کرتے تھے۔ حمدیہ اور نعتیہ غزلیں زیادہ کہا کرتے تھے۔ اس لئے اردو شعراء کے تذکروں میں ان کا ذکر دیکھنا موزوں نہیں تھا۔ فارسی شعراء کا کوئی جامع تذکرہ ابتک مرتب نہیں ہوا۔ جو ان کی اوراق گردانی کی جاتی۔ اسعد الاخبار آگرہ ۱۸۵۰ء کے پرچے میرے والد ماجد مولینا شرف الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانے میں ہیں اتفاقیہ طور پر ان پر نظر پڑ گئی تو نعتیہ قصیدے ایک چھپی ۱۸۵۰ء کے نمبر میں۔ نمبر ۱۰۔ ستمبر ۱۸۵۰ء میں مل گئے۔ ان کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پئے نظارہ رویت فلک را	زمہر و ماہ چشماں آفریدند
زفیض مقدمت اے گلشن حسن	بہار باغ ایماں آفریدند

ازاں طرزِ خرامش اضطراری — بجانِ عشقبازاں آفریدند
زنورِ آفتابِ ذرہ ـ تو — ضیائے ماہِ تاباں آفریدند

تو آں جانِ جہاں ہستی کہ اے جاں
ایرت عالم بجاں آفریدند

فلکے پاکہ در راہ تو باشد — لقائے اہلِ عرفاں آفریدند
چو حسنِ تست اصلِ حسنِ عالم — زسیرِ خود چمنستاں آفریدند
خلیل اللہ یکے دیگر کلیمش — ترا محبوبِ سبحاں آفریدند
زپابوسِ تو خواہد ماند محروم — خسارا خونِ جگرزاں آفریدند

نگاہِ لطف بر عاجز کہ او زا
سراپا جرم و عصیاں آفریدند

بہرِ تو جہاں آفرینش — تکوینِ مکاں آفرینش
در معرفتِ تو عینِ حیرت — نطقِ حیواں آفرینش
بہرِ تو مدارِ سودِ عالم — بہرِ تو زیاں آفرینش
تا در نظرِ عنایتِ تو — سر رشتہ جاں آفرینش

افروختہ مشعلِ ہدایت
نورت بجہاں آفرینش

بیتابیٔ دردِ الفتِ تو — آرامِ رواں آفرینش
تا وصفِ محاسنِ تو فرمود — ترنم زباں آفرینش
بے روئے تو دفترِ پریشاں — مجموعہ جاں آفرینش

از آتش دوری تو افتاد　　صد رخنہ بجا آفرینش

ورنہ عاجز چہ جہاں آفرینش

نہ بجز تو جہاں آفرینش

عاجزؔ۔ پیرجی شرف الحق دہلوی

مولانا پیرجی شرف الحق کوتوال شہر دہلی کا خاندانی سلسلہ حضرت جلال الدین تھانیسری قدس سرہٗ سے ملتا ہے۔ تھانیسر سے دلی میں آگئے تھے اور دربار شاہی سے منسلک تھے۔ کوتوالی کی ذمہ داری کو نیک نامی و دیانتداری کے ساتھ انجام دیا۔ خلائق کی حق رسانی اور خالق کی مرضی کا پاس ہر کام میں رہتا تھا۔ فہیم و ذہین بلا کے تھے۔ کوتوالی کے عہدہ سے قبل کبھی کبھی اتفاقیہ طور پر شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد شہر کے انتظام میں تمام وقت صرف ہوتا تھا۔ پہلے صرف گفتار تھی پھر کردار پر انحصار ہو گیا۔[۱]

غدر کے زمانہ میں بھی کوتوال تھے۔ ۱۱ مئی کو دہلی میں جب تلنگوں نے انگریزوں کو قتل کرنا شروع کیا، اس دن پیرجی شرف الحق نے بھی مسٹر ہچنس مجسٹریٹ دہلی کے ہمراہ دہلی کا گشت لگایا، کوتوالی میں کمشنر فریزر، کپتان ڈگلس، سرطامس مٹکاف اور ہچنس وغیرہ انگریز جمع ہوئے۔ سواروں اور باغی شہریوں نے کوتوالی کو گھیر رکھا تھا۔ اس وقت فریزر صاحب نے ایک سوار کے گولی ماری جو صاحب کی طرف آگے بڑھا چلا آرہا تھا۔ سوار گر کر مر گیا اور اس کے ساتھی سوار ذرا پیچھے ہٹے۔ لیکن شہری باشندوں نے بندوقوں کی کچھ پرواہ نہیں کی مرتے گرتے نعرے لگاتے ہوئے انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر سب انگریز بھاگے، در قیام گاہ تک پہنچتے پہنچتے مسٹر فریزر، مسٹر ڈگلس اور ہچنس تینوں مارے گئے۔

غدر کے فرو ہونے کے بعد پیرجی شرف الحق کو ان تینوں حب لزل

---

[۱] گلستان سخن صفحہ ۳۵۰

کی حفاظت نہ کرنے کے الزام میں غالباً گرفتار کیا۔ یہ بھی عتاب کی نذر ہوئے اور گولی کا نشانہ بنائے گئے۔

شعر صاف و شستہ اور مہذب کہتے تھے۔ کلام میں مضمون آفرینی اور نازک خیالی کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ کلام کسی کو نہیں دکھایا۔ نمونہ کلام یہ ہے:

مژگاں پہ کل لخت جگر آئے ہیں کیا کیا، | یہ خار و خس باب دیکھ ثمر لائے ہیں کیا کیا
سنبل کو آج باغ میں ہے زندگی محال | اس سرو قد کی زلف گرہ گیر دیکھ کر
ترے ہجر کا اب علاج اے مسیحا | اگر دیکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں
مدت سے چھوڑ بیٹھا اس جسم ناتواں کو | دم تیرے دیکھنے کو آنکھوں میں آرہا ہے
غضب ہے اسکی جبیں پر جو تری رہتی ہے | تیغ ابرو پہ یہ کیوں آب دھری رہتی ہے

کس کے یہ دیدۂ گریاں کی نظر کا ہے اثر

کاہ جو دشت میں بے آب ہری رہتی ہے

عاصی، منشی گھنشیام رائے دہلوی

منشی گھنشیام رائے کایستھ ماتھر دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ شاہ عالم ثانی کے زمانہ سے بہادر شاہ ظفر کے عہد تک دفتر شاہی میں ملازم رہے۔ شعر و سخن سے کمال ذوق تھا۔ پر گوئی تیز طبعی، حاضر جوابی میں بے مثل تھے۔

غدر سے ۲۰، ۲۵ برس پہلے کی بات ہے کہ منشی رسا کے اہتمام سے دہلی کالج میں تاریخی مشاعرے ہوتے تھے جو مدت تک کامیابی کے ساتھ جاری رہے، ان دنوں شہر کے دروازے ۹ بجے بند ہوجاتے تھے۔

مدرسہ اجمیری گیٹ کے باہر تھا۔ گدھ کپتان سے اجازت لی گئی کہ مشاعرے کے روز ۲ بجے تک اجمیری دروازہ کھلا رہے۔[۱] چنانچہ اس مشاعرے میں شاہ نصیر، استاد ذوق، مومن خاں، مرزا غالب، آزردہ، شیفتہ اور مولانا صہبائی اور ان کے شاگرد جمع ہو کر داد سخنوری دیتے تھے۔ شاہ نصیر نے لکھنؤ میں بعض شعراء کی خواہش و فرمائش پر دو غزلیں کہی تھیں، دہلی جب گئے اور مشاعرے میں شریک ہوئے تو یہ دونوں غزلیں پڑھیں۔ ایک کا یہ مطلع اور دوسری غزل کا یہ شعر تھا ؎

ہم بجز کر توڑتے ہیں قفس کی تیلیاں	پر نہ تھیں اے ہم صفیر اپنے بس کی تیلیاں
برہمن اپنے بتوں کو بخدا سجدہ نہ کر	آدم مردہ ہیں یہ، گورد کفن پتھر کے

ان دونوں غزلوں پر شاہ نصیر کو بہت داد ملی اور مشاعرے میں بہت پسند کی گئیں۔ شعراء نے اپنے شاگردوں کو ان دونوں زمینوں میں غزلیں کہہ کر دیں۔ خیر الدین یاس جو استاد ذوق کے شاگرد اور دہلی کے اچھے مانے ہوئے طبیب تھے۔ دوسری زمین میں انہوں نے یہ شعر کہا جو بہت مقبول ہوا ؎

مرہم سنگ جراحت نے بھرے اپنے گھاؤ
کب کے مشتاق تھے زخموں کے دہن پتھر کے

یہ بات شاہ نصیر کو ناگوار گزری۔ پہلی زمین میں تقریباً پچاس غزلیں کہہ کر اپنے شاگردوں کو دیں انہوں نے وہ غزلیں مشاعرے میں پڑھیں۔ چنانچہ اس مشاعرے میں یہ طے پایا کہ ہر مشاعرے میں طرحی غزل کے ساتھ تیلیوں والی طرح جاری رہے۔ چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہا اور عاشقان سخن ایسے

---

[۱] آب حیات ص ۴۹۳

سودائی ہے کہ مدت تک زمینِ سخن میں تنکے چُنتے رہے یقیناً کسی شاعر کے گھر میں بھی جھاڑو کی ایک تیلی باقی نہیں رہی ہو گی۔

دوسرے شاعر آٹھ آٹھ نو نو شعر کی غزلیں اسی طرح میں پڑھتے تھے لیکن شاہ نصیر ہر مرتبہ دو غزلہ ساٹھ بیت کا پڑھتے تھے اور ان کا ہر شاگرد انیس بیس سے کم شعر کی کوئی غزل نہیں پڑھتا تھا۔

اس مشاعرہ میں پبلک بھی کافی شریک ہوتی تھی جب کہ تیلیوں کی معرکہ آرائی کا سلسلہ شروع ہوا تو پبلک جوق در جوق مشاعرہ میں پہنچنے لگی سب کی نگاہیں شاہ نصیر اور شیخ ذوق کی طرف لگی رہتی تھیں۔

آخری مشاعرہ کی روئداد بڑی دلچسپ ہے۔ مشاعرہ شاندار اور بہت کامیاب ہوا۔ شاعر باکمال اپنے اپنے شاگردوں کے ساتھ رونق افروز ہوئے استاد ذوق نے ایک قصیدہ اسی زمین میں سراج الدین بہادر شاہ کی ولی عہدی کے زمانے میں لکھا تھا۔ وہ مشاعرے میں پڑھا گیا جس کا ایک شعر یہ بھی تھا ؎

چق ترے دالان کی نازک بہت ہے نازنیں
کیا لگائی اس میں ہیں ہائے مگس کی تیلیاں

شاہ نصیر کے شاگردوں میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے سمجھا ہمارے اُستاد پر پھبتی کسی گئی ہے۔ اس مشاعرے میں منشی گھنشیام رائے عاصی بھی موجود تھے انہوں نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر سنایا ؎

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے
قافیہ میں گر نہیں حضرت کے بس کی تیلیاں

آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا بہرِ خدا
بار کی چلمن ہو اور پرِ مگس کی تیلیاں

شیخ صاحب یہ وہ چلمن ہے کہ جس میں بے دریغ
باندھیے گر ہو سکیں تارِ نفس کی تیلیاں

عاصی کے بعد شاہ وجیہ الدین صاحبزادے شاہ نصیر نے بھی یہ شعر پڑھا ؎

گرچہ قندیلِ سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا
باندھیے گر ہو سکیں تارِ نفس کی تیلیاں

ان شاعرانہ معرکہ آرائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بزمِ مشاعرہ اس مشاعرے کے بعد ختم ہو گئی۔

منشی گھنشیام داس عاصی ایامِ غدر ۱۸۵۷ء میں فرنگیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے[1]۔ ان کے بڑے صاحبزادے مکند لال بھی بہادر شاہ ظفر کے میر منشی تھے اور چھوٹے صاحبزادے منشی بنسی لال تحصیلدار تھے۔ بشتاق اور قیصر ان کے حقیقی نواسے تھے۔ نمونۂ کلام ؎

عزیزو ضبطِ اشک دیدۂ تر ہو نہیں سکتا
کروں کیا بند کوزہ میں سمندر ہو نہیں سکتا

مرے گریہ کا سن کر ماجرا اُس نے کہا آخر
کہ اس برسات میں آنا ترے گھر ہو نہیں سکتا

وہ رند بادہ کش ہوں کہ تو کیا ہے زاہدا
قاضی نے نذر دی مجھے بوتل شراب کی

سو جائیں ایسے بخت کہ جاگیں نہ پھر کبھی
ہو آرزو اگر مجھے فرقت میں خواب کی

ادھر اپنے رُخِ تاباں پہ زلف اس نے پریشاں کی
ادھر خورشید پہ چھائی گھٹا بس آ کے جھٹ کالی

---

[1] خم خانۂ جاوید ص ۳۰۲

خیالِ زلف کیوں کر اس دلِ آشفتہ سے جائے
چھٹائے سے چھٹے کب۔ جب بلا جائے چمٹ کالی

عالی۔ مرزا عالی بخت۔ دہلوی

مرزا عالی بخت عالی مرزا فیروز بخت کے صاحبزادے تھے اور ان کے دادا شاہ عالم ثانی تھے۔ ابتدا میں مشورۂ سخن مرزا معزالدین صاحب ثابت سے کیا۔ ان کے انتقال کے بعد حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان مرحوم سے استفادہ کیا۔ بے حد با مروت تھے اور صاحبِ دیوان تھے۔ ۱۸۵۷ء میں شہید ہوئے خوش فکر عالی خیال شاعر تھے۔[1]

مژگانِ ستم گر کی طرح روز ازل سے
جو شخص کہ ٹیڑھا ہے وہ سیدھا نہیں ہوتا

حاضر ہوا جو یار تو قسمت کا پھیر دیکھ
معدوم وہ کمر ہوئی غائب دہن ہوا

آبِ دمِ شمشیر کا کس کے ہے یہاں ذکر
پانی جو بھر آیا ہے لبِ زخمِ جگر میں

جوں نخلِ شمع ہوں نہ کبھی سبز آب سے
آتش اگر ہو سر پہ رہوں آب تاب سے

صریح اس کو اگر حالِ دل جتا نہ سکے
تو کیا غزل ہی پڑھ پڑھ کے ہم سنا نہ سکے

ہوں تو دل کی بجھے آگ آہ اس پہ سے
ذرا سا وار کے پانی بھی یار لا نہ سکے

عباس۔ مرزا عباس بیگ بریلوی

مرزا عباس بیگ بریلی کے رہنے والے تھے۔ مرزا ذکی ندیم کی اولاد میں تھے جو نادر شاہ کے ساتھ ایک مصاحب کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے۔

---

[1] شمیم سخن ص ۱۶۷

نادر شاہ اُن کی بہت عزت کرتا تھا۔ چنانچہ مصحفی نے اپنے تذکرہ "عقد ثریا" میں ندیم صاحب کے بارے میں لکھا ہے:۔

"پائے کرسی شاہ گلیم برائے نشستن فرش می کردند در عہد عبدالباقی خاں کہ وزیر شاہی بودہ است۔ مرزائے مذکور عریضہ می نوشت بلکہ روز فتح قندھار قلیانی در بروئے شاہ کشیدہ بقولے در نجف اشرف وفات یافت۔"

مرزا ذکی نے حضرت امیر علیہ السلام کی شان میں مثنوی بدر نجف لکھی تھی۔ مرزا کا انتقال ۱۱۵۲ھ میں ہوا[۱] نمونہ کلام ملاحظہ ہو[۲]

برقاصدے کہ برد بجاناں پیام ما	اول زننگ گرد فراموش نام ما
داد یم جو ہم و بیزاریم او دریاں طبیب	میکند پرہیز از صحبت دل بیمار ما
رقیب از وصل می بالد ندیم از ہجر می نالد	یکے را گل یکے را خار در پیراہن ست امشب
کسے بحال کس از بیکسی نمی سوزد	بمدعائے دل روزگار می سوزم

مرزا عباس انگریزی و فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ایک مدت تک ریاست رام پور میں ملازم رہے[۳] پھر لکھنؤ چلے گئے۔ ریاست باندہ میں درباری شاعر کے عہدہ پر ممتاز تھے۔ اس کے بعد والیِ ریاست نواب علی محمد خاں نے قلمدانِ وزارت بھی آپ کے سپرد کر دیا تھا۔ ان کے والد ماجد بریلی کے بااثر لوگوں میں سے تھے۔

مرزا عباس استاذہ بریلی میں نامور تھے اور شہیدی اور منیر کے ہمعصر تھے۔ کہنہ مشق اور پُرگو شاعر تھے۔ شعر گوئی میں آپ نے خواجہ آتش اور ناسخ سے فیض حاصل کیا تھا۔ چنانچہ اس کا ذکر آپ نے اپنے ایک مقطع میں کیا ہے۔ ؎

---

[۱] تذکرہ شعرائے فارسی صفحہ ۱۳۴ [۲] انتخاب یادگار صفحہ ۱۹۰ [۳] صبح گلشن صفحہ ۵۱۳

مشاعرہ میں غزل کیا چمکتی اے عباس جو فیض آتش و ناسخ نہ کام کر جاتا

خواجہ حیدر علی آتش کے مشورہ کے بعد عباس کے بجائے نادر تخلص رکھا۔

بولے سُنکر وہ حال میرا نادر کو بھی ہوا لگی ہے

مرزا صاحب انتہائی سنجیدہ مزاج، متحمل طبیعت کے واقع ہوئے تھے لیکن انگریز کی مخالفت میں سنجیدگی و تحمل کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آپ کو انگریز سے انتہائی نفرت تھی۔ اور نواب علی محمد والی باندہ کے ہمنوا اور ہم عمل تھے۔ چنانچہ یہ .... ان کے ساتھ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شامل تھے۔ انگریز کی مخالفت میں یہ شعر کہا تھا۔ ؎

اختر جھک گئے ترے خالوں کے سامنے گوروں کے پاؤں اُٹھ گئے کالوں کے سامنے

اس شعر کو بغاوت پر محمول کیا گیا۔ تختۂ دار پر چڑھنے سے پہلے یہ شعر فرمایا تھا جو ابتک زبان زد خاص و عام ہے اور بہت ہی مقبول عوام ہوا ہے۔ ؎

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہونگے چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہونگے

۱۸۵۸ء میں چالیس برس کی عمر میں عباس صاحب کو باندہ میں بغاوت کے جُرم میں تختۂ دار پر کھنچوایا گیا۔ آپنے فسانۂ عجائب کو نظم کیا تھا۔[1]

سات دیوان غیر مطبوعہ چھوڑے جو ہنگامۂ غدر میں ضائع ہو گئے۔ صرف ایک دیوان باقی رہ گیا تھا جو ان کے صاحبزادے مرزا رستم بیگ صاحب قیصر نے چھپوایا تھا۔ نمونۂ کلام ؎

بدلا ہوا کا رنگ، سیاہی گھٹا کی ہے لا ساقیا شراب کہ رحمت خدا کی ہے

پیتا نہیں شراب کبھی بے وضو کئے قالب میں میرے روح کسی پارسا کی ہے

---

[1] شمیم سخن صفحہ ۱۶۹

عباسؔ روزِ حشر یہ کہتا اُٹھوں گا میں
لُوٹا مجھے بتوں نے دُہائی خدا کی ہے

بوسہ کا نیل عارضِ جاناں میں رہ گیا
سوسن کا پھول کھِل کے گلستاں میں رہ گیا

اوروں نے جا کے مصحفِ رُخ چوم ہی لیا
میں فال دیکھتا ہوا قرآں میں رہ گیا

دل کی شکل صنوبری ہے
قمری بھدہ میں بولتی ہے

ساقی ابدال ہے ولی ہے
کشتی خشکی میں چل رہی ہے

بابِ قبول کہتی ہے جس کو تمام خلق
کھڑکی وہ اے صنم تری دولت سرا کی ہے

گیسوؤں کو وصل کی شب مُنھ پہ تم آنے تو دو
شرط بدتا ہوں، قیامت تک سحر ہوتی نہیں

مرزا عباسؔ کے صاحبزادے مرزا رستم بیگ قیصرؔ تھے۔ جو بریلی کے مشہور اساتذہ میں تھے۔ اور آئی۔ ایم ہائی سکول بریلی کے ہیڈ مولوی تھے جن کی یادگار اب تک "بزمِ قیصری" موجود ہے۔ نمونۂ کلام[1]

ستم کش ہوں، بلا کش ہوں، جفا کش
کمر باندھی ہے میرے امتحاں پر

شکست توبہ نستونی نہ ہوگی
بھروسہ ہے مجھے پیرِ مُغاں پر

بھکاری ایسے در کا ہے یہ قیصرؔ
فلک ہے جبہ سا جس آستاں پر

لبریز ہے جو اشکِ ندامت سے رات دن
ہر آنکھ مجھ کو جامِ شرابِ طہور ہے

جو محو عشق کا ہے وہی ہوشیار ہے
دیوانہ جو ترا ہے وہی ذی شعور ہے

---

[1] خدنگ ناز بریلی۔ اپریل ۱۹۲۲ء

قیصر نے راہِ عشق میں جب سے رکھا قدم
بے خود ہے اور نشۂ الفت سے چور ہے

مرزا قیصر کے چار صاحبزادے مرزا سعادت بیگ عجز، میرزا حکیم احمد یار بیگ احمد۔ مرزا یعقوب بیگ صاحب حیرت، اور مرزا وزیر بیگ آباد تھے۔

بڑے صاحبزادے مرزا عجز گورنمنٹ ہائی سکول بریلی میں ماسٹر تھے اور وہیں سے آپ ریٹائر ہوئے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہاں انتقال ہوا۔ سہ

خوفِ جزا کا دل میں کچھ ایسا وفور ہے — بانگِ جرس مرے لئے بانگِ صبور ہے
دل ہی کہاں ہے جس میں کیف و سرور ہے — شیشہ ہے وہ شکست جو صراحی سے دور ہے
انداز ہو، ادا ہو کرشمہ ہو ناز ہو — سب کا جواب ایک دلِ ناصبور ہے

عجز زبسکہ علم سے کھلتی ہے راہِ جہل
دانا جو سمجھے آپ کو ناداں ضرور ہے

دوسرے صاحبزادے مرزا حکیم احمد یار بیگ صاحب احمد بریلی کے نامور حکیموں میں سے تھے۔ ان کا بریلی میں انتقال ہوا۔ سہ

فنا اندر فنا کی قدر ہم کو — خضر کو نازِ عمرِ جاوداں ہے
ثنا گو ہیں فرشتے آسماں پر — الٰہی نام کس کا ہے زباں پر

مرزا یعقوب بیگ حیرت بریلی کی ججی میں پیشکار تھے۔ وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ پاکستان میں بقیدِ حیات ہیں۔ سہ

گناہوں کا ہے کیا کم بوجھ بارد | کفن ڈالو نہ جسمِ ناتواں پر
کہاں پر جا کے دل بہلائے عاشق | حسیں مغرور حوریں آسماں پر

دکھاؤں کیا، کہاں دردِ نہاں ہے
بتاؤں کیا کہ ہوتا ہے کہاں پر

مرزا وزیر بیگ آباد بھی بریلی کی عدالت ججی میں ملازمت کرتے تھے وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ کراچی میں تشریف فرما ہیں۔

مری قسمت تمہاری بھول کیا ہے | چلے آئے جو تم میرے مکاں پر
چھٹا آفت سے اب آرام سے ہوں | اجل تیرا کرم مجھ ناتواں پر
کہیں جائے بھی ہردم کا تڑپنا | کہیں بجلی گرے بھی آشیاں پر
مجھے لے چل تو اے وحشت وہاں پر | جلیں وہم و گماں کے بھی جہاں پر

بہت روکا دلِ محزوں کو آباد
گلہ آہی گیا آخر زباں پر

عزیز۔ مولوی عبدالعزیز۔ دہلوی

مولوی عبدالعزیز صاحب دہلوی شہید فرنگ مولوی امام بخش صہبائی کے فرزند ارجمند تھے۔ اپنے والد ماجد سے کتب درسی پڑھیں اور فنِ سخن میں بھی پدر عالی قدر کے شاگرد تھے۔ ایامِ شباب میں انتہائی متین اور بردبار تھے۔ علمی استعداد معقول تھی۔ طبیعت کا رنگ نرالا تھا۔ بہت پُر لطف اور دل میں اتر جانے والے شعر کہتے تھے۔ خیالات میں باریکی ہے، زبان صاف اور شستہ ہے۔ عشقیہ غزل کے ساتھ قصیدہ بھی اچھا کہتے تھے۔

ایام غدر میں گوروں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ نمونہ کلام[1]

نے کام ہے مسجد سے نہ دیر سے کچھ مطلب
ہم کو تو دہی کعبہ وہ شوخ جہاں آیا

نہیں ہے رحم و مروت جو تجھ میں خیر نہ ہو
ذرا خدا ہی کا کچھ تیرے دل میں ڈر ہوتا

خدانخواستہ کیا اس سے ہم کو تھا انکار
عزیز کعبہ اگر کوچۂ بتاں ہوتا

دیکھا تھا ہم نے آج عزیز جگر فگار
کچھ بدلا بدلا رنگ تھا خانہ خراب کا

میں نقش پا کی طرح ہوں فتادہ راہ میں اور
ارادہ رکھتے ہیں رہرو مرے مٹانے کا

یک قلم کیونکہ تمنا کو مٹا دوں ظالم
اک خدا ٹھہر گیا میں کوئی بندہ نہ ہوا

ہم عاصیوں کا بار گنہ سے جھکے ہے سر
اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا

وہ نہیں لطف، وہ وفا ہی نہیں
تو تو گویا کہ آشنا ہی نہیں

تیری اس شوخیٔ رفتار سے نکلی باری
خاک ہو کر جو تھی اک دل میں تمنا باقی

بے قراری کا کیا سبب ہے عزیز
کہیں دل تو نہیں لگا بیٹھے

جلا شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا
جلتا جو سوز دل ہے تو رونا گداز کا

علی۔ نواب رفیع علی خاں مراد آبادی

نواب شیر علی خاں اور نواب مجو خاں کے خاندان کے بزرگ جب کہ ابتداء اسلام میں فتوحات نے ترقی کی تو مختلف مقامات کے علاوہ بلخ، بخارہ، سمرقند، روسی ترکستان پر فرماں روائی کر رہے تھے اس وقت سلطان امیر عمادالدین خاں والی بلخ اور دوسرے خاندان کے بزرگ فاتحانہ جد و جہد جاری رکھتے ہوئے فاتحان ہند کے شریک ہو کر ہندوستان کے مقامات کشمیر، پنجاب، دکن، گجرات اور بنگال کے مالک بن گئے تھے۔

---

[1] شمیم سخن صفحہ ۱۰

امیر عمادالدین کے جانشینوں میں سے امیر عبدالقادر خاں قآنی نے خاص لکھنؤ میں علوم دینی کی درسگاہ قائم کی جس سے ہندوستان کے علماء نے فیض حاصل کیا۔ امیر عبدالقادر کے صاحبزادوں میں نواب عظمت اللہ خاں تھے جن کے مطبخ سے دو سو طالب علم کو ہمیشہ اور رمضان شریف میں روزانہ ایک ہزار آدمیوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ روہیلکھنڈ میں فیض پور، نرولہ، اکبرآباد سہسوان، بدایوں، بریلی اور حصار کے ضلع ان کے مقبوضات میں سے تھے۔ عہد شاہجہاں میں رستم خاں بانی مرادآباد کے وقت دکن کی جنگ کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ پھر مرادآباد پر ان کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ نواب صاحب اورنگ زیب کے زمانے میں دکن و بیجاپور میں بھی حکمرانی کرتے تھے۔ نواب عظمت اللہ کے بیٹے نواب ہدایت اللہ، نواب نصیرالدین، شاکر خاں اور نواب عظمت اللہ تھے۔ نواب ہدایت اللہ پانی پت کرنال جو مرادآباد سے تا قلعہ آصف گڑھ وغیرہ پر حکمران تھے ان کی اٹھارہ ہزار سواروں کی فوج تھی۔

نواب نصیرالدین محمد خاں نصیرآباد پر قابض تھے۔ نواب شاکر کی ملکیت میں کرنال وغیرہ آیا تھا۔ نواب عظمت اللہ حکمران روہیل کھنڈ فاتح المورہ اور کوہ کمایوں تھے جن کا دارالخلافہ مرادآباد تھا۔

نواب عظمت اللہ کی اولاد میں نواب فخرالدین، نواب معین الدین نواب نظام الدین اور نواب فریدالدین تھے۔ نواب نظام الدین کی اولاد میں نواب شبر علی عاجز شہید فرنگ اور نواب شبیر علی تنہا تھے۔

نواب معین الدین کے فرزند نواب مجو خاں شہید فرنگ اور فرید الدین خاں کے فقیہ الدین اور رفیع الدین تھے۔ فقیہ الدین کے لڑکے علی الدین خاں اور ان کے صاحبزادے علی رضا، اور علی رضا کے بیٹے رفیع علی خاں عَلی، آل علی خاں (ہردو شہید فرنگ) تفضل علی خاں اور عبد العلی خاں تھے۔ رفیع علی خاں عَلی کے خلف رضوان علی خاں رضوان تھے۔ جو مرزا غالب کے شاگرد تھے۔

نواب مجو خاں اور نواب شبر علی خاں عاجز کے ہمراہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں نواب رفیع علی خاں علی بھی شریک تھے۔ اور انگریزوں سے مقابلہ کیا تھا۔

نواب مجو خاں اور ان کے خاندان کے مقدمات کے کچھ کاغذات مراد آباد کلکٹری میں اب تک موجود ہیں۔ چنانچہ نواب رفیع علی خاں کے صاحبزادے رضوان علی خاں صاحب نے اپنے والد ماجد کی شہادت کے حکم کی نقل ۱۲ راگست ۱۸۵۹ء کو کلکٹری مراد آباد سے حاصل کی تھی۔ یہ مقدمہ مسٹر جان انگلس کی عدالت میں ۱۹ راپریل ۱۸۵۹ء کو رفیع علی خاں اور گلاب کے خلاف پیش ہوا تھا۔ ان پر جو الزام لگایا گیا تھا، اور جو ان کے خلاف حکم ہوا۔ اس حکم نامہ کی ہو بہو نقل پیش کی جاتی ہے۔ یہ حکمنامہ مجھکو نواب عظمت اللہ خانصاحب کی مہربانی سے حاصل ہوا۔[1]

---

[1] مذکورہ معلومات مجھ کو نواب عظمت اللہ صاحب نبیرۂ نواب رفیع علی خاں علی شہید فرنگ مراد آبادی سے حاصل ہوئی ہے۔

روبکاری اجلاس کمیشن مسٹر جان انگلس ..... واقع ۲۹ راپریل ۱۸۵۸ء

سرکار مدعی   بنام رضیع علی خاں ولد علی رضا خاں افغان ساکن مراد آباد

و گلاب ولد شب لال بقال ساکن اکبر آباد علاقہ رام پور

علت بغاوت سرکار

جو کہ ان دونوں مدعا علیہ نے آج شہر میں کمان افسر گالو متعینہ شہر پر بندوق چلائی اور اسی وقت پر پکڑے گئے۔ یہ صریح بغاوت سرکار ہوئی۔ بپاداش اس کے سزا کامل ان مدعا علیہ کو ملنا چاہیئے۔

حکم ہوا

ہر دو مدعا علیہ گولی سے جان سے مارے جاویں فقط

اسی روز رضیع علی خاں صاحب اور ان کے ساتھی گلاب گولی کے نشانہ بنائے گئے۔ ان کا جسم چکنا چور ہوا۔ رضیع علی خاں کو شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ فارسی میں زیادہ تر شعر کہتے تھے۔ تخلص علی تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں اور ایرانیوں کی جنگ ہو رہی تھی اسی زمانہ میں کسی مقام پر ایرانیوں نے فتح پائی تھی تو اس خوشی کے موقع پر آپ نے شاہ ایران کو مبارکباد دینے کے لئے ایک قصیدہ لکھ کر روانہ کیا تھا۔ جس کا ایک شعر یہ تھا۔ ؎

آں قمد نصرانیاں را کشت گر روئے نیاز

عیسیٰ گردوں نشیں داماں پیغمبر گرفت

فوق خلیفہ محمد اسمٰعیل دہلوی

خلیفہ محمد اسمٰعیل فوق ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ حضرت ذوق بہت محبوب سے تھے۔ بہادر شاہ ظفر بھی استاد زادے کی قدر کرتے تھے۔ قلعہ معلیٰ میں ان کی آمد و رفت تھی۔ یہ قلعہ کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اپنا کلام بھی سنایا کرتے تھے اور بادشاہ ظفر کی غزل بھی کبھی کبھی پڑھ دیا کرتے تھے۔[1]

بہادر شاہ ظفر کے دربار سے ان کو خلعت بھی عطا ہوا تھا۔ چنانچہ ۵ رجون ۱۸۴۶ء کو بہادر شاہ ظفر قطب صاحب کے قریب والے مکان میں رونق افروز تھے۔ بادشاہ سلامت نے خلیفہ محمد اسمٰعیل کو خلعت پارچہ و سہ رقم جواہر عنایت کی۔[2]

یہ وہی خلیفہ اسمٰعیل تھے جبکہ یہ چھوٹے سے تھے تو نواب الٰہی بخش جو حضرت ذوق کے جگری دوست تھے۔ یہ اپنے والد کے ہمراہ ان کے ہاں گئے۔ رخصت ہوئے تو نواب صاحب نے ایک چھوٹا سا ٹانگن اصطبل سے منگایا۔ زین زریں کسا ہوا اس پر سوار کرکے رخصت کیا کہ یہ بچہ ہے یہ بھی خالی نہ جائے۔ اور کیا جانے گا کس کے پاس گیا تھا۔[3]

فوق صاحب سخن گو ہی نہیں بلکہ سخن فہم بھی تھے۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد "(ذوق) کی وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام (ذوق) کو ترتیب دیں۔ سب ذخیرہ نکالا۔ محنت نے اس کے انتخاب میں پسینے کی جگہ لہو ٹپکایا۔ کیونکہ بچپن سے لے کر دم واپسیں

---

[1] دیوان ذوق مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد ص ۱۲۲ [2] بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۶۱ [3] آب حیات ص

تک کا کلام ان ہی میں تھا۔

غدر میں انگریز کے موت کے پھندوں سے بچنا ان لوگوں کے لئے مشکل تھا جن کی آمد و رفت قلعہ معلٰے میں ہو اور خاص طور پر جن کے بہادر شاہ ظفر اور شہزادوں سے قریبی تعلقات اور مراسم ہوں۔ چنانچہ بہادر شاہ کی قربت اور تعلقات کی وجہ سے خلیفہ اسمٰعیل حکیم شریف الدین خاں مرحوم۔ کے نوجوان بیٹے نظام الدین خاں اور چند دوستوں کے ساتھ قدیم شریف سے گرفتار ہوئے۔ ایک رات کو توالی میں رہے۔ دوسرے دن پھانسی دے دی گئی۔

عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے خلاف کوئی الزام اور ثبوت نہیں تھا ان کو بالکل بے قصور دار پر کھینچا گیا۔ لیکن منشی ذکاء اللہ مرحوم تاریخ بغاوت ہند میں لوگوں کو پھانسی ملنے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے ذوق صاحب کے پھانسی پانے کے دو سبب لکھتے ہیں۔

"ایک دو صورتیں ایسی بھی ہوئیں کہ خاوندوں کو جب اپنی بیبیوں کا پتہ نہیں لگا تو ان مردوں کو جن کی معرفت یہ نکاح ہوا تھا اپنے افسروں کو اطلاع دے کر سزا دلواتے۔ کہتے ہیں کہ ذوق کا بیٹا فوق اس سبب سے پھانسی دیا گیا مگر اس کے پھانسی لگنے کا سبب اور بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایام غدر میں بادشاہی اہل کار تھا۔ (۲۱ے)"

شعراء کے تمام تذکروں میں خلیفہ اسمٰعیل صاحب کا ذکر نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ آب حیات بھی ان کی شاعرانہ زندگی کے بارے میں خاموش اور تخلص بتانے

میں بجلی اختیار کئے ہوئے ہے۔ نہ ہی مولانا آزاد نے ان کی شہادت کا ذکر اس کتاب میں صاف طور پر کیا ہے۔ تاریخ بغاوت ہند مولفہ منشی ذکاء اللہ مرحوم کے اوراق پر اگر نظر نہ پڑتی تو خلیفہ اسمعیل کے تخلص کا علم نہ ہوتا۔ اور ذہن رسا کام نہ دیتا تو ان کا کلام بھی دستیاب نہ ہوتا۔

کوہ نور لاہور ۱۸۵۴ء کے کچھ پرچے والد ماجد مولوی شرف الحق علیہ الرحمۃ کے کتب خانے میں موجود تھے۔ جن میں حضرت ذوق کی وفات کی خبر کے علاوہ ان کے حالات زندگی اور ان کی تاریخ وفات پر قطعات درج ہیں جن میں تین قطعے حضرت فوق کے ایک اردو اور دو فارسی کے نظر پڑے ملاحظہ ہوں۔[1]

ہر درد و غم کا دیکھا علاج اس جہاں میں فوق ۔۔۔ پر لا علاج پایا درد پدر کا غم

اس درد و غم کا سال جو ہم ڈھونڈتے تھے آہ ۔۔۔ از روئے درد سال بھی پایا پدر کا غم

سنہ ۱۲۷۱ھ

ہائے مہربانم ذوق آں گزیدہ حق ۔۔۔ چوں راہی جناں شد دل از جہاں بریدہ

بجنش نگر تو اے فوق از بہر سال فوتش ۔۔۔ آمد ندائے رضواں بخشیدہ شد گزیدہ

سنہ ۱۲۷۱ھ

ذوق شہ سخنوراں جانِ جہانِ شاعراں

شد چو بہ بزم قدسیاں پایہ بلند باغ قدس

از پئے سال رحلتش روح قدس بفوق گفت

سالِ وفات ہم بخواں پایہ بلند باغ قدس

سنہ ۱۲۷۱ھ

---

[1] کوہ نور لاہور ۱۹ دسمبر ۱۸۵۴ء

قربان، میر جیون فیض آبادی

میر جیون ان کا نام تھا۔ سپاہی پیشہ تھے۔ بیس سال کی عمر تھی۔ بقول میر حسن اسی سن و سال میں کمال حسن و خوبی کے ساتھ شعر کہتے تھے۔ جالی حوصلہ شجاع و جری، عالی ہمت بہادر اور اولوالعزم نوجوان تھے۔ شیخ محمد رفیع سودا کے شاگرد تھے۔ ان کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔

ایک روز فیض آباد میں فرنگیوں کی فوج صف بنائے ہوئے جا رہی تھی یہ درمیان میں سے گذرے، فوجیوں نے شور و غل مچایا، بد کلامی کی اور ہندستانی ہونے پر طعن کیا۔ انہوں نے کہا گالیاں مت دو۔ مجھے جانے دو۔ وہ باز نہ آئے انہوں نے بتقاضائے غیرت اپنے آپ کو قضا کے سپرد کر کے اپنا ہاتھ قبضہ پر ڈالا۔ ایک کو زخمی کیا۔ پھر کیا تھا سب ان پر پل گئے۔ بہادری کے ساتھ انہوں نے مقابلہ کیا۔ فوجی زیادہ تھے۔ اپنی گولیوں سے ان کو شہید کر دیا۔[۱] اسپرنگر نے لکھا ہے یہ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں کام آئے۔[۲]

آفریں باد بریں ہمت مردانہ او ؎ کہ جاں خود را قربان آبرو کرد

ان کے یہ دو شعر تذکرۂ میر حسن میں درج ہیں ؎

کیا پھونک دیا تو نے صبا کان میں گل کے ؎ یوں بند قبا کھل گئے جو آن میں گل کے

کیا جھول بلبل پہ کرے دیکھئے یہ عشق ؎ سوچاک ہوئے جیب گریبان میں گل کے

قیصر، مرزا خدا بخش۔ دہلوی

مرزا خدا بخش قیصر شاہ عالم بادشاہ کے نواسے اور مرزا قادر بخش صابر مؤلف تذکرۂ گلستانِ سخن کے ماموں تھے۔ حکیم محمد مومن خاں مومن کے

۱؎ گلشن ہند ص — ۲؎ یادگار شعراء ص ۱۶۲

شاگرد تھے۔ آخر عمر تک جبکہ ہوش حواس قائم رہے مشاعرہ کرتے رہے اور مومن بھی شریک ہوئے۔ بقول صاحب گلستان سخن :۔

"قیصر کی تواضع اور فروتنی گویا لوازم ذات سے ہے۔ اور خلق و مروت ان کی ادنیٰ صفات سے ہے۔ ان کے سخن کی طرز فصاحت اور ان کا کلام بنا متانت سے خالی نہیں ہے"

بہادر شاہ کے بھائی مرزا بابر کا لڑکا مرزا کالے مخبروں میں نوکر ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے خاندان والوں پر ایسے ایسے ظلم کرائے جن کے سننے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اپنی کارگذاری دکھانے کے لئے جھوٹ کے قلابے آسمان سے ملاتا تھا جس میں کوئی اصلیت و حقیقت نہیں ہوتی تھی۔ بمعمول شہزادوں کو اس طرح گرفتار کراتا کہ ان سے کہہ دیتا کہ صاحب کے سامنے جاکر کہہ دینا کہ ہم بادشاہ کے قریبی رشتہ دار ہیں اگر تم یہ کہہ دوگے تو تم کو بادشاہ کے ساتھ رکھا جائے گا۔ اور تمہاری بادشاہ کی طرح پنشن ہو جائے گی۔

دوسری طرف حکام سے جاکر کہتا کہ میں نے فلاں شہزادہ کو گرفتار کرایا ہے جو بادشاہ کا قریبی رشتہ دار ہے۔ جس نے غدر میں انگریزوں کے خلاف خوں ریزی میں حصہ لیا تھا۔ انگریزوں کو ایسے مخبر کی ضرورت تھی فوراً شہزادوں کو پھانسیاں دے دی جاتیں۔

ان ہی بے خطا شہزادوں میں ایک شہزادے مرزا قیصر تھے۔ یہ اس قدر بوڑھے اور سن رسیدہ تھے کہ ان کے ہوش و حواس بھی درست

مولانا کفایت علی کافی

نہیں تھے اور کوئی شخص خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ انہوں نے غدر میں کوئی حصہ لیا ہوگا مگر مرزا کانے نے مرزا قیصر کی طرف سے ایسی بے سروپا باتیں لگائیں کہ انگریز آگ بگولا ہو گئے اور غریب بوڑھے شہزادے کو پھانسی دے دی گئی۔[1] مجمع الاشعار میں ان کا کافی کلام موجود ہے۔ یہاں تبرکاً ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

کریں گر کلفتِ دل کا بیاں ہم	ملا دیں خاک میں ہفت آسماں ہم
ہوس غیر سے عشق اپنا اسے یاد آیا	کیا نئی طرح سے ہم دلمیں گذر کرتے ہیں
تو لطف کرے یا نہ کرے خوش ہو کہ ناخوش	اس بات میں مرتا ہوں کہ عاشق ہوں ترا میں
اس کوچہ میں خاک ہونے کا چرچا ہے جا بجا	نام اپنا جب ہوا کہ رہا کچھ نشاں نہیں

جنوں میں بھی مری شوکت نہیں جاتی کہ اے قیصرؔ
جہاں جاتا ہوں میرے ساتھ اب لڑکوں کا لشکر ہے

نبھے گی خاک محبت کہ نام سے قیصرؔ	وہ اپنے زعم میں سمجھے ہیں مالدار مجھے

کافیؔ۔ مولوی کفایت علی۔ مراد آبادی

مولانا کفایت علی صاحب خاندان خانوادہ سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ موقر و برگزیدہ علماء میں ان کا شمار تھا۔ مراد آباد کے قدیم باشندے تھے چنانچہ آپنے ایک شعر میں اپنے مخصوص انداز میں اس کا ذکر کیا ہے ؎

چل مدینہ طیبہ کو۔ چھوڑ کر شہر و وطن	اس مراد آباد سے۔ کافیؔ کہاں کا ارتباط

ابتدائی تعلیم آپنے مراد آباد میں حاصل کرنے کے بعد بریلی اور بدایوں میں تحصیل علم کی کوشش کی اور شاہ ابو سعید رامپوری سے علم حدیث پڑھا

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۲۰۸

جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے اور شاہ غلام علی دہلوی نقشبندی کے خلیفہ تھے۔ ۱۲۶۵ھ میں فوت ہوئے اور حضرت شاہ غلام علی قدس سرہ کے پہلو میں خانقاہ میں دفن ہوئے[1]

علم طب مولانا کافی نے حکیم شیر علی صاحب سے حاصل کیا۔ حکیم صاحب نواب آصف الدولہ کے عہد میں تحصیلداری پر مامور تھے۔ اپنے زمانے کے بے مثل حکیم تھے۔ مولوی رحمٰن علی صاحب مؤلف تذکرہ علماء ہند جو حکیم شیر علی خاں صاحب کے فرزند ارجمند تھے اپنے تذکرہ میں حکیم صاحب کے علاج معالجہ کے عجیب و غریب واقعات لکھے ہیں۔ مولانا کافی نے اپنے اُستاد حکیم شیر علی خاں کی حسب ذیل تاریخ وفات لکھی تھی[2]

تو شیر علی نے کیا انتقال	تو کافی مناسب ہے بہر ثواب
یہی سال تاریخ لکھ دیجئے	بہ لوحِ لحد خادمِ بوتراب

۱۲۶۲ھ

مولانا کافی کو علومِ نقلیہ عقلیہ میں کمال حاصل تھا۔ خصوصاً علم طب صرف نحو ادب، عروض میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے[3] تاریخگوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

مولانا کافی زیارت حرمین شریفین کیلئے بڑے بیتاب رہتے تھے اس کا ذکر اپنے اشعار میں بارہا والہانہ انداز سے فرمایا ہے۔

دکھائے بلدۂ طیب، دکھائے روضۂ اقدس	دکھائے گنبدِ خضریٰ کہ تسکینِ دل و جاں ہو
دکھائے وہ بھی دن یارب کہ حاضر ہو کے یہ کافی	جنابِ مصطفےٰ کے آستانہ پر غزل خواں ہو

---

[1] تذکرہ کاملان رام پور صفحہ ۔ [2] تذکرہ علماء ہند صفحہ ۹۱

[3] مضمون محمد ایوب قادری بی۔ اے۔ العلم جنگ آزادی نمبر کراچی جون ۱۹۵۸ء

ہے مدینہ کی زیارت کا جو کافیؔ مشتاق
یہ ارادہ مرا یارب کبھی پورا ہوگا

اللہ رے ان آنکھوں کی یہ ہر عین تمنا
دکھلائے مدینہ ہمیں دکھلائے مدینہ

کافیؔ یہ تمنائے دلی ہے کہ دم مرگ
گر آہ جو کھینچوں تو کہوں ہائے مدینہ

مولانا کافیؔ کی یہ تمنا پوری ہوئی زیارت روضۂ انور آقائے نامدار جناب محمد رسول اللہ سے فیضیاب ہوئے جس کے بعد آپ نے ایک مثنوی تجلی دربار رحمت لکھی۔

[illegible] ۱۸۵۷ء کی آزادی کی تحریک میں حصہ لیا تھا اس میں آپ نمایاں [illegible]

میرٹھ میں فوج نے جو بغاوت کی تھی اس کی خبر [illegible] ایک سوار مراد آباد میں لایا جس کی وجہ سے مراد آباد کے اطراف میں اس قسم کی خبریں پھیلنے لگیں۔ میرٹھ کی خبر سن کر مسٹر جی سی ولسن صاحب جج کے حکم سے ۱۲ مئی کو پریڈ میں فوجیوں کو حکم سنایا گیا کہ کارتوس جدید نہیں کٹوایا جائیگا۔ ۱۸ مئی کو سفر مینا کی پلٹن سے ستر آدمی میرٹھ سے مراد آباد آئے اور گاگن کے پل پر ٹھہرے۔ ان کے آنے کی وجہ سے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میرٹھ میں بغاوت ہو گئی ہے۔ چنانچہ مراد آباد کے گرد و نواح میں ہنگامے ہونا شروع ہو گئے لیکن شہر کی فضا میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

۲۱ مئی کو دو سو غازیوں کا غول رام پور سے آیا اور شہر سے باہر آکر جمع ہو گئے۔ مراد آباد کے اندر داخل ہونے لگے۔ ولسن صاحب کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو ۲۹۔ نمبر پلٹن کو لے کر رام گنگا کے کنارے پہنچے مقابلہ ہوا انگریزی فوج بہت زیادہ تھی۔ غازیوں کا گروہ منتشر ہو گیا۔ اسی اثنا میں

ایک شخص نے شیر بچہ بھر کے جج صاحب کو جہنم واصل کرنے کے لئے چھوڑنا چاہا تھا کہ ایک فوجی نے اس کو دوڑ کر پکڑ لیا۔ اور گولی ماردی۔ مولوی منو جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انہوں نے رام پور سے غازی کی ٹولی بلوائی تھی، یہی اس گروہ کی قیادت کر رہے تھے .... ان کو امام الدین بن رحیم الدین امروہوی کوتوال مراد آباد نے اور ان کے تین ساتھیوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔[۵۱]

۳ رجون کو مراد آباد میں جب یہ خبر آئی کہ بریلی میں بھی بغاوت [illegible] تو پلٹن نمبر ۲۹ نے علی الاعلان [illegible] حسا [illegible] مجدالدین عرف مجو خاں بھی بند تھے [illegible] قیدیوں کے ساتھ یہ بھی باہر نکلے۔ ان کو کورٹ صاحب جنٹ مجسٹریٹ بدایوں کو مار ڈالنے کے سلسلے میں تا دائم الحیات کالے پانی کا حکم ہو چکا تھا۔ انہوں نے جنٹ صاحب پر حملہ کیا تھا۔ جس سے ان کی دو ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئی تھیں۔ حملہ کرنے کے بعد یہ دو سال تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگے تھے۔ گرفتار ہونے کے بعد مراد آباد کی جیل میں سزا کاٹ رہے تھے۔[۵۲]

قیدیوں نے رہا ہونے کے بعد تلواریں بلند کیں اور افسروں پر حملہ آور ہوئے تو انگریز مراد آباد سے بھاگ کر میرٹھ اور نینی تال چلے گئے نواب مجو خاں حاکم مراد آباد مقرر ہوئے۔ عباس علی خاں بن اسد علیخاں ہندی توپ خانے کے افسر معین ہوئے۔ اور مولوی کفایت علی صاحب صدر الشریعت بنائے گئے۔ انہوں نے عوام میں جہادی روح پھونکی شہر میں

---

۵۱ المشاہیر صہ ۲۰۳ ۔ ۵۲ روزنامچہ مصائب غدر صہ ۲

ہر جمعہ کو بعد نماز انگریزوں کے خلاف وعظ فرماتے تھے۔ جس کا بے حد اثر ہوتا تھا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر مراد آباد میں لکھا ہے :-

"مسلمانوں نے من حیث القوم ضلع [illegible]
سے اپنی [illegible] طور پر ظاہر لیا ہے
[illegible] اس طرح مراد آباد کے ضلع میں غیرت مذہبی
اور انگریزوں کی ہر بات سے نفرت کے جذبات نے مسلمانوں کو
عام بغاوت پر مشتعل کیا تھا"

مولانا کفایت علی مرحوم نے نشر و اشاعت کے سلسلے میں کافی کام کیا فتویٰ جہاد کی نقول دوسرے مقامات پر بھجوائیں۔ بلکہ بعض مقامات پر خود بھی تشریف لے گئے۔ آنولہ ضلع بریلی میں خاص اسی مقصد کے لئے ہفتہ عشرہ قیام کیا تھا۔ حکیم سعد اللہ ابن عظیم اللہ کے یہاں ٹھہرے۔

حکیم سعد اللہ آنولہ کی تحریک آزادی کے خاص رکن تھے۔ آنولہ میں نواب کلن خاں نبیرہ بخشی سردار خاں نواب خان بہادر خاں کی طرف سے حاکم مقرر تھے جن کے ساتھیوں میں مولانا اسمٰعیل شاگرد شاہ محمد اسحٰق دہلوی نواب جان محمد، نواب حسن، شیخ خیر اللہ اور حکیم سعد اللہ وغیرہ تھے۔ حکیم سعد اللہ اور مولانا کافی میں بڑے خاص تعلقات تھے۔ مولانا کافی آنولہ سے بریلی پہنچے۔ وہاں نواب خان بہادر خاں اور امیر المجاہدین مولوی سرفراز علی سے مشورے ہوئے۔[1]

---

[1] مضمون محمد ایوب قادری بی۔ اے۔ العلم جنگ آزادی نمبر۔ کراچی جون ۱۹۵۷ء

نواب یوسف علی ناظم والی رام پور انگریز کے پٹھو تھے اور ملک کے دشمن بنے ہوئے تھے اور محبان وطن کے خون کے پیاسے تھے۔ انہوں نے جب مراد آباد [illegible] رنج وافسوس ہوا۔ انگریزوں کے قتل وغارتگری کا۔ انہوں نے [illegible] آباد سے قوم پرستوں کا غلبہ ختم کرانے کے لئے اپنے حقیقی چچا عبد [illegible] مع فوج اور حکیم سعادت علی خاں کو بطور منتظم مراد آباد روانہ کیا۔ جب وہاں پہنچے تو جو سنا تھا وہی رنگ پایا۔ انہوں نے مکر وفریب سے کام لیا اور نواب رام پور کی حکومت کا اعلان کیا۔

۶ر جون کو خود نواب رامپور مراد آباد پہنچ گئے۔ قوم پرستوں کو مغالطے میں رکھنے کے لئے نواب مجو خاں کو یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کا اثر واقتدار ہے ضلع کا ناظم مقرر کیا اور حکیم سعادت علی خاں کو جج مقرر کیا۔ نیاز علی خاں ڈپٹی کلکٹر بنے۔[1]

جب مولانا کفایت علی صاحب کے ذریعے خان بہادر خاں کو مراد آباد کے حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے فوراً پلٹن ع۲۹ اور شاہجہانپور کے سپاہی جن کو دہلی بھیجا جا رہا تھا ان کو نواب رامپور کی تادیب اور نواب مجو خاں کی مدد کرنے کے لئے جنرل بخت خاں کی قیادت میں بھیجا۔ یہ فوج رام پور کے باہر ٹھہری اور نواب رام پور سے گفتگو کی۔ مالی مدد دے کر نواب رامپور نے بمشکل جنرل بخت خاں سے رہائی حاصل کی۔

---

[1] اخبار روہیل کھنڈ مراد آباد۔ ۲۰ر اگست ۱۸۵۷ء

جنرل بخت خاں کی آمد کے زمانہ میں نواب رام پور ۔۔۔ فوج رام پور میں حفاظت کے لیئے منگائی تھی۔ اس کے بعد مراد آباد میں مجاہدین کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں اور مجو خاں نے پھر اپنا سکہ جمانا شروع کر دیا تھا۔ ۱۴ جون کو بخت خاں مراد آباد آئے۔ نواب مجو خاں نے مولوی عالم کی شکایت کی جنھوں نے کچھ عیسائی لوگ اور ڈپٹی کلکٹر جو انگریزی افسروں کے ساتھ بھاگنے سے رہ گئے تھے ان کو اپنے ہاں چھپا رکھا ہے۔ ان کی شکایت پر مولوی صاحب کا گھر لوٹا گیا۔ اور انگریزوں کو پکڑ کر گاڑیوں سے باندھ کر اپنے لشکر میں لے گئے، مسٹر کیجن ڈپٹی مجسٹریٹ اور ان کا سالا مسٹر کاربری اور اس کا ایک لڑکا جو ایک کایستھ کے گھر میں چھپا ہوا تھا گھر میں سے پکڑ کر لے گئے۔ ان تینوں کو رات کے وقت زیپت گنج کے مغربی دروازے کے قریب مسجد کے سامنے قتل کیا گیا۔[1]

۱۷ جون ۱۸۵۷ء کو بخت خاں مع فوج کے مراد آباد سے دہلی کی جانب روانہ ہوئے ان کے ہمراہ پلٹن ۲۹ بھی مراد آباد سے دہلی کے لیئے چل دی۔ گرفتار شدہ عیسائیوں میں ایک مسٹر فلپ سررشتہ دار ججی اور ایک ۶۸ نمبر کی پلٹن کے باجے کا افسر گجرار کے قریب مار ڈالے گئے۔ باقی چار عیسائی: ایک مسٹر بادل ڈپٹی انسپکٹر ڈاکخانہ دوسرا مسٹر بل سررشتہ دار کلکٹری۔ تیسرا مسٹر ڈارنگٹن محرر کلکٹری۔ چوتھا مسٹر یک گابر محرر ججی ان کی قید میں دہلی تک گئے۔ شاید دہلی میں پہنچتے ہی وہاں کے فوجیوں نے ان کو مار ڈالا ہو گا۔[2]

---

[1] اخبار الصنادید دوم ص ۹۱ء

[illegible] ب پور بجرولہیں سند حکومت مراد آباد کی مجو خاں، اور اسد علی خاں کو بادشاہ کی طرف سے لکھ دی گئی۔ اس وقت نواب مجو خاں کے مراد آباد کے حاکم ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ سات دن تک نواب مجو خاں کی حکومت قائم رہی۔

۲۴ جون ۱۸۵۸ء کو دوبارہ نواب رام پور نے عبد العلی خاں اور حکیم سعادت خاں کو فوج کے ساتھ مراد آباد بھیجا۔ ان لوگوں نے اس مرتبہ بھی نواب مجو خاں سے مصالحت کر لی اور ان کو سنبھل کی نظامت سپرد کر دی اور ساٹھ ہزار روپے کی جاگیر مقرر کی۔ نواب مجو خاں کے حاکم سنبھل ہوتے ہی تمام اضلاع مراد آباد میں قوم پرستوں نے ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ نواب ولی داد خاں یورش کر کے سیلاب گنگا کے اس پار آ کر حسنپور تک پہنچ گئے تھے۔ چندوسی، امروہہ اور ٹھاکردوارے میں ٹیکس وصول کرنے لگے، راستہ پر ان کا پورا قبضہ تھا۔ صاحب سنگھ اور چھدو لکھوری کے جاٹوں نے سنبھل اور اس کے گرد و نواح میں تحریک کو اور بھی قوت دی۔ دھرماندیا وغیرہ نے غداروں کو سزا دے کر چندوسی میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ جنگی خاں وسردار خاں و پورتنگا اہیر ٹھاکردوارے کے محلات پر قابض ہو گئے تو انگریزوں کے حامی جلا وطن ہو کر مختلف مقامات پر چلے گئے۔

۲۵ جون کو چندوسی میں سے قوم پرستوں کا زور توڑنے کے لئے صاحبزادہ سید اصغر علی خاں فوج کے ساتھ جا رہے تھے کہ ایک عرضی بیوہ مصطفےٰ حسنپوری کی ملی کہ سلطان علی میرا رشتہ دار حسن پور میں غداروں کو موت کے گھاٹ اتار

رہا ہے۔ کوتوال سید موسیٰ رضا کو حکم ہوا کہ جلد جا کر انتظام کرو۔ کوتوال نے سید افضل علی تھانہ دار سابق امروہہ اور حسن بخش خاں کو انتظام سہنس پور کے لئے مقرر کیا۔ دونوں نے انکار کیا۔ آخر موسیٰ رضا خاں بذات خود سہنس پور روانہ ہوئے۔ بلاری میں سید علی اصغر خاں بھی فوج کے ساتھ مل گئے۔ کوتوال کے پہنچنے کے قبل ہی سہنس پور کا کام تمام ہو گیا۔ صاحبزادے وہاں سے ناکام رخصت ہوئے۔ اس عرصہ میں چندوسی پر قوم پرستوں کا قبضہ رہا۔ اور آٹھ روز تک حکومت کی۔ رام پور کی فوج دوبارہ گئی۔ مقابلہ ہوا۔ قوم پرستوں نے چندوسی کو چھوڑ دیا۔ حسنپور میں بھی رامپور کی فوج سے نواب ولی داد خاں کا زبردست مقابلہ ہوا۔ اور غداروں کے دانت کھٹے ہو گئے۔ قوم پرستوں کے پاس اسلحات کی کمی تھی۔ اس لئے خوش اسلوبی کے ساتھ ولی داد خاں مع فوج کے واپس چلے آئے۔

جولائی ۱۸۵۷ء میں بقول صاحب اخبار الصنادید مراد آباد کے عوام کی یہ حالت تھی:۔

> "مسجدوں میں جہاد کے واسطے وعظ کہا جاتا جس سے باغیوں کی زیادہ ہمت بڑھتی تھی۔ عوام الناس میں مشہور تھا کہ ایک شخص ایران سے ایک لاکھ نمازیوں کو لے کر دہلی میں آیا ہے جس کی کرامت سے انگریزوں کے تمام بان اور گولے پانی کے قطروں کی طرح بہ جاتے ہیں۔ بعض کا قول تھا کہ بمبئی کی باغی فوج قسطنطنیہ ہو کر انگلستان کی ملکہ کی گرفتاری کے لئے گئی ہے تاکہ اس کو دہلی کے بادشاہ کے دربار

میں حاضر کرکے چربی آمیز کارتوسوں کے بیچنے کی باز پُرس کرے۔ مراد آباد میں انگریزی وضع کا کپڑا پہننے والے کو جان کا خوف تھا۔ اور انگریزی بولنے والا تو بالکل کرسچین سمجھا جاتا تھا۔ دہلی میں انگریزوں کی شکست پانے کی خبریں بڑے زور شور کے ساتھ نئے حکمرانوں کو لکھی گئیں کہ اب کوئی لمحہ یا چشم زدن میں ان کافروں کا استیصال کیا جاتا ہے ایسے طوفان کے زمانے میں صرف چند آدمی مراد آباد کے انگریز کے خیر خواہ تھے۔"

نواب رام پور کی دست اندازی اور غداری کرنے پر قوم پرستوں کو بہت ملال تھا۔ خاص طور پر نواب مجو خاں چاہتے تھے کہ مراد آباد سے نواب رامپور کے اقتدار کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن ان کو انگریزوں کی بڑی حمایت حاصل تھی اس لئے اُن کا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔ حالانکہ بچہ بچہ نواب رام پور کا مخالف تھا ریاست رام پور کے ہاں کا قاعدہ تھا کہ کچھ سپاہی نواب صاحب کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کو "پلنگ کا پہرہ" کہا جاتا ہے۔ رات کو جو سپاہی پہرہ بدلتا تھا وہ تمام سامان سپرد کرنے کے بعد کہتا تھا کہ "ایک کرسٹان بھی ہے" نواب صاحب بے غیرتی کے ساتھ ان کلموں کو سُنتے تھے۔

نواب رام پور مراد آباد میں بظاہر قابض تھے ورنہ ان کو ہر شخص مشکوک نگاہ سے دیکھتا تھا۔ شہزادہ فیروز شاہ ۷ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق ۲۲ راپریل ۱۸۵۸ء کو سنبھل کے راستے سے مراد آباد میں داخل ہوئے اور عیدگاہ کے قریب قیام کیا۔ مجاہدین کی ہمتیں بلند ہوگئیں

تدبیریں اور منصوبے بنائے جانے لگے۔ غلام ناصر خاں، موسیٰ رضا اور مولوی
شاہ علی فیروز شاہ کے پاس پہنچے۔ شہزادے نے کہہ دیا کہ راستہ بھول گیا ہوں
روزہ دار ہوں افطار کرنے کے بعد چلا جاؤں گا۔ اسی درمیان میں شاہزادہ
کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ شہزادہ کی فوج اصول و قواعدِ جنگ سے واقف اور
ماہر تھی۔ نواب رامپور کی فوج نے شہزادہ سے شکست فاش کھائی۔ سب سے
پہلے غالب علی رسالدار بھاگا۔ فوج کے سربراہ موسیٰ رضا اور غلام ناصر
بُری طرح زخمی ہوئے۔ راستے میں مولوی شاہ علی نے شیوخ قصابان کے
چودھری سے امداد چاہی۔ اس نے دین سے روگردانی اور فرنگی کی مدد کا
طعنہ دیا۔ شاہ علی شرمندہ ہوئے[1] شاہزادہ کی فوج مراد آباد میں پھیل گئی۔
انگریزوں کے حامیوں کی گوشمالی کی گئی۔ جس سے مجاہدین میں بڑی قوت و
طاقت پیدا ہوگئی۔ فیروز شاہ نے ایک محضر نامے پر سولہ ہزار اشخاص سے
بہ قسم شرعی دستخط کرائے۔ جب اس کو اہل شہر کی طرف سے اطمینان کلی
ہوگیا تو اور مقامات کے انتظامات کی طرف متوجہ ہوئے۔

نواب یوسف علی خاں کو فیروز شاہ کے مراد آباد پر قبضہ کرنے سے
بہت دکھ ہوا۔ یہاں تک کہ ان سے دو وقت کھانا نہیں کھایا گیا۔

۲۲ر اپریل ۱۸۵۸ء کو دوبارہ فوج روانہ ہوئی۔ مگر اچھیڑ کے پل تک پہنچتے
پہنچتے فوج میں آدھے آدمی رہ گئے۔ حکیم نجم الغنی رامپوری مؤلف
اخبار الصنادید نے چشم دید حالات دیکھنے والوں کی زبانی روایت قلمبند کی ہے۔

"سپاہی بندوق کا کندہ درخت کے تنے میں زور سے مارتے ۔۔

---

[1] اخبار روہیل کھنڈ مراد آباد، ۷ر اگست ۱۸۵۸ء

وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ پھر بندوق پھینک کر رام پور
کی طرف لوٹ جاتے تھے۔"

صبح کاذب سے قبل ریاست رامپور کی فوج نے رام گنگا کی طرف
کا کنارا لے لیا۔ شہزادہ فیروز شاہ ہوشیار تھا۔ اس کا انتظام خبر رسانی
نہایت اچھا تھا۔ پانچہزار آزمودہ تجربہ کار فوج اس کے ہمراہ تھی۔
فوج کو ٹھیک کیا۔ اس پر مطلق خوف و ہراس نہ تھا۔ تمام شہر مراد آباد
اس کی مدد کے لئے تیار تھا۔ اس نے تین مورچے قائم کئے۔ ایک شاہ
بلاقی شاہ کے مزار کے پاس، ایک قلعہ پر اور تیسرا ان دونوں کے
درمیان قائم کیا۔ ریاست کی فوج نے بھی تین حصے کر کے مندرجہ بالا
مورچوں کے مقابل مدافعت کی تیاری کی۔ قلعہ کے مقابل کاظم خاں
مزار کے پاس حکیم سعادت علی خاں اور درمیانی مورچے پر
عبدالعلی خاں مقرر تھے۔

۲۲ر اپریل ۱۸۵۸ء کو کاظم خاں کی فوج نے حملہ کیا۔ فیروز شاہ
کی فوج نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ قتل و غارتگری کا بازار گرم تھا۔
حکیم سعادت علی خاں کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ حکیم سعادت علی خاں
حسین بخش اور یعقوب خاں نے شہزادے پر دوسری جانب سے حملہ
کر دیا۔ فوج میں ابتری کچھ دیر کے لئے پھیلی۔ لیکن سنبھل کر شہزادہ کی
فوج نے مصنوعی طور سے راہ فرار اختیار کی۔ رامپوری فوج نے مژدہ فتح
سمجھ کر ان کا تعاقب کیا۔ کچھ دور جانے کے بعد فیروز شاہ کی فوج نے

پلٹ کر حملہ کر دیا۔ والیِ رام پور کی فوج کو شکست ہوئی۔ بڑے بڑے سردار وزیر خاں وسمند خاں وغیرہ کام آئے۔ اس موقع پر شہزادہ نے ایک پُر اثر تقریر کی اور ضرورت جہاد اور انگریزوں کے کرتوتوں پر روشنی ڈالی مگر نواب کی فوج پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس نے جمع ہو کر پھر حملہ کیا۔ فیروز شاہ کے مخبر نے اطلاع دی کہ جنرل جونسن کی تازہ دم فوج آرہی ہے۔ تقریباً دن کے بارہ بجے فیروز شاہ نے میدان چھوڑ دیا۔ حکیم سعادت علی خاں و حسین بخش رسالدار وغیرہ مراد آباد میں داخل ہو گئے۔

۲۵ اپریل کو جنرل جونسن گورہ فوج کے ساتھ نجیب آباد وغیرہ کا انتظام کرتا ہوا ۲۴ اپریل کو مراد آباد آیا۔ نواب رامپور کے اہلکاروں نے مراد آباد کی حکومت کا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ جنرل جونسن کے آتے ہی مسٹر انگلس بنگال سول سروس کا جو مراد آباد کے لوگوں سے پورا واقف تھا مراد آباد پہنچ گیا اور اس کے بیان اور شناخت کے مطابق محبان وطن گرفتار ہوئے۔

نواب مجو خاں آخر وقت بھی ایک مکان کی چھت پر بندوق چلاتے نظر آئے ان کو سات ہتھیار بند سپاہی گرفتار کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ اُن سے بھی گرفتار نہ ہو سکے۔ آخر ان کے گولی ماری گئی تب انہوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

نواب مجو خاں کے پھانسی پانے کے بارے میں مراد آباد میں حسب ذیل روایت زبان زد خاص و عام ہے جس کی بنا پر مخبر عالم مراد آباد ہفتہ وار میں اس روایت کو ۱۵ اگست ۱۹۵۸ء کے جنگ آزادی کے نمبر میں دُہرایا ہے۔

"اس مجاہد ملت کو گرفتار کرا کے پھانسی پر لٹکا یا گیا پھر چونے میں

پکڑوایا اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ لاش کو چونے سے نکال کر ہاتھی کے پیر سے بندھوایا اور تمام شہر میں گشت کرایا گیا اور پھر اس لاش کو جس کے سڑکوں پر گھسٹنے سے چیتھڑے اڑ رہے تھے اس مقام پر جہاں شمع حریت کے پروانوں کو پھانسی دی جا رہی تھی محلہ گشہید میں پھینک دیا گیا تاکہ جسم کا بچا کھچا گوشت چیل کووں کی غذا بن جائے یہ عجیب معجزہ ہے کہ جس وقت نواب مجو خاں کے ڈھانچے کو چیل کووں کے کھانے کے لیئے پھینک دیا گیا اس کے تھوڑی دیر بعد دو شخص سفید پوش عیدگاہ کی جانب سے اس جگہ پہنچے۔ انہوں نے اس لاش کی تجہیز و تکفین اپنے ہاتھوں سے کی۔ اور دفن کر کے جس طرف سے آئے تھے اسی طرف چلے گئے"۔

مولانا کافی کے خلاف فخرالدین کلال نے مخبری کی۔ مولانا گرفتار ہوئے پھانسی کا حکم ہوا تو مسرور ہوئے۔ جب قتل گاہ پر مولانا کو لیجایا گیا تو یہ غزل پڑھتے ہوئے خراماں تشریف لے گئے۔ ؎

کوئی گل باقی رہیگا نے چمن رہ جائیگا
پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائیگا

ہم صفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائینگی سونا چمن رہ جائیگا

اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں ہو
اس تن بیجان پر خاکی کفن رہ جائیگا

نام شاہان جہاں مٹ جائینگے لیکن یہاں
حشر تک نام و نشان پنجتن رہ جائیگا

جو پڑھے گا صاحب لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائیگا

سب فنا ہو جائینگے کافی ولیکن حشر تک
نعت حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائیگا

حضرت مولانا کافیؔ کو مراد آباد کی جیل کے پاس مجمع عام کے سامنے پھانسی دی گئی اور وہیں دفن کئے گئے۔ مولانا محمد عمر صاحب نعیمی مراد آبادی کا بیان ہے کہ شہادت سے تقریباً پینتیس سال بعد مولانا کافیؔ کی قبر کھل گئی دیکھا جسم ویسا ہی کا ویسا تھا جیسا دفن کرتے وقت تھا مولوی محمد عمر صاحب نعیمی مراد آبادی کے نانا شیخ کرامت علی ٹھیکیدار نے جسم اطہر کو دوسری جگہ عقب جیل میں دفن کرادیا[1]

مولانا محمد عمر صاحب نعیمی کی روایت میں یہ حصہ صحیح نہیں ہے کہ "مولانا کافیؔ کا جسم مبارک مولوی محمد عمر صاحب کے نانا شیخ کرامت علی ٹھیکیدار نے دوسری جگہ دفن کرایا تھا"

صحیح واقعہ بقول مولوی ظفرالدین صاحب مراد آبادی خلف مولوی نعیم الدین صاحب مرحوم یہ ہے کہ "ایک سڑک بدھ کے بازار سے نکالی جارہی تھی۔ مولانا کافیؔ کے مزار کا نشان نمایاں نہیں تھا۔ مزدور نے جب اس پر پھاوڑا چلایا تو مولانا کافیؔ کی پنڈلی پر لگا اور وہ نظر آئی۔ مزدور نے انگریز انجینئر سے کہا۔ اس نے احتراماً فوراً اس قبر کو درست کرادیا اور سڑک کا رُخ بدل دیا۔ جس کی وجہ سے سڑک میں ٹیڑھاپن پایا جاتا ہے۔ مولانا کافیؔ کی قبر کنجری سرائے مویشی خانے کے سامنے ہے اسی قبر میں جسم مبارک ہے منتقل نہیں ہوا"

مولانا کافیؔ اپنے دور کے مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار ہوتے تھے ان کے کافی شاگرد تھے جن میں قابل ذکر نام سید عباس علی صاحب عباسؔ

---

[1] مضمون محمد ایوب قادری بی۔ اے اعظم کراچی جنگ آزادی نمبر جون ۱۹۵۷ء

خلف سید نادر علی مراد آبادی کا ہے جو عدالت منصفی مراد آباد میں وکالت کرتے تھے۔ مولانا کافی شیخ مہدی علی خاں ذکی مراد آبادی کے شاگرد تھے۔

مولانا کافی کو نعتیہ شاعری میں خاص مقام حاصل ہے۔ آپ کی تمام تر شاعری منقبت و مداحی رسول خدا کے لئے وقف تھی۔ زبان نہایت سلیس، عام فہم، صاف شستہ اور لوچدار ہے آورد کا نام نہیں ہے آمد ہی آمد کلام میں پائی جاتی ہے۔ اشعار درد انگیز اور انتہائی موثر ہوتے ہیں۔ انداز کلام عاشق جانباز کا سا ہے جو اپنے محبوب تک انکسار و عاجزانہ طور پر اپنے دل کی دردناک آواز اور غمناک پیغام کو پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا کافی کے ہمعصر جنھوں نے شعراء کے تذکرے لکھے ہیں وہ ان کے کلام اور ان کی سیرت و اخلاق کے معترف ہیں۔ لیکن ان کی شہادت کا ذکر کرنے میں ہچکچاتے ہیں۔ مولانا عبدالحی صفا بدایونی تذکرہ شمیم سخن ص ۱۹۱ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"کافی صاحب عالم و صالح و دیندار تھے۔ مداحی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے اوقاتِ عزیز گذارتے تھے۔ بہارِ خلد حلیۂ مبارک اور اکثر کتب نظم و نثر ان کی راقم کی نظر سے گذری ہیں"

صاحب گلستان بے خزاں رقمطراز ہیں:-

"کافی مؤلف شمائل ترمذی، نسیم جنت عالم بے بدل قابل دانائے دقائق احادیث و آیات قابل فضیلت نفی اثبات کی کیا بات ہے۔ بحث صرف و نحو میں بہر نحو و صرف اوقات نظم خوب کیا ہے۔ شائق کو

مرغوب ہے سامعین کو کافی ہے ناظرین کو وافی ہے۔"

مولانا عبدالغفور نساخ مؤلف سخن شعراء کی رائے بھی ملاحظہ ہو:۔

"کافی صاحب علم وفضل وزہد وورع ہیں بیشتر اشعار ان کے حمد ونعت میں ہوتے ہیں۔ مولانا کافی کی زیادہ تر تالیف وتصانیف نظم میں ہیں اور ان میں بھی احادیث کے تراجم یا اس کی شرح ہوتی ہیں۔ چہل احادیث کا ترجمہ نسیم جنت، شمائل ترمذی کا ترجمہ بہار خلد اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے رسالہ ترغیب اہل سعادت کا ترجمہ خیابان فردوس ہے۔ دیوان کافی کے علاوہ داستان صادق، جذبۂ عشق، مثنوی تجلی و بہار نبی کریم۔ حلیہ شریف، مولود بہاریہ اور اوقات نحو وصرف بھی مولانا کافی کی تصانیف ہیں نمونۂ دیوان، کافی کے چند منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

یا الٰہی حشر میں خیر الورا کا ساتھ ہو — رحمت عالم محمد مصطفےٰ کا ساتھ ہو

یا الٰہی ہے یہی دن رات میری التجا — روز محشر شافع روز جزا کا ساتھ ہو

بعد مرنے کے بھی ہے کافی کی یارب یہ دعا — دفتر اشعار نعت مصطفےٰ کا ساتھ ہو

جب کسی کو ہو زیارت صاحب لولاک کی

وہ نہ لائیگا کبھی کافی خیال حور عین

بہار خلد ہے روئے محمدؐ — شمیم جانفزا ہے بوئے محمدؐ

دل وحشی ہے زنجیروں تڑاتا — بشوق یاد گیسوئے محمدؐ

کوئی پیدا ہوا ایسا نہ ہوگا — عدیم المثل ہے خوئے محمدؐ

نہ دیکھا ہو جہاں میں جس نے فردوس — وہ آکر دیکھ لے کوئے محمدؐ

بس اے کافیؔ ہے آگے جائے آداب
کہاں تو اور کہاں روئے محمدؐ!

مدح خواں کافیؔ محتاج نہ جاوے محروم — رحمتِ عام یہ دربار ہے سبحان اللہ
لاکھ منزل سے پہنچتا ہے سلامِ اُمت — عینِ اعجاز یہ دربار ہے سبحان اللہ
کافیؔ ہزار شکر کہ رب کریم نے — اپنے حبیبؐ کے مجھے در کا گدا کیا
گر جنوں بھی ہو تو عشقِ احمدی کا ہو جنوں — ہو اگر سودا تو سودائے جنابِ مصطفےٰؐ

وجد کے عالم میں جاتا لوٹتا آنکھوں کے بل
دیکھ کر میں گنبدِ خضرےٰ مدینہ کے قریب

گل ہے نعتِ شہِ مدینہ کو گلستاں سے اختصاص — ہے گر مدحِ شفیعِ عاصیاں سے اختصاص
بس آرزو یہی ہے دلِ حسرت زدہ کی ہر — سنتا رہوں شمائل و احوالِ مصطفےٰؐ
عرشِ بریں پایۂ ایوانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم — خلد سرا بستانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
آپ کفیلِ کارِ امت آپ شفیعِ روزِ قیامت — ہیں بیحد احسانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
مظہرِ رحمت مصدرِ رأفت مخزنِ شفقت عینِ محبت — ذاتِ محمد جانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
رحمتِ عالم جس کا لقب ہے خلقتِ عالم کا وہ سبب ہے — ہے کیا عالی شانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بہرِ شفائے درد و مصیبت اور برائے رنج و فلاکت
کافیؔ ہے درمانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

یہ کس کے شوقِ گیسو نے کیا کافیؔ کو دیوانہ — کہ ہر دم وجد کے عالم میں زنجیریں تڑاتا ہے
چہ بینیم از آفتابِ روزِ محشر — بظلِ مہرِ تابانِ شفاعت
بہ حالِ کافیؔ مسکیں کرم کُن — کہ شایانی بسامانِ شفاعت

محمود۔ مرزا محمود شاہ۔ دہلوی

مرزا محمود شاہ ابن مرزا بابر بہادر مغفور بن اکبر شاہ بادشاہ اور بہادر شاہ ظفر کے داماد تھے اور حضرت ذوق کے شاگرد تھے۔ ان کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔ غدر میں ان کی یہ حالت تھی کہ عرصہ دراز سے گٹھیا کے مرض میں مبتلا تھے۔ بچارے گھر میں بے حس و حرکت پڑے رہتے تھے۔ گٹھیا کی وجہ سے ان کے ہاتھ پاؤں ایسے اکڑ گئے تھے کہ وہ گولا لاٹھی اور گول مٹول ہو گئے تھے، اس آفت زدہ کی شکایت بھی مرزا کالے نے بڑھا چڑھا کر حکام سے جا کی چنانچہ محمود شاہ کو بھی پھانسی دی گئی منشی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:[1]۔

"پھانسی پانے کے بعد مرزا محمود شاہ کی لاش گولا لاٹھی بنی لٹکتی رہی اور جو شخص ان کی لاش کو دیکھتا تھا اور ان کی بیماری کا خیال کرتا تھا تو رنج و افسوس سے بے اختیار رونے لگتا تھا!"

شعر پُر درد کہتے تھے، طرز ادا صاف و شستہ ہوتا تھا، ذوق کا رنگ قبول نہیں کیا۔ میر تقی میر کے رنگ کے شعر کہتے تھے۔ یہ دو شعر صاحب گلستان سخن نے لکھے ہیں ؎

غیر کو ساغر شراب بلا — اور ہمیں دیدۂ پُر آب بلا

ہاتھوں سے لے جنوں ترے جاؤں کہاں نکل
دامن بسا نہیں کہ گریباں نکل گیا

مشہور۔ مولوی بدر الاسلام بدایونی

بدایوں کی عباسی برادری میں ۱۸۵۷ء سے قبل کافی شاعر اور

---

[1] تاریخ سلطنت عروج انگلشیہ صفحہ ۷۰۰

عالم پیدا ہوئے. جنھوں نے اپنی برادری اور بدایوں کا نام چمکایا. ان شاعروں میں قابلِ ذکر نام یہ ہیں :-

(۱) مولوی افضل الدین قیس عباسی. جن کی تاریخ وفات مولانا سید دلدار علی صاحب مذاق بدایونی نے لکھی تھی. ؎

گئے جنّت کی جانب جب وہ مرحوم | تو دروازے کھلے جنّت کے پائے
مذاق اچھی کہی رضواں نے تاریخ | محمد افضل الدین قیس آئے

۱۲ء

تبرکاً ان کا ایک شعر بھی پڑھ لیجئے. ؎

گل و بلبل کے تکلف کو صبا کیا سمجھے :: ایک روتا ہے تو اک خندہ زباں رہتا ہے

(۲) مولوی نظام الدین ناطق عباسی خلف مولوی صمد الدین بدایونی شاگرد نواب الٰہی بخش خاں معروف دہلوی کے تھے. آپ کو علم جفر و رمل اور عملیات میں دستگاہ حاصل تھی. ایک مثنوی جس میں کام و ناکام کا قصّہ ہے، اور ایک افسانہ نثر خواب و خیال اور ایک دیوان آپ کی یادگار ہے. ؎

ناطق بڑے ہی بولنے والوں میں تم تو تھے
بتلاؤ اس کے سامنے کیوں دم بخود ہو گئے

(۳) مولوی محمد واصل المتخلص واصل عباسی بدایونی مولوی عبداللہ صاحب طالب کے شاگرد تھے. صاحب دیوان تھے. فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے. بعض غزلوں میں مشتاق تخلص بھی کرتے تھے.

آج کل مجھکو یوں کرتا ہے بدنام کہیں | مل کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں
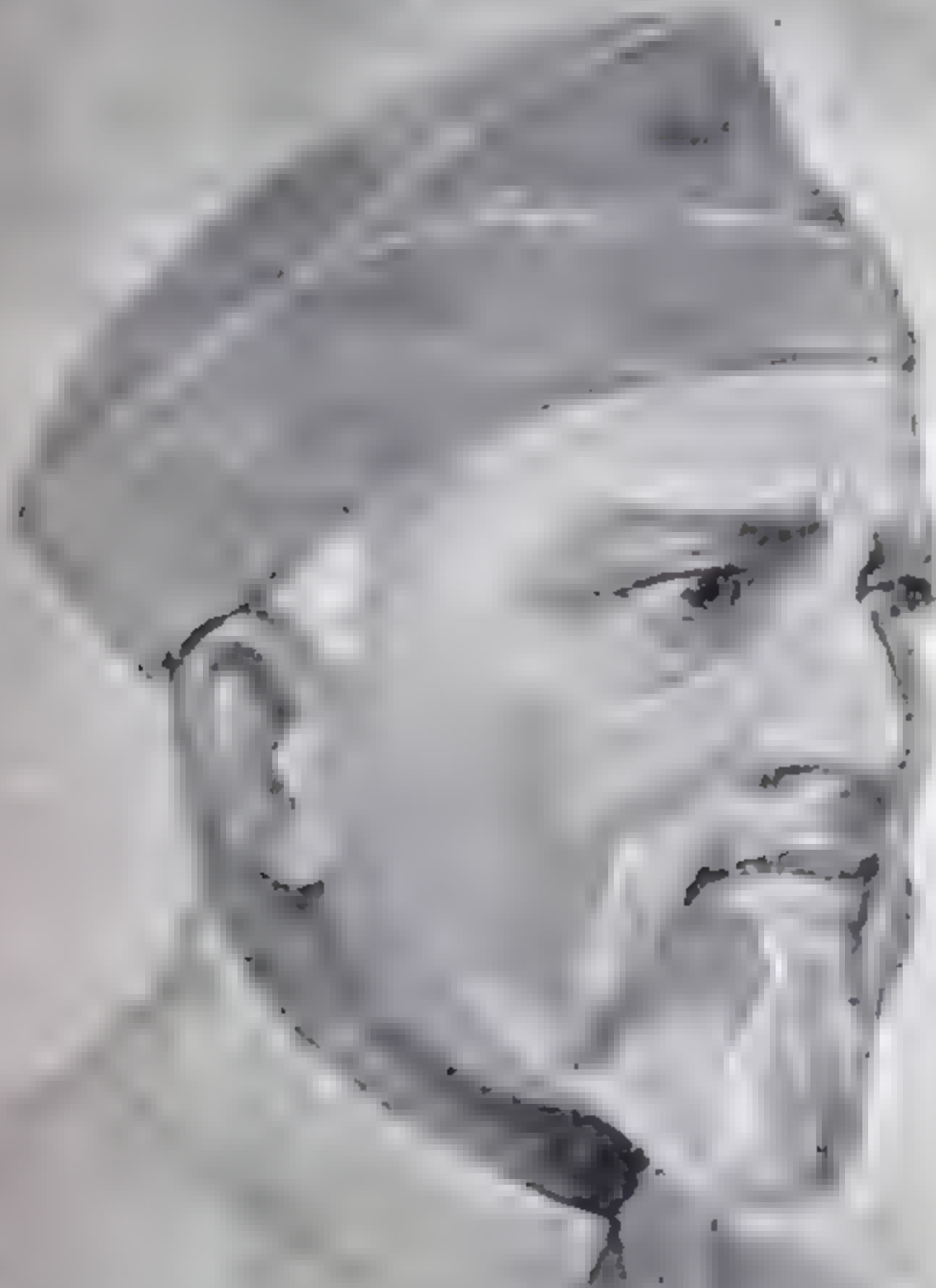
خان بہادر خاں

ابن عباسی شاعروں میں شہید فرنگ بدرالاسلام صاحب مشہور عباسی بدایونی بھی تھے۔ ان کے خاندان کے ایک اور ممتاز رکن قاضی عبدالسلام محدث و مفسر ابن عطاء الحق متوفی ۱۲۵۵ھ بھی ہوئے ہیں۔ جنھوں نے قرآن کریم کی تفسیر زاد الآخرہ منظوم کی جسکے تقریباً دو لاکھ شعر تھے ۱۲۴۲ھ میں لکھی تھی۔ آپ ریاست رام پور کے قاضی رہے۔ ان کے صاحبزادے قاضی شمس الاسلام متوفی ۱۳۱۷ھ بے حد مخیر تھے۔ اور یہ بھی رام پور کے قاضی تھے [۱]

بدرالاسلام صاحب عباسی نے غدر کے زمانہ میں ایک نظم کہی تھی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا۔ ع

سر کمپنی کا کٹ کے بکا پاؤ آنے میں

یہ جرم تھا جس پر سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ اکیس ۲۱ اشخاص کو جب گولیاں ماری گئیں اس وقت آپ بھی مولوی تفضل حسین تحصیلدار، مولوی اشرف علی نفیس بدایونی تحصیلدار، مولوی ماجد علی تحصیلدار، مولوی رضی اللہ تحصیلدار، منشی ذوالفقار الدین سررشتہ دار کے ساتھ گولی کا نشانہ بنے۔

مصروف۔ خان بہادر خاں بریلوی

خان بہادر خاں حافظ الملک حافظ رحمت خاں صاحب مرحوم کے پوتے اور نواب ذوالفقار خاں صاحب کے صاحب زادے تھے

حافظ الملک کا نسبی سلسلہ قیس عبدالرشید صاحب سے ملتا ہے۔ قیس اس خاندان کے وہ بزرگ ہیں جو اپنے آبائی مشرکانہ دین کو چھوڑ کر مسلمان ہوئے۔

---

[۱] شمیم سخن

یہ رسول خدا کے زمانے میں دیدارِ محمدی کے شوق و ذوق میں مدینہ منورہ میں افغانستان سے آئے۔ عبدالرشید کی شادی سارہ بنت خالد ابن ولید سے مدینہ منورہ میں ہوئی جس سے تین صاحبزادے سڑہ بن، غور غوشت اور بیٹن پیدا ہوئے۔ ان تینوں بزرگوں سے افغانی اپنا سلسلۂ نسب ملاتے ہیں۔

قیس عبدالرشید کے بڑے لڑکے سڑہ بن کا فرزند سر جنوں ہوا جس کا شرف الدین اسلامی نام رکھا گیا ان کے صاحبزادے بھڑیچ تھے، بھڑیچ کی اولاد میں حافظ الملک ہیں جن کا سلسلۂ نسب اس طرح ملتا ہے :-

"حافظ رحمت خاں ابن شاہ عالم خاں ابن محمود خاں، ابن شہاب الدین خاں ابن دولت خاں، ابن بدل خاں ابن داؤد خاں، ابن بھڑیچ خاں"

قیس عبدالرشید کی اولاد پٹھان اس لئے کہلاتی ہے کہ ان لوگوں کو سب سے پہلے سلطان محمود غزنوی نے "بتان" جہاز کا پشتی بان کا خطاب دیا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی جانبازی اور شجاعت کی وجہ سے اس فوج کی جان تھے۔ یہ لفظ "بتان" استعمال ہوتے ہوتے پٹھان بن گیا۔ اس طبقہ نے سلطان محمود غزنوی کے ساتھ آکر ہندوستان میں بہادری کے جوہر دکھائے اس لئے سلطان نے ان کو قندھار، پشاور اور کابل کے نواح میں رہنے کی اجازت دیدی۔ یہ لوگ زراعت و تجارت کرنے لگے۔ قبیلۂ بھڑیچ کا پرانا وطن قندھار کے حدود میں موضع شوراک اور پشین تھا۔ اس طبقہ کے اکثر لوگ یوسف زئی لوگوں کے رشتہ دار تھے۔ اسی بنا پر اپنے وطن سے تبدیل ہو کر یوسف زائیوں کے ملک وادی سوات و چلہ میں

سکونت پذیر ہو گئے۔ ان میں سے حافظ الملک کے جد امجد شہاب الدین المعروف بہ کوٹا بابا بھی ضلع اٹک اور لنگر کوٹ میں مقیم ہوئے۔[۱] یہ بزرگ اپنے وقت کے ولی صاحبِ کشف و کرامات تھے۔ ان کے تین بیٹے پائی خاں، محمود خاں، اور آدم خاں تھے۔ محمود خاں اپنے والد کی جگہ سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ اور شہامت پور میں مقیم ہو کے اسی جگہ وفات پائی۔ آزاد خاں، شہزاد خاں، حکیم خاں، حسن خاں اور شاہ عالم خاں یہ پانچ نرینہ اولاد محمود خاں کے ہو میں۔ شاہ عالم کو اپنے غلام داؤد خاں کی وجہ سے موضع مانکوئی ضلع بدایوں میں آنا پڑا۔ تو ان کے ہاں اس وقت ایک سعادت مند فرزند رحمت خاں پیدا ہوئے جنھوں نے کافی عرصہ تک روہیل کھنڈ میں اپنا سکہ جمایا۔ ان کے تیرہ صاحبزادے تھے۔ ساتویں صاحبزادے نواب خان بہادر خاں کے والد ماجد نواب ذوالفقار خاں صاحب تھے۔ اس خاندان میں تقریباً سب ہی اہلِ علم اور کافی شاعر گذرے ہیں۔ نواب محبت خاں ابن حافظ رحمت خاں کی عالمانہ شان بہت بلند تھی۔ علوم عربیہ میں جملہ علماءِ عصر میں افضلیت کا درجہ رکھتے تھے۔ فارسی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ عربی، فارسی، پشتو اور اُردو میں کلام کہتے تھے۔ جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں تلف ہو گیا۔ جناب شیفتہ ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔[۲]

"ریاستِ بریلی و متعلقات آں برایشاں مسلم بودہ و فور شہرت از تفصیل مستغنی کردہ وی نیز چوں پدر صاحب ورع و تقوی است۔"

آپ خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ نمونہ کلام سے

---

۱ حیاتِ حافظ رحمت خاں ص۶ ۲ گلشن بے خار ص۱۷۱

قید ہوتے ہی ہوا دونوں جہاں سے آزاد — میں تو بندہ ہوں محبت کی گرفتاری کا

عاشقوں میں مجھے لکھا تو نے — آج چہرہ مرا بحال ہوا

نے زر بیاں نہ زور نہ یار آشنا کا کام — رکھتے ہیں اپنے پاس صنم ہم خدا کا نام[۱]

نواب محبت خاں کے صاحبزادوں میں محمد منصور خاں مہر، محمد مقیم خاں مقیم، پوتوں میں محمد حسین خاں ضیا شہید فرنگ، احمد حسن خاں جوش، اور محمد سلیمان خاں اسد، پرپوتوں میں عابد علی خاں خورشید اور محمد علی خاں قمر اچھے نامی شاعر گزرے ہیں۔

نواب حافظ محمد یار خاں خلف حافظ رحمت کے صاحبزادے مؤلف گلِ رحمت نواب سعادت یار خاں جن کا تخلص صاحب تھا شاعر تھے۔[۲] ان کے ایک صاحبزادے نواب عبد العزیز خاں عزیز تھے۔ نواب محمد دیدار خاں خلف حافظ رحمت خاں کے صاحبزادے نواب ظفریاب خاں راسخ شہید فرنگ بھی مشہور شاعر تھے۔

خان بہادر خاں کے والد ماجد نواب ذوالفقار خاں صاحب مرحوم و مغفور انتہائی دین دار و متقی ہستی تھیں سختی کے ساتھ احکام شریعت کی پابندی کرتے تھے۔ عمر بھر کبھی نشے کی چیز کا استعمال نہیں کیا۔ عمر کا کافی حصہ یادِ الٰہی میں گذارا۔ اس کی مدحت میں منہمک و مصروف رہتے تھے۔ قرآن مجید کی کبھی تلاوت نہیں چھوڑی۔ پنجگانہ نماز باجماعت ادا کیا کرتے تھے۔ گرمی و جاڑے کی پرواہ کئے بغیر روزے رکھتے تھے۔ حضرت شاہ جمال اللہ صاحب سے طریقۂ قادریہ میں بیعت تھے۔

---

[۱] سخن شعرا ص ۴۷۸ [۲] خم خانہ جاوید پنجم ص ۲۰۵

نواب ذوالفقار خاں کی شادی قصبہ کریم ضلع شاہجہانپور میں کمال زئی خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ چند لڑکیاں اور دس لڑکے آپنے یادگار چھوڑے۔ چھیالیس سال کی عمر میں بدھ کے روز ۲۴ رمضان ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں فوت ہوئے۔ چند ماہ بعد آپکی نعش بریلی لکھنؤ سے لائی گئی اور حافظ الملک کے مقبرے میں دفن ہوئے۔[۱]

خان بہادر خاں نے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ ذی علم تھے۔ فارسی و عربی اور اُردو کے ماہر تھے۔ ان زبانوں پر پورا عبور حاصل تھا اور بہترین خوشنویس بھی تھے۔[۲] ایسٹ انڈیا کمپنی نے آپ کی قابلیت کو دیکھ کر صدر الصدور کے عہدہ پر مامور کیا تھا۔ ان کے بھائی نواب احمد یار خاں صاحب ریاست فرخ آباد میں نواب تجمل حسین خاں صاحب کے زمانے میں نیابت کے عہدے پر سرفراز تھے۔ نہایت فاضل صاحب علم و فن خوش نویس انشا پرداز جوان وجیہ صاحب حوصلہ تھے۔ اردو فارسی کی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ فارسی اور اُردو میں شعر کہہ لیتے تھے۔[۳] آپ کا فارسی کا مولود شریف طبع بھی ہو چکا ہے۔ ۱۸۶۶ء میں آپنے انتقال کیا۔ نمونہ کلام ؎

غیر سے چاہ جب تمہاری ہو ۔۔۔ دیکھئے شکل کیا ہماری ہو

کیا تم سے کہوں میں نے دیا دل اُسے کیسے ۔۔۔ الفت سے مروت سے محبت سے ز الیسے

ان کے پوتوں میں نواب حمید حسین خاں حمید صاحب صاحبِ دل اور اہل باطن حضرات میں تھے۔ اسی شان کی رسول خدا کی منقبت توصیف میں آپنے ایک دل گداز رباعی کہی ہے ؎

۱؎ حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۲۳۳۔ ۲؎ شمیم سخن صفحہ ۲۱۳۔ ۳؎ خمخانۂ جاوید دوم صفحہ ۳۲۹

محمد سر قدرت ہے کوئی رمز اسکی کیا جانے | شریعت میں تو بندہ ہی حقیقت میں خدا جانے
خدا نے مصطفائی کی محمد نے خدائی کی | کوئی سمجھے تو کیا سمجھے کوئی جانے تو کیا جانے

اسی طرح ایک حقیقت بھرا شعر حیدر صاحب نے خان بہادر خاں شہید فرنگ کے حسب حال بیان فرمایا ہے۔ اور ان کی جاں نثارانہ کیفیت کی تصویر کھینچی ہے۔ ؎

کس کو تھی میکدۂ کون میں آنے کی خوشی
مجھ کو اس نشہ میں دم دے کے قضا لائی ہے

رہیل کھنڈ میں سب سے بڑی چھاؤنی بریلی کی تھی۔ ۱۸۵۷ء کو اس میں آٹھویں غیر آئینی سواروں کی رجمنٹ اٹھارویں اور اڑتیسویں رجمنٹیں، اور ہندوستانی بیلری تھیں سب بالڈ صاحب اس کے بریگیڈیر تھے۔ بریلی میں کمشنر بھی رہتا تھا۔ سو سے زائد یورپین اور یوریشین اس چھاونی میں رہتے تھے۔ مارچ ۱۸۵۷ء کو بنگال میں جو بغاوت پیدا ہوئی تھی وہی بغاوت بریلی کے سپاہیوں میں اس وقت پیدا ہوئی جب اُن کو پرانی بندوقوں کے بجائے نئی بندوقیں دی گئیں۔ ان کا کہنا تھا ہم نے پرانی بندوقوں سے تمام کارنامے انجام دیئے اور سارے ہندوستان کو فتح کیا۔ اب نئی بندوقوں کی تقسیم میں کچھ نہ کچھ دال میں کالا ہے۔ جب ان بندوقوں کی سنگینوں کے قواعد سکھائے جانے لگے اور اٹھارویں ہندوستانی رجمنٹ کو نئے کارتوس دیئے گئے اور ان کے چھوڑنے کا طریقہ بتایا گیا تو اور بھی سپاہیوں کے دلوں میں طرح طرح کے خدشے پیدا ہونے لگے۔ ۲۹ رمئی

تک فضا صاف رہی مگر اس تاریخ کی صبح کو کرنل ٹروپ نے سنا کہ چند گھنٹوں کے بعد ۱۸ اور ۶۸ پیدل رجمنٹیں بغاوت کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ تب آٹھویں رجمنٹ کو انگریزی حکام نے مسلح ہونے کا حکم دیا اس کے سواروں نے نہایت وفادارانہ انداز میں حکم مانا جس کی وجہ سے اس وقت بغاوت نہیں ہوئی لیکن شام کو ٹروپ کو معلوم ہوا کہ آٹھویں غیر آئینی سواروں کی رجمنٹ میں غیر وفادار طبقہ موجود ہے۔ اس کے کپتان میکن زئی صاحب تھے۔ ان کو اس رجمنٹ پر بڑا اعتبار تھا اسکے خلاف کوئی بات سننا نہیں چاہتے تھے[1]

غالباً انہی دنوں میں جبکہ بریلی میں بغاوت کی تیاریاں ہو رہی تھیں انقلابی جذبات فوج میں پھیلائے جا رہے تھے۔ ایک فرمان دہلی کے فوجی افسران نے بریلی اور مراد آباد کی رجمنٹوں کے نام حسب ذیل روانہ کیا بقول کنہیا لال یہ راستے میں سنگھا پور میں پکڑ آگیا تھا جس کا مضمون یہ تھا[2]

"اگر تم ہماری مدد کو آتے ہو تو تم کو چاہیے کہ اگر کھانا وہاں کھاؤ تو ہاتھ یہاں آکر دھونا کیونکہ یہاں انگریزوں سے لڑائی شروع ہو گئی ہے۔ اور ہر چند بفضل الٰہی یہاں فوج بہت جمع ہے مگر تاہم درصورتیکہ ہم کو ایک بھی شکست ہوئی تو انگریزوں کی دس شکست کے برابر ہوگی۔ اب تمہارا آنا ضرور ہے کہ شاہنشاہ فیض رسان شاہ دلی انعامات و علاقجات جلیل خیر خواہوں کو بخشیں گے ہم تمہارے انتظار میں ہمہ تن چشم بن گئے ہیں" ع۔

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند صفحہ ۸۳۱ [2] محاربۂ عظیم صفحہ ۲۹۲

چوں گوشِ روزہ دار بر اللہ اکبر ست

ہو رہے ہیں ہمارے گوش مشتاق تمہاری اقاپ کی آواز
کے ہیں اور ہماری آنکھیں مثال قاصد تمہاری راہ پر لگی
ہوئی ہیں. اب یہی تم کو لازم ہے کہ اس مطلب کو بہت
ضروری تصور کر کے چلے آؤ اور ہمارے گھر کو اپنا دولتخانہ تصور کرو۔"

اسی فرمان کا غالباً میاں محمد شفیع صاحب نے اپنی تالیف ۱۸۵۷ء میں ذکر
کیا ہے. لیکن مذکورہ فرمان اور میاں صاحب کے فرمان کی عبارت
میں کافی فرق ہے. گرچہ فرمان تو وہی معلوم ہوتا ہے. کاش میاں صاحب
اس کتاب کا بھی حوالہ دے دیتے جہاں سے انہوں نے اس فرمان کو نقل
کیا ہے. تاکہ موازنہ اور فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جاتی. میاں صاحب کے
نقل کردہ فرمان کی عبارت یہ ہے :-

"بھائیو. یہاں انگریزوں سے لڑائی شروع ہو گئی ہے جو مضبوط
فوج لے کر آگئے ہیں اور جو شکست خدا کی مہربانی سے اس وقت
انہوں نے ہمارے ہاتھ سے کھائی ہے وہ دس شکستوں کے
برابر ہے. ملک کے بڑے بڑے ہیرو دہلی پہنچ رہے ہیں.
ایسے نازک وقت میں اگر تم کھانا وہاں کھاؤ تو ہاتھ یہاں
آکر دھوؤ. ہمارا شہنشاہ تمہاری خدمت گزار ہوں، اور
تمہاری آمد کے پچاس گنے صلے دے کر تمہیں خوش آمدید
کہے گا. ہمارے کان تمہاری توپوں کی آواز سننے کے لئے

بے چین ہیں اور ہماری آنکھیں تمہیں دیکھنے کے لیے مشتاق ہیں
آؤ فوراً آؤ کیونکہ جدا ہوا گلاب کے پھول کا حال بجز بہار کے خراب ہے
اور ایک بچہ بغیر دودھ کے کہاں پنپ سکتا ہے۔“ (۳۰۵)

بریلی کے سپاہی جنگ آزادی کی تیاری میں مصروف تھے ان کا پروگرام تھا کہ ۳۱ مئی یکشنبہ اتوار کو دن کے گیارہ بجے ہر کمپنی اپنے افسروں کو قتل کر دے۔ اسی اثنا میں ۳۰ مئی کو بعد نماز مغرب ۴۵ رجمنٹ خیرپور والی کے بھاگے ہوئے فوجی بریلی آئے اور فوج کو مشورہ دیا کہ اپنے پروگرام میں تاخیر کرنا خلاف مصلحت ہے فوراً انگریزی افسروں کو تلوار کے نیچے رکھ لو۔ کیونکہ گورہ فوج بہت قریب آچکی ہے جس جگہ جاتی ہے ہندوستانیوں کا قتل عام کرتی ہے۔ تمام رات سپاہیوں کی مشورہ میں گزری۔ یہاں تک کوئی سپاہی لین میں نہیں آیا۔[1]

۳۱ مئی کی صبح نہ ہونے پائی تھی کہ کپتان براون کا بنگلہ جلا دیا گیا تھا۔ خزانہ پر جو ہندوستانی سپاہی پہرہ دے رہا تھا اس نے ایک ہندوستانی افسر سے جو انگریزوں کی طرف سے قلعہ کے لئے چٹھی لے جا رہا تھا اس سے وہ چٹھی چھین لی اور پھر ڈگرا [illegible] کے منہ پر دے ماری۔[2] گیارہ بجتے ہی ۶۸ رجمنٹ آٹھویں بنٹ [illegible] اٹھارہویں رجمنٹ کے سپاہی معہ محمد بخش خان بخت خاں صوبیدار توپ خانہ توپوں کے پاس دوڑتے ہوئے گئے لین کے پاس انگریزوں کے گھروں پر گراپ ماری۔ سپاہیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بندوقیں لے کر بنگلوں میں گھس گئیں۔ بقایا سپاہی بنگلوں کو

---

[1] محاربہ عظیم ص ۲۸۰ [2] تاریخ بغاوت جلد اول ص ۲۱

جلانے اور انگریزوں کو قتل کرنے پر تل گئے۔ بریگیڈیر ترسب بالڈ لین جارہے
تھے ان کے سینہ پر سپاہیوں نے گولی ماری وہ وہیں مر گئے۔[1] اور افسران بھی
قتل ہوئے جو افسر اپنی فوج کو تنبیہ کرنے کے لئے جاتا وہی قتل ہوتا چنانچہ
جنرل سپالڈ کو ایک ہندستانی سوار نے جو ان کی اردلی میں تھا شترخانے
کے متصل بندوق سے ختم کیا اور انساٹن مکر کو تلنگوں نے سکوت میں مار ڈالا۔
میگزین اور خزانہ شاہی بھی اپنے قبضہ میں کر لیا۔ کوٹھیوں اور بنگلوں کا اسباب
اور مال لوٹ کر آگ لگا دی۔ یہ بغاوت اتنی ہوشیاری اور عجلت کے ساتھ
ہوئی کہ انگریزوں کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوئی۔[2]

محمد شفیع آٹھویں سوار رسالہ کا سب سے بڑا افسر تھا وہ اس بغاوت میں
پیش پیش تھا وہی سواروں کو چھاؤنی کی طرف لے گیا۔ ۱۸ رجمنٹ کے
میگزین کے پاس جہاں سپاہی جمع ہو گئے تھے ایک توپ رکھی تھی اور
وہیں محمدی جھنڈا کھڑا ہوا تھا وہاں سے آواز آئی کہ سارے سواروں کو
چاہیئے کہ وہ محمدی جھنڈے کے نیچے جمع ہوں اور مذہب کی حمایت کریں
ورنہ مسلمانوں کو سور کا گوشت اور ہندوؤں کو گائے کا گوشت زبردستی
انگریز کھلائیں گے۔ ان آوازوں کے سننے کے بعد اور سبز جھنڈے
دکھائی دینے سے جو کچھ باقی سپاہی تھے وہ انگریزوں کے خلاف ہو گئے۔[3]
جب انگریزی افسران نے یہ خطرناک و مہلک نقشہ فوجوں کا دیکھا
تو نینی تال چلے گئے۔

---

[1] [illegible] ص ۲۸۸ [2] محاربہ عظیم ص ۲۸۵ [3] تاریخ بغاوت جلد اول ص ۲۳

بغاوت سے ایک روز قبل رابرٹ الگزینڈر کمشنر بریلی نے حافظ رحمت خاں
کے پوتے نواب خان بہادر خاں سے کہا تھا [۱]

"امروز فردا میں یہاں بلوہ ہونے والا ہے۔ یہ ملک آپ لوگوں کا
موروثی ہے۔ آپ اس کا بندوبست کیجئے"

نواب خان بہادر خاں نے جو اس وقت بریلی کے صدر الصدور تھے
کمشنر کا آلۂ کار بننا گوارا نہیں کیا اور انکار کر دیا۔ جب بریلی کے کمشنر بریلی کے حکام
فوج اور ملٹری میں سے تقریباً تیس آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے کر گھوڑوں پر
نینی تال چل دیئے تو صوبیدار توپ خانہ جنرل بخت خاں نے تمام فوجیوں
کی کمان ہاتھ میں لی۔ اپنا جھنڈا "سبز" قرار دیا۔ اور تمام عمائد شہر اور فوج
افسران کو جمع کر کے نواب خان بہادر خاں کو بریلی بلکہ کل روہیل کھنڈ
نواب منتخب کیا۔ مسند نشینی کی رسم پرانی کوتوالی کے سامنے بڑے تزک
احتشام کے ساتھ ادا کی گئی۔ اس میں شرکت کے واسطے خان بہادر خا
اپنی قیام گاہ واقع محلہ بھوڑا اور اب کھیڑا خان بہادر خاں کہلاتا ہے ۔
موجودہ نینی تال روڈ ہوتے ہوئے چوراہا کتب خانہ کے پاس تشریف لا۔
اور ایک جنگی کونسل قائم کی۔ سوبھا رام دیوان ریاست مقرر ہوئے۔ نیاز محمد خا
جنرل بنائے گئے۔ مدار علی خاں سپہ سالار مقرر کئے گئے۔ مولوی خاں افسر کر
بنائے گئے۔ منشی فرحت اللہ بخشی فوج اور شہر کوتوال اکبر علی خاں مامور ہوئے
شاہجہاں پور کی نظامت نظام علی خاں کو اور بدایوں کی نظامت عبدالرحمٰن

---

[۱] تاریخ سلیمانی

تفویض ہوئی۔ مراد آباد میں نواب مجو خاں، نواب محمود خاں بجنور، نواب کلن خاں آنولہ میں نظامت کے فرائض انجام دینے لگے۔

اسی روز رابرٹسن صاحب جج اور ڈاکٹر بنس برو صاحب اور آر صاحب ڈپٹی کمشنر مولوی حامد حسن منصف کے مکان میں چھپ گئے۔ نواب خاں بہادر خاںؒ کے لوگوں کو معلوم ہوا تو مکان پر پہنچے ان کو تہ تیغ کر کے لاشیں ان کی کوتوالی میں ڈال دیں۔ مسٹر اسپل کوتوالی کے سامنے قتل ہوئے۔ جیسی نگریز جہاں ملا مار ڈالا!! جس وقت مجاہدین نے جیل خانے کو توڑنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر ہنس برو نے توڑنے سے باز رکھا۔ لیکن مجاہدین باز نہ آئے۔ انہوں نے جس قدر چھپر وہاں پر تھے ان کو دروازے کے قریب کر کے چنگاری لگا دی۔ جب دروازہ جلنے لگا اور ڈاکٹر کو معلوم ہو گیا کہ جیل خانے کے سارے سپاہی بھی باغیوں کے طرفدار ہیں تو بالائی دروازے سے اتر کر جیل خانے کے اندر جا چھپے۔ دوسرے روز جب جیل خانہ توڑنے لگے تو ڈاکٹر صاحب کو بھی پکڑ لائے اور کوتوالی کے سامنے ان کو قتل کیا۔[1] اور شہری لوگوں نے روبرٹسن صاحب جج ایک صاحب سشن جج، ڈاکٹر ہی صاحب جو صوبے کے لفٹننٹ گورنر کا داماد تھا اور آر صاحب ڈپٹی کلکٹر اور بچ صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج کو قتل کیا۔ انسائن ٹکر اور کوارٹر ماسٹر سرجنٹ ہنری صاحب متعلقہ ۱۸ رجمنٹ کو اسی رجمنٹ کے سپاہ نے مارا۔ اسپل صاحب، لارنس صاحب، ڈیوس صاحب، فیلن صاحب، بیل صاحب، اور رابلوں کو مسلمانان شہر جدید

---

[1] اخبار الصنادید صفحہ ۳۷

قدیم نے واصل جہنم کیا۔ اور ایک ہزار روپیہ کمشنر کی گرفتاری کے انعام کے لئے مقرر کیا گیا۔[۱] بریلی پر مجاہدوں کا قبضہ ہو گیا۔

خان بہادر خاں نے بہادر شاہ ظفر کو روہیل کھنڈ کی آزادی کی خوش خبری بھیجی کہ چھ گھنٹے کے اندر بدایوں، شاہجہاں پور، بریلی اور مراد آباد وغیرہ سے انگریزوں کو نکال دیا گیا ہے اور آزادی کا جھنڈا نصب کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک جہاد نامہ روہیلکھنڈ کے اضلاع میں تقسیم کرایا۔[۲] اور بہادر شاہ ظفر کے پاس اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا جس کا مضمون صاحب ۱۸۵۷ء نے صفحہ ۳۰ پر نقل کیا ہے۔ حوالہ اس میں بھی نہیں تحریر کیا ہے۔

"ہندو مسلمان بھائیو! تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اگر تم نے انگریزوں کو رہنے دیا تو وہ تم سب کو ذبح کر کے تمہارے دین و مذہب کو تباہ کر دینگے۔ ہندوستان والوں کو اتنے عرصے سے انگریزوں نے فر[illegible] دے رکھا ہے۔ اور انہیں کی تلوار سے ان کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ اب [illegible] غداری چھوڑ کر ملک کو بچانا چاہیے۔ انگریز پھر تفرقہ ڈالنے کا پرانا حربہ استعمال کریں گے وہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکائیں گے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسائیں گے۔ ہندو بھائیوں کو چاہیے کہ وہ اب ان کے ہاتھ میں نہ پڑیں۔ اور امید ہے ہندو بھائیوں سے کہ ان کی چال میں نہ پھنسیں گے ہوشیار و سمجھدار ہندو بھائیوں سے یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ انگریز اپنے وعدے کو ہرگز پورا نہیں کرتے۔ وہ مکاری غداری کے بہت عادی ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے مذہب کے سوا تمام مذاہب کو دُنیا سے مٹا دینا چاہتے ہیں

---

[۱] مواد عظیم [۲] کنز التاریخ صفحہ ۳۰۱

یا انہوں نے متبنیٰ کے تمام حقوق کو تباہ نہیں کر دیا۔ کیا وہ ہمارے بادشاہ
کے تمام صوبے اور ریاستیں نہیں نگل گئے۔ ناگپور کی حکومت کو آخر کون کھا گیا
لکھنؤ کی حکومت کس نے لی۔ آخر وہ کون ہے جس نے ہندو مسلمانوں کی جڑیں
ہلا دیں۔ مسلمانو! اگر تم قرآن کو مانتے ہو اور ہندو! اگر تم گئو ماتا کی رکشا کرتے
ہو تو تم اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بھول جاؤ اور متحد ہو کر اس جنگ
میں کود پڑو۔ میدان جنگ میں ایک جھنڈے کے نیچے لڑو اور خون کے
چشمے بہا کر ہندستان کو انگریزوں کے نام و نشان سے پاک کر دو۔
اگر اس مقدس جنگ میں ملک بچانے کے لئے ہندو بھائی خلوص کے
ساتھ مسلمانوں کے شریک ہو جائیں تو انعام کے طور پر وطن پرستی کے
صلے میں مسلمان گائے کاٹنا بند کر دیں گے۔ اس مقدس جنگ میں جو خود
لڑے گا یا دوسروں کو مدد دے گا اس کو دینی و دنیاوی آزادی اور نجات
ملے گی لیکن جو شخص اس وطن کی لڑائی کی مخالفت کرے گا وہ اپنے ہی
سر پر تلوار مارے گا اور خودکشی کا مرتکب ہوگا۔"

منشی ذکاء اللہ نے بھی اس جہاد نامہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔[1]

"خان بہادر خاں نے شیخی بھرا اشتہار دے دیا کہ انگریز بڑے
بڑے دغاباز اور ہندو مسلمانوں کے مذہب غارت کرنے والے اور
جاگیروں کو ضبط کرنے والے ہیں۔"

اس کے بعد نواب خان بہادر خاں نے فوج کی گنتی کی۔ تقریباً
چالیس ہزار باقاعدہ اور بے قاعدہ فوجیں اور دس توپیں جمع ہو گئیں۔ اس

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند صفحہ ۹۳۱

فوج پر بریلی گزیٹیر کے مطابق تقریباً دو لاکھ پینسٹھ ہزار روپیہ ماہانہ خرچ کیا جاتا تھا۔ توپیں ڈھلوانے کا کام بھی شروع کیا۔ اور جا بجا تھانے اور تحصیلیں مقرر کیں۔ فرید پور والے اور نواب گنج کے ٹھاکر روٹھے ہوئے تھے ان کو اپنایا۔ ایک علٰحدہ راجپوت رجمنٹ قائم کی۔ بند جیلی کے مشہور ٹھاکر رگھوناتھ سنگھ کو راجہ کا خطاب دیا اور فرید پور پرگنہ کا انچارج بنایا۔ جو بعد میں انگریزوں سے مل گیا تھا۔

ناناراؤ پیشوا نے بٹھور سے اپنے بھائی ملہار راؤ کو نواب سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے بھیجا۔ جنرل بخت خاں کے ہمراہ نواب خان بہادر خاں نے ملہار راؤ کو اپنا سفیر بنا کر دہلی بہادر شاہ ظفر کے پاس روانہ کیا۔ انکے ساتھ ایک ہاتھی ایک کوتل گھوڑا جس پر چاندی کا ساز و سامان تھا اور ایک سو طلائی اشرفیاں بھیجیں۔ بادشاہ کے سامنے جب جنرل بخت خاں نے پیش کئے اور بریلی کے حالات سنائے تو بادشاہ بہت مسرور ہوئے اور نواب خان بہادر خاں کو روہیل کھنڈ کا گورنر مقرر کیا۔[1] اور خلعت سرفرازی و خطاب "نواب انتظام الدولہ محافظ الملک، تنویر جنگ رئیس اعظم روہیل کھنڈ" عطا کیا۔ نواب خان بہادر خاں نے اپنی مہر پر "الحکم للّٰہ والملک اللّٰہ" اور دوسری مہر پر یہ سجع کندہ کرایا تھا۔

"شدیم خان بہادر بہ ذوالفقار علی"

نواب یوسف علی خاں والی رام پور حکومت برطانیہ کے حامی تھے جب انہوں نے بریلی پر نواب خان بہادر خاں کی حکومت کا حال سنا اور

---

[1] مقدمہ بہادر شاہ ظفر

یہ خبر بھی پہنچی کہ مراد آباد کی ۲۹ نمبر پلٹن نے بغاوت کر کے خزانہ لوٹ لیا ہے اور جیل توڑ کر قیدیوں کو رہا کر دیا ہے تو نواب یوسف علی خاں کو سخت تشویش ہوئی۔ اس کے بعد جب یہ اطلاع ملی کہ مراد آباد کا افسر مجو خاں بنایا گیا ہے۔ اور اسد علی خاں عباس علی خاں کا باپ ہندی توپ خانہ کا افسر مقرر ہوا ہے تو وہ اور بھی چراغ پا ہوئے۔ انہوں نے بریلی حکومت کو ختم کرانے کے لئے کمشنر بریلی کو لکھا کہ اگر میں اپنی حکومت مراد آباد میں قائم کر لیتا ہوں تو ہندوستانی سطمئن ہو جائیں گے کہ یہ تو اپنے بھائی کی حکومت ہے اور زیادہ باغی فساد برپا نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ اسی نظریہ کے ماتحت ۴ر جون، ۱۸۵۷ء کو نواب رام پور نے صاحبزادہ عبد علی خاں عرف منجھلے میاں کو مراد آباد روانہ کیا اور وہاں پر فوجی قوت اور چالاکی کے ساتھ قبضہ کر لیا۔ اور مجو خاں کے پاس جو انگریز قید تھے ان کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور ان کی خوراک مقرر کی۔ اور ۷ر جون کو خود نواب یوسف علی خاں رام پور سے مراد آباد پہنچے باغی فوجوں پر اپنا اثر قائم کرنے کے لئے دو ہزار روپے تقسیم کئے۔ اور باغیوں کو فریب میں رکھنے اور مجو خاں کو خوش کرنے کیلئے مجو خاں کو ضلع کا ناظم مقرر کیا۔[1]

بریلی کی فوجیں دہلی کو جانے کے لئے تیار بیٹھی تھیں صرف شاہجہانپور کی فوج کا انتظار تھا کہ نواب خان بہادر خاں کو نواب رام پور کے مراد آباد پر قبضہ کرنے کا حال معلوم ہوا۔ ان کو تشویش ہوئی کہ مراد آباد کی طرح بریلی بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اس کے دفعیہ کے لئے یہ تدبیر نکالی کہ بریلی کی فوج کو نواب رام پور کی پُر فریب چالوں سے آگاہ کر کے اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ

---

[1] اخبار الصنادید دوم ص۴۰

وہ ریاست رام پور پر حملہ کرے۔ چنانچہ یہ بات بھی ان کے ذہن نشین کرادی گئی کہ نواب یوسف علی خاں انگریزوں کے طرفدار ہیں۔ اور رات دن اسی فکر میں رہتے ہیں کہ تم کو دہلی جانے سے روکیں۔ اگر نواب رام پور کا ہاتھ درمیان میں نہ ہو تو انگریزوں کا ان مقامات پر نام ونشان باقی نہ رہے۔ لیکن نواب صاحب برابر روپیہ اور سامان سے انگریزوں کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ اس کانٹے کو راہ سے دور کرو۔ اور پھر تمام روہیل کھنڈ پر تمہاری حکومت ہوگی تم آزادی کے ساتھ شاہ دہلی کی حمایت کر سکتے ہو۔ اس وقت موقع بھی اچھا ہے کیونکہ ریاست میں نہ تمہارے مقابلے کی فوج ہے اور نہ سامان جنگ، زر نقد اور سامان جنگ اپنے قبضہ میں کرلو اور تاجدار بیگم بنت نواب سید احمد علی خاں کو جو مستحق ریاست ہیں وہاں کا حکمراں بناؤ۔ اس سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ نینی تال کے انگریزوں کا قلع قمع ہو جائے گا۔"[۱]

اس سکیم سے تمام فوجی متفق ہو گئے۔ نواب رام پور کو بھی اس سکیم کا علم ہو گیا۔ انہوں نے طاقت جمع کرنی شروع کردی۔ مراد آباد کی فوج بھی بلوالی اور رام پور کی حفاظت کی فکر پڑ گئی نتیجہ یہ ہوا کہ محمد خاں پھر مراد آباد کے حاکم بن گئے۔

۹ جون کو بریلی کی فوجیں رام پور کے باہر گنیش گھاٹ پر ٹھہریں اور انہوں نے نواب رام پور سے مطالبہ کیا کہ وہ اگر حکومت برطانیہ کے حامی نہیں ہیں اور بذات خود ہمارے ساتھ نہیں جاسکتے تو اپنی فوج سے ہم کو مدد دیں تاکہ ہم نینی تال کے انگریزوں کا قلع قمع کریں اور ولیعہد نواب سید کلب علی خاں کو بھی ہمارے ساتھ ملازمت شاہ دہلی کے لئے روانہ کریں۔

---

[۱] اخبار الصناد ید دوم صفحہ ۱۷۲

یہ گفتگو مولوی سرفراز علی پیشوائے مجاہدین کی معرفت ہوئی. نواب صاحب
ٹال مٹول اور حیل وحجت کرتے رہے. مجاہدین ان کی تاویلوں سے متاثر نہیں
ہوتے تھے. بالآخر مولوی سرفراز علی کو چھ سات ہزار روپے دے دیئے گئے.
اور وفاداری کا یقین دلایا تو یہ فوج مراد آباد کی طرف چلی گئی.

یہ حقیقت ہے کہ نواب رامپور کی نمک حرامیوں کی وجہ سے حکومت برطانیہ
کی بقا اور زندگی روہیلکھنڈ میں ہوئی. یہی بات نواب خان بہادر خاں کو
کھٹکتی تھی. چنانچہ جب بریلی کی فوجوں کو نواب رام پور نے چکر دیا تو نواب بہادر خاں
نے نواب ولی داد خاں مالاگڑھ والے سے خط وکتابت کی. کہ "اگر دہلی کی باغی فوج
اور لکھنؤ کی تھوڑی فوج سے تم ہم شریک ہو کر رام پور پر قبضہ کر لیں تو اس وقت
خزانہ اور سامان بھی پورا ہے. فوج غازی کے واسطے ایک عمدہ تحفہ بھی ہاتھ آئیگا
جس کی بڑی ضرورت ہے" لیکن دہلی کی فوج کی حالت اچھی نہیں تھی اور لکھنؤ
کی فوج اودھ میں اس وقت تقسیم ہو گئی تھی اس لئے یہ منصوبہ بھی کامیاب نہیں ہوا.

مراد آباد سے ہوتی ہوئی بریلی کی فوج یکم جولائی ۱۸۵۷ء سے قبل دہلی پہنچ گئی
تھی جس کی اطلاع مرزا مغل نے بادشاہ کو پہنچائی تھی.

بریلی کی فوج کی دھاک دہلی میں اچھی بیٹھ گئی تھی. اس کی ہر محاذ پر ضرورت
محسوس کی جاتی تھی. چنانچہ ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کے مرزا مغل کے خط میں جو
بہادر شاہ ظفر کو لکھا گیا ہے. اس میں اسی بات کی خواہش کی گئی ہے [1]

"گذارش فدوی یہ ہے کہ حضور کے اقبال سے رات دن جانبازانہ
حملے کئے جا رہے ہیں. اگر علی پور کی طرف سے کچھ کمک مل گئی، تو

---

[1] غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط صفحہ ۱۰۳

حضور کے طالع بختیاری سے بحکم خدا آخری فتح نصیب ہو گی۔
پس عرض ہے کہ بریلی کے جنرل کے نام حکم جاری کیا جائے کہ وہ
اپنی فوج لے کر علاپور کی طرف بڑھیں۔ اور اس رُخ سے کفار پر
حملہ آور ہوں۔ جب کہ غلام اپنی فوج کے ہمراہ اس طرف سے مدد
کرے گا۔ تاکہ دونوں طرف سے دباؤ ڈال کر کفار ملاعین کو جہنم
واصل کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں یہ بھی امید ہے کہ اگر فوج علاپور کو
جائے گی تو غنیم کا سلسلۂ رسد رسانی بھی منقطع ہو جائے گا۔"

نواب خان بہادر خاں کو حکومت کرنے کا زیادہ وقت نہیں ملا۔ تھوڑے
سے عرصے میں ایک دو عمارتیں بنوا سکے۔ اور جتنے عرصے ان کی حکومت رہی
شہر کا معقول انتظام رہا۔

نواب خان بہادر خاں فی الواقع روہیلکھنڈ کے حکمران تھے۔ ان کا انتظام
فقط بریلی میں نہیں بلکہ بدایوں، شاہجہاں پور، مراد آباد، فرخ آباد میں قائم
تھا۔ دہلی کو اگر کسی فوجی نے معقول امداد دی تو وہ خان بہادر خاں تھے۔ وہ
حقیقتاً اپنی حکومت کے قیام کے اس قدر خواہاں نہیں تھے جس قدر وہ دہلی
حکومت کے قائم رہنے کے متمنی تھے۔

جب دہلی، لکھنؤ وغیرہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو خان بہادر خاں کو بھی
یقین ہو گیا کہ بریلی بھی انگریزوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے
مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کو لکھنؤ لکھا کہ آپ بریلی آ جائیے۔ پچاس ہزار روہیلے
آپ کے جھنڈے کے نیچے رہیں گے۔ انگریزی فوج سے مقابلہ کر لیا جائے گا۔

شاہزادہ فیروز شاہ بھی اسی اثناء میں بریلی آئے۔ خان بہادر خاں نے ان کا بڑا احترام کیا اور ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور خود استقبال کے لئے آئے۔ اور شہزادہ کو ہاتھی پر سوار کرا کے جلوس نکالا، نانا راؤ پیشوا اور نواب تفضل حسین خاں فرخ آبادی بھی پہنچ گئے تھے۔

سر کولن شاہجہاں پور میں پانچ سو سپاہی متعین کر کے اور کپتان ہیل کو کمان آفیسر لگا کر بریلی روانہ ہوا۔ خان بہادر خاں کی فوج کی تعداد انگریزوں کے جاسوسوں کے مطابق تیس ہزار پیادے اور چھ ہزار سوار تھے اور چالیس توپیں تھیں۔ مگر منشی ذکاء اللہ اس تعداد کو تسلیم نہیں کرتے۔[1]

۵ مئی کی صبح کو سر کولن کے لشکر نے جنبش کی اور جہاں تپشا میل لگا ہوا تھا وہاں قیام کیا۔ کل فوج اس کی سات ہزار چھ سو پینتیس تھی اور انیس میدانی توپیں تھیں۔ اس لشکر کے دو حصے کئے۔ ایک حصہ کو محاصرہ اور توپخانہ کی حفاظت کے لئے لگایا اور دوسرے کے قریب لائے۔

نانا راؤ پیشوا اور نواب تفضل حسین دو تین روز پہلے شاہجہانپور چلے گئے تھے۔ خان بہادر خاں اور شاہزادہ فیروز شاہ کی قیادت اور کمانڈ میں بریلی کی فوج نے دشمنوں پر توپیں چھوڑنی شروع کیں۔ بڑا گھمسان کا رن پڑا۔ فیروز شاہ نے بہادری کے وہ کارنامے دکھائے کہ دشمن بھی ان کی بہادری کو مان گیا۔ جس سمت گھوڑوں کی باڑ موڑ دیتے تھے صفیں کی صفیں کاٹ کر رکھ دیتے تھے مجاہدین کی فوج شہزادے کے قدم بقدم رہتی تھی۔ لیکن ایسے بھی موقع آئے جب شہزادہ سب کی نظروں سے گرد و غبار کی وجہ سے اوجھل ہو جاتے تھے۔

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند

لیکن جب گرد و غبار چھٹ جاتا تو فیروز شاہ گھوڑے کو شاباشی دیتے تھے۔ اسکی وجہ سے مجاہدین کی ہمتیں بڑھ جاتی تھیں اور جس وقت مجاہدین اللہ اکبر اور یا علی کے فلک شگاف نعرے لگاتے تھے تو دشمنوں کے دل دہل جاتے تھے۔ اسی اثناء میں خان بہادر خاں کا ہاتھی بگڑ گیا اور بھاگ کھڑا ہوا جسکی وجہ سے مجاہدین کی فوج میں انتشار پھیل گیا۔ لوگوں نے جانا کہ خان بہادر خاں شہید ہو گئے۔ لیکن فیروز شاہ نے ہمت نہیں ہاری تھی اور نہ ہی ابھی تک گھوڑے کی باگ موڑی تھی اور تن تنہا معمولی فوج کے ساتھ میدان کارزار میں تلوار کے جوہر دکھا رہے تھے[52] کہ اتنے میں دونوں بازوؤں پر انگریزی سوار، اور اسکی توپ خانہ نمودار ہوئے اور ان کی توپوں نے جواب دیا۔ کافی دیر تک دونوں طرف سے توپیں چلتی رہیں۔ نواب صاحب کی فوج کو شکست ہوئی۔ لڑائی چھ گھنٹے جاری رہی۔ لو چل رہی تھی۔ اس لئے سر کولن نے اپنی فوج کو آرام کرنے کا موقع دیا۔ اس لڑائی میں ولی داد خاں، اسمٰعیل خاں، بنے علی خاں، اور شاہزادہ فیروز شاہ نے بڑی بہادری اور دلیری کا ثبوت دیا۔

سر کولن نے ندی کے کنارے پر میسرہ کا خیمہ لگایا اور میمنہ نے ندی کے پار عبور کیا۔ اور پون میل تک شہر کی طرف آہستہ آہستہ چلی اور سکھوں کی ایک رجمنٹ[53] نے سڑک کی بائیں طرف ایک غیر آئینی سواروں کے لینوں پر قبضہ کیا۔ دفعتاً ایک سو تیس مجاہدوں کا ایک دستہ سامنے آیا جو بلا مبالغہ سر سے کفن باندھ کر نکلا تھا۔ ان مجاہدوں کی تصویر شجاعت ایک انگریز نے جو گھٹا گمرا پلٹن نمبر ۹۲ میں سارجنٹ میجر تھا اپنی کتاب "۱۸۵۷ء کے معرکوں کی یادداشت" میں،

---

[52] مضمون سید انیس شاہ ماہنامہ العلم کراچی جولائی تا دسمبر ۱۹۵۸ء؛ [53] تاریخ بغاوت ہند جلد دوم ص ۹۸

ان الفاظ میں کھینچی ہے :۔ "ان کے ہاتھ میں تلوار تھی اور پشت پر ڈھال اور دین کا نعرہ لگا کر ہمارے سامنے آئے اور حملہ کرنے سے پہلے ان کا سردار جو ایک بیس سال کا بے ریش و بروت نوجوان تھا جس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا، صف سے آگے بڑھ کر ہم سے یوں مخاطب ہوا" کیا تم میں کوئی حوصلہ مند ہے جو میرا مقابلہ کر سکے اگر ہے تو سامنے آئے"۔ اس کی آواز سے ہماری صفوں پر سناٹا چھا گیا، کوئی فوجی آگے نہیں بڑھا۔ ایک منٹ کے انتظار کے بعد اس نے پھر چیلنج دیا۔ اور کہا میں پانچ آدمیوں سے تنہا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ لیکن پھر بھی کسی نے حرکت نہیں کی آخر جھنجلا کر اس نے تلوار نیام سے باہر نکالی اور ہماری صفوں پر حملہ آور ہوا۔ اس نے اس شدت سے حملہ کیا کہ چشم زدن میں اٹھارہ آدمیوں کو زخمی کر کے ڈال دیا۔ اس کی بے نظیر شجاعت سے کمانڈنگ افسر اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے حکم دیا کہ اس نوجوان کو زندہ گرفتار کیا جائے لیکن اس نے کہا کہ تم زندہ شیر کو گرفتار نہیں کر سکتے چنانچہ زخمی ہو جانے کے باوجود جب اس کے ہر عضو سے خون کے فوارے نکل رہے تھے۔ اس نے دوبارہ شدت سے حملہ کیا۔ جب کمانڈنگ افسر نے یہ دیکھا کہ اگر اس کو قتل نہ کیا تو شاید ساری کمپنی (سو آدمی کی ایک کمپنی) کا صفایا کر دے گا تو مجبوراً اس نے حکم دیا کہ سنگینوں سے خاتمہ کر دو۔ سپاہیوں نے اسے نرغہ میں لے کر اپنی سنگینیں بیک وقت اس کے سینے میں پیوست کر دیں۔ لیکن جب تک اس کی روح جسم میں باقی رہی وہ برابر اپنی تلوار کے جوہر دکھاتا رہا۔ اس کے ہاتھ اس وقت رکے جب اس کی روح پرواز کر گئی۔ اس کے تمام ساتھیوں نے اسی طرح بہادری کے جوہر دکھا کر

شہادت کے جام نوش کیے۔" مولانا ذکاء اللہ نے بھی ان مجاہدوں کی تعریف کی ہے۔

جب خان بہادر خاں کے ساتھیوں کو شکست ہوئی۔ تو اس وقت قصبۂ محمدی میں مولوی احمد اللہ شاہ نے حکومت قائم کر لی تھی۔ جنرل بخت بھی اپنے ساتھیوں ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی کے ساتھ آ گئے۔ اور تمام محب وطن حضرات تقریباً یہاں جمع ہو گئے تھے۔ خان بہادر خاں بھی پہنچ گئے تھے۔ مگر انہیں یہاں بھی شکست ہوئی۔ ۶ رمئی کو شرق و مغرب کی جانب سے انگریزی فوجیں نے بریلی شہر میں داخل ہو کر قتل عام اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اور اہالیان شہر کی وہ مشہور "بھاگڑ" واقع ہوئی جس کی درد انگیز یاد آج تک بزرگوں کے دلوں میں زندہ ہے۔

۱۸۵۹ء میں زیر دامن کوہ نیپال خان بہادر خاں ایک لڑائی میں گھوڑی کی پیٹھ سے گر کر گرفتار ہوئے اور لکھنؤ لائے گئے۔

کرنل ٹرو نے پوچھا "تم نے اس سن پیری میں سرکار سے کیوں بغاوت کی؟"[1]

نواب بہادر خاں "تم نے ہمارا ملک چھین لیا تھا۔ تمہاری فوج نے تمہارا سامنا کیا تھا جب تم بھاگے تمہاری فوج نے ہمیں مستحق ریاست سمجھ کر حاکم ریاست کر دیا۔ ہم اسے عنایت خدا سمجھے کہ اپنے حق کو پہنچے۔ اب تمہارے قابو میں آئے ہیں۔ اختیار ہے جو چاہو کرو۔"

کرنل ٹرو نے حکم دیا کہ تمہاری روبکاری بریلی میں ہو گی۔ چنانچہ سوار اور پیدلوں کے پہرے میں مقید ہو کر بریلی گئے۔ مقدمہ چلا۔ پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ بریلی کی کوتوالی کے سامنے خان بہادر خاں پھانسی گاہ میں لائے گئے۔

---

[1] تواریخ اودھ صفحہ ۳۶۹

شہر کی خلقت تمام جمع تھی۔ کمشنر اور انگریزی افسران بھی جمع تھے۔ کمشنر سے کافی دیر گفتگو ہوئی۔ جب خاموش ہوئے تو خان بہادر خاں نے فرمایا۔ "اب دیر لگانے کی کیا ضرورت ہے" پھانسی دیتے وقت ان سے دریافت کیا گیا آپ کو جو کچھ وصیت کرنی ہے وہ فرما دیجئے۔ آپ نے کہا مجھ کو کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے اور یہ شعر پڑھا۔ ؎

بجرم کلمۂ حق مے کشند و غوغائے است
زہرگ زندگیم مے شود تماشائے است

جب پھانسی دے چکے تو ورثا نے خان بہادر خاں کی نعش مانگی۔ انگریزوں نے نعش دینے سے انکار کر دیا اور کہا۔

"تم انہیں شہید بنا کر قبر پر میلہ کیا کرو گے۔ ہمارے لئے باعث تکلیف ہوگا۔"[1] بہادر خاں کی نعش کو مارچ ۱۸۶۰ء[2] کو جنت کے مسلمان سپاہیوں نے ڈسٹرکٹ جیل بریلی میں دفن کر دیا۔ سید الطاف علی علیگ بریلوی مؤلف حیات حافظ رحمت خاں کے ایک خاندانی بزرگ نے جو دفن کے وقت موجود تھے۔ خان بہادر خاں کی نعش کو قبر میں بغیر کفن رکھتے ہوئے دیکھ کر ان کے چہرے پر رومال ڈال دیا تھا۔

خان بہادر خاں کی حکومت کے زمانے میں عوام بہت خوش و خرم تھے۔ پورا شہر ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ اور بازار کھلے رہتے تھے۔ سڑکوں اور گلی کوچوں میں بڑی رونق اور چہل پہل رہتی تھی مکمل امن و امان تھا۔ مسجدیں مسافر خانے اور سڑکیں تعمیر ہوئی تھیں ہر چند سستی تھی۔

۱۔ قیصر التواریخ دوم ص ۳۲۷ ۲۔ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند دوم ص ۱۹۳

تیل روپے کا پانچ سیر، گھی ڈھائی سیر اور گیہوں بیس سیر کے حساب سے فروخت ہوتا تھا۔ لوگ خوش ہو ہو کر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا کی رحمت سے کافروں کی حکومت سے ایسی نجات دلائی ہے کہ ہر چیز میں برکت ہے۔ مجاہدین کے غول کے غول زرہ بکتر سے لیس ہو کر شہر میں گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے اور "اسلام کا بول بالا فرنگی کا منہ کالا" کے نعرے لگاتے تھے۔[۵۱]

اس عہد میں چوری بھی نہیں ہوتی تھی۔ شریعت محمدیہ کے مطابق چور کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے تھے اس لئے عوام کا سامان محفوظ رہتا تھا۔[۵۲]

بقول صاحب تمیم سخن نواب خان بہادر خاں صاحب دیوان شاعر تھے ان کا تخلص مشرف تھا۔ انکے دیوان کی دہلی کی مشہور لائبریریوں نذیریہ لائبریری، ہارڈنگ لائبریری، کلکتے کی نیشنل لائبریری، ایشیاٹک سوسائٹی، پٹنہ کی خدابخش لائبریری اور رام پور کی رضا لائبریری میں تلاش و جستجو کی۔ بریلی میں بھی اہل علم اور ادبی حلقوں سے معلوم کیا لیکن اس کے دیدار نصیب نہیں ہوئے البتہ ایک غزل جس میں نواب حافظ عبدالعزیز صاحب عزیز کی تضمین ہے وہ عزیز صاحب کے دیوان کے صفحہ ۱۷۹ میں نظر پڑتی ہے جو نقل کی جاتی ہے۔

تا حشر اب خیال نہ میرا کریگا دل	تو اس کو مل گیا تو مجھے کیا کریگا دل
جان و جگر تو نام کو باقی نہیں رہے	کیونکر اب اسکی زلف سے سودا کریگا دل

۵۱۔ العلم کراچی جنگ آزادی نمبر جون ۱۹۵۷ء
۵۲۔ صبح امید فی کوائف المجاہد صفحہ ۱

جان و جگر کے واسطے دیکھو گے دوستو — کن کن خرابیوں کو نہ پیدا کریگا دل
لے جائیں گے اڑا کے خریدار مثل بُو — جبتک برنگ غنچہ گرہ وا کرے گا دل
شانے کی طرح اور بھی ہوئیگا چاک چاک — جیوں جیوں کہ اسکی زلف سنوارا کریگا دل

مصروف دیکھ پیرویٔ دل نہ کیجیو
میری طرح سے تجھ کو بھی رسوا کریگا دل

منشی ۔ میر محمد حسین خوشنویس دہلوی

میر محمد حسین خوش نویس خلف سید ابو الحسن عرف میر کلن خوشنویس کے آبا و اجداد ایران کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور مدت تک لکھنؤ میں مرزا سلطان شکوہ کی سرکار میں ملازم رہے۔

عباس مرزا داماد مرزائی بیگم مصاحبہ حضرت محل کو جب سفارت دہلی پر مقرر کیا گیا تو ان کے ساتھ میر محمد حسین دہلی پہنچے اور اپنے عزیز و اقارب کے پاس ٹھہرے۔ ہنگامہ غدر شباب پر تھا۔ بقول معین الدین جو پہاڑ گنج کے حلقہ کے پولس افسر تھے۔

"۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بے گناہ مسلمان قتل ہوئے اور نواب مظفر الدولہ مرزا احمد خاں، محمد حسین خاں، اکبر خاں، میر خاں، نوشہر خاں، حکیم عبد الحق، خلیفہ محمد اسمٰعیل، محمد خاں رسالدار صفدر بیگ، عیسیٰ یار خاں کے ساتھ انگریزی فوجیوں کا نشانہ میر محمد حسین خاں بھی بنے"

میر محمد حسین کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ منشی تخلص کرتے تھے۔[1]

نہ پوچھو اس پری کے حسن کا عالم وہ آفت ہے۔ بلا شوخی، غضب رفتار، قامت اک قیامت ہے

---

[1] سخن شعراء ص ۴۶۱

جو پوچھا اس سے لوگوں نے کہ منشی کون ہے بولے۔ مجھے کچھ یوں ہی اس سے دور کی صاحب سلامت ہے،

زر کھنے دیر سے مطلب نہ اب طوفِ حرم کیجے
بتنگ آیا ہے جی ہستی سے اک سیرِ عدم کیجے

میکش۔ میر احمد حسین دہلوی

میر احمد حسین میکش دہلی کے رہنے والے تھے ان کا دہلی کے سادات کے خاندان سے تعلق تھا۔ ان کے والد ماجد میر کرار حسین صاحب تھے نواب شائستہ خاں کی اولاد میں تھے۔ کتب عربیہ اخون فیض احمد سے جو مسجد کلاں میں رہتے تھے پڑھی تھی۔ ۱۲۶۲ھ میں تیس برس کی عمر تھی۔ صدر امین اول کی کچہری میں عہدۂ وکالت پر مامور تھے[1]۔ میکش تخلص تھا لیکن شراب نوشی سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ شراب پینے کو بہت برا سمجھتے تھے۔ خوش اخلاق اور ظریف الطبع تھے، جوانی کے شباب کے زمانہ میں پیری کی متانت سے بہرہ ور تھے۔ اسی جوانی میں مرزا غالب سے اکتساب سخن کیا[2] چنانچہ ان کا کلام استاد کے طرز اور طریقے پر ہے۔

مرزا غالب بھی میکش کو عزیز رکھتے تھے۔ چنانچہ اردوئے معلی میں ان کے نام جو خطوط ہیں ان سے مرزا غالب کی محبت و تعلق کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

بھائی میکش آفریں ہزار آفریں، تاریخ نے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خرمے کس مزے کے ہوں گے جن کی تاریخ ایسی ہے دیکھو صاحب

---

[1] طبقات الشعراء ص ۴۳۸ [2] گلستان سخن ص ۴۴۹

ع قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔

تاریخ دیکھی۔ اس کی تعریف کے خرمے کھائیں گے۔ اس کی تعریف کریں گے۔ کہیں یہ تمہارے خیال میں نہ آئے کہ یہ حسن طلب ہے کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لے کر آیا ہے۔ ابھی خرمے لے کر آئے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اگر بفرض محال تم یوں ہی عمل میں لاؤ گے اور میاں دین محمد کے ہاتھ خرمے بھجواؤ گے تو ہم بھی کہدیں گے تازہ سے بہتر بارہ سے بہتر۔"

مرزا غالب کو ان کے اور ان کے خاندان کا خیال رہتا تھا۔ ۷ر فروری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"سلطان جی میں تھا اب شہر میں آگیا۔ دو تین بار میرے پاس بھی آیا پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا کہ بی بی کو اور لڑکے کو بہرام پور وزیر علی کے پاس بھیجدیا ہے۔"

دوسرے خط میں ان کے غدر میں پھانسی پر چڑھنے کا ذکر کیا ہے :۔

"یا اللہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے کیا معنی کہ جو میں مروں۔ کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔ مصطفے خاں خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے، ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس نازپروردہ میں کہاں۔ احمد حسین میکش مخنوق ہوا۔ گویا اس نام کا آدمی ہند میں تھا ہی نہیں۔ پنشن کی درخواست

دے رکھی ہے۔ بشرطِ اجراء بھی میرا کیا گذارہ ہوگا۔ ہاں دو
باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل
ہے، دوسرے یہ کہ بموافق قولِ عوام چولھے دلدر نہ ہوگا۔"

مرزا غالب میکش کو شہید ہونے کے بعد بھی نہیں بھولے۔ ان کے
ایک دوست حکیم رضی اللہ خاں کو قتلِ عام میں ایک خاکی نے گولی ماری
تھی۔ ان کے ساتھ میکش کو بھی یوسف مرزا کے خط میں ان الفاظ
کے ساتھ یاد کیا ہے۔

"اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین
میکش اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں۔"

میکش صاحب کا اردو کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ فارسی کا
نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔[1]

گفتمش دے کای رفتی خراماں سوئے باغ — گفت میکش بودہ باشد کاں گرفتار من است
اے آنکہ در شبہائے غم اندر دل من بگذری — خون است اینجا موج زن دامن نگہ دار از تری
از ہر دو جانب موئے تو آویختہ بر روئے تو — اے بستہ گیسوئے تو ہم زہرہ و ہم مشتری
بر اوج شوقت نارسا پرواز عالی فطرتی — در راہ عشقت نارسا پروانہ نیک اختری
یاد خرامِ ناز تو، واں خوبی انداز تو — در کلبۂ من بوریا گستردہ از بالِ پری

کبک دری در رہروے ناکردہ با تو ہمسری
سرو سہی در راستی ناخستہ با تو ہمسری

---

[1] روز روشن ص ۶۶۹

ناصرؔ۔ ناصر خاں فرخ آبادی

ناصر خاں فرخ آباد کے باشندے تھے۔ اور بنگش پٹھان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب قائم علی کے داماد اور محمد قاسم خاں کے صاحبزادے تھے۔ فرخ آباد کے مشہور و معروف رئیسوں میں سے تھے۔

غدر کے زمانہ میں آغا حسین کمانڈر سیتاپور اکتالیسویں رجمنٹ کے ساتھ ۱۹ر جون ۱۸۵۷ء کو کشتیوں میں بیٹھ کر دریا سے اُتر آئے نواب تفضل حسین خاں صاحب والئی فرخ آباد نے ان کی اعانت کی۔ اور دو سو اشخاص اور ۲۴ بندوقیں اور روپیہ پیسہ دیا۔ دسویں پلٹن بھی اس پلٹن کے ساتھ ہو گئی۔

فتح گڈھ کے قلعے میں انگریز رہتے تھے۔ اور دسویں ہندوستانی پلٹن کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ جب دسویں اور اکتالیسویں پلٹن مل گئی، تو اس انتظار میں تھی کہ قلعہ پر حملہ کرے۔ ۱۹ر جون سے ۲۴ر جون تک حملہ کرنے کے مشورے ہوتے رہے۔ ۲۵ر جون کو اچھی مہورت سمجھ کے قلعہ پر حملہ کیا۔ چار روز تک برابر حملے کرتے اور برابر کے اونچے مکانوں کی چھتوں سے چڑھ کر گولیاں چلاتے رہے۔

روز بروز اہل قلعہ کی تعداد اور سامان رسد و میگزین گھٹتا جاتا تھا۔ غازیوں نے توپوں کے گولے مار مار کے قلعہ کی فصیلوں میں دراڑیں ڈال دیں۔ محصورین قلعہ نے یہ صورت دیکھی، قلعہ کے نیچے دریا میں تین کشتیاں کھڑی تھیں۔ ۳ر جولائی کی رات کو انگریزوں نے

ان میں بیٹھنا شروع کیا، تین کرنل تھے۔ تینوں نے ایک ایک کشتی میں سواریوں کو بٹھایا۔ کرنل گوری ڈاں کی کشتی موضع سنگھی رام میں بخیریت پہنچ گئی۔ لیکن میجر روبرٹس کی کشتی ریت میں آ گئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد دیکھتے کیا ہیں کہ دو کشتیاں مسلح سپاہیوں کی آتش فشانی کرنے لگیں۔ مسٹر روبرٹس زخمی ہوئے انہوں نے میموں کو کہا کہ وہ کشتی سے کود جائیں، بعض خود اور بعض اور آدمیوں کی مدد سے تیریں۔ آخر کار ان میں سے کچھ ڈوب گئیں۔ کچھ ماری گئیں اور کچھ گرفتار ہوئیں۔ یہی حشر کرنل سمتھ کی کشتی کا ہوا۔ غازیوں کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتاری گئیں۔[1]

احمد یار خاں ناظم محسن علی خاں غازیوں کے سردار تھے۔ جنھوں نے کل علاقت روپیہ وصول کیا تھا۔ بادشاہ دہلی نے ان کی نیابت سلطنت منظور فرمائی تھی۔ سات ماہ تک کامل ضلع پر حکمرانی رہی۔ اس جنگ میں ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے۔ نواب تفضل حسین خاں کے علاوہ نواب سعادت حسین، نواب اقبال مند خاں، نواب غضنفر حسین خاں ٹھاکر دلاور سنگھ امرت پوری، ٹھاکر ولاش سنگھ محمد آبادی، بمج سنگھ اور نواب ناصر خاں تھے۔ فتح گڈھ کے بعد فرخ آباد کے قلعہ پر انگریزی فوج سے مقابلہ ہوا۔ جب کانپور سے انگریزی فوجیں آئیں اور ان سے بھی کئی دن تک مقابلہ رہا۔ لیکن غداروں کی وجہ سے شکست پائی۔[2] جب سب لوگ ادھر اُدھر چلے گئے تو فرخ آباد کے قلعہ کے قرب جوار میں جو توپیں پڑی ہوئی تھیں ان کو ناصر خاں صاحب تنہا گھسیٹ کر لے گئے

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند صفحہ ۸۳۵ [2] قیصر التواریخ دوم صفحہ ۳۲۱

اور قادری دروازے کے برج پر لگا دیں۔ جب ان کے سامنے انگریزی فوجیں آتیں۔ تو یہ بیک وقت توپیں چلاتے تھے۔ جب کافی دیر لڑتے رہے اور انگریزی فوج پسپا ہوتی رہی تو ایک انگریز آفیسر نے دوربین سے دیکھا کہ ایک ہی آدمی لڑ رہا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ نشانہ لگاتے وقت توپ کی چرخی آپ کے پاؤں پر گر گئی۔ جس کی وجہ سے بے بس ہو گئے۔ جب کافی دیر تک گولہ نہیں آیا تو فوج اندر گھس آئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یہ گولہ باری کر رہے تھے۔ مخبروں نے قادری دروازہ کھول دیا۔ انگریزی فوج اندر داخل ہو گئی برج پر سپاہی پہنچے۔ ان کو گرفتار کیا۔ اور پھانسی پر چڑھا دیا۔ ناصر خاں انتہائی بہادر جری تھے۔ ان کا دم نہیں نکلتا تھا۔ جب ٹخنے کی نس کاٹی تو دم نکلا۔

نواب محمد ناصر خاں صاحب زبردست شاعر تھے ان کا کلام نظامی کے ہم پلہ تھا۔ ان کا لیلیٰ مجنوں کا منظوم قصہ بہت مشہور تھا۔ عشق کی مدح و تعریف میں انہوں نے ایک مثنوی لکھی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں[1]

ہر سر کہ ز عشق ما خبر نیست ہاں بر سر سنگ زن کہ سر نیست

ہر سر کہ ز سر عشق خالی ست اما بنگہ شگفتہ خالی ست

ہر سر کہ بعشق گرم خواں نیست

شائستہ درگہ جنوں نیست

---

[1] تاریخ فرخ آباد صـ ۲۵۷

نواب سخاوت حسین خاں

جنہیں ۱۳ ستمبر ۱۸۶۳ء کو فتح گڈھ کے قلعہ کے

املی کے درخت پر پھانسی دیگئی

دل کز در عشق رتبہ حاصل — بے عشق خرابہ ایست بیدل
آباد حریم دل ز عشق است — آمیزش آب و گل ز عشق است
عشق دیدہ مغز و پوست عالم — معنی عشق است و منظر کژدم
عالم عشق است کہ بر فلک رساند — عشق است کہ تا فلک کشاند

سرمایۂ افتخار عشق است
مجموعۂ اعتبار عشق است

ٹھاکر دلادر سنگھ، ٹھاکر دلاش سنگھ۔ ٹھاکر برج سنگھ کے ساتھ حسب ذیل اشخاص کو مختلف سالوں میں پھانسیاں ملیں۔

(۱) نواب غضنفر حسین کو ۱۲ ر دسمبر ۱۸۶۲ء کو فرخ آباد کے گھومنا کے درخت میں پھانسی دی گئی۔

(۲) نواب اقبال مند خاں کو ۱۸۶۲ء میں گورنمنٹ اسکول میں سور کی چربی جسم پر مل کر پھانسی پر چڑھایا گیا۔ منیر شکوہ آبادی نے ان دونوں شہیدوں کی یہ تاریخ کہی۔ سہ

اقبال مند خاں و غضنفر حسین خاں — دونوں در محیط عطا آہ آہ ہائے
دونوں جوان نیک ایران ذی حشم — مقتول تیغ تیر قضا آہ آہ ہائے

تاریخ اس قتل کی کافی ہے یہ منیر
دونوں شہید راہ خدا آہ آہ ہائے

(۳) نواب تفضل حسین خاں کے بھائی نواب سخاوت حسین کو ۱۸۶۳ء کو فتح گڈھ کے قلعہ کے املی کے درخت پر پھانسی دی گئی

ان کی بھی تاریخ منیرؔ شکوہ آبادی نے کہی ہے

ریاضِ خلق سخاوت حسین خاں نواب	نہال باغ کرم زیب مسند شوکت
جوان قابل و فرزند خاص نصرت جنگ	غلامِ آل نبی سردا قمر طلعت
سخاوت اور مروت میں بے نظیر جہاں	ریاست اور امارت کے واسطے زینت
ہر ایک دل میں جگہ اسکی جان سے بڑھ کر	ہر اک زبان پر اس کا وظیفہ و درجیت
زمانہ اس کی مروت پر اس طرح شیدا	مشام روح ہو جس طرح عاشق نکہت
وہ بے گناہ ہوا تیغ مرگ سے مقتول	عنایت اس کو کیا حق نے گلشن جنت

منیرؔ نے یہ کہی اس کے قتل کی تاریخ
ہوا شہید امیر دا اسیر باہمت

(۲۸) نواب تفضل حسین خاں ابن نواب عنایت جنگ ابن نواب خادم حسین ابن نواب حسین خاں ابن دلیر ہمت خاں ابن احمد خاں ابن امام خاں ابن قائم خاں ابن نواب غضنفر جنگ بنگش۔

۵ ربیع الثانی ۱۲۴۳ھ ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۸۲۷ء

میں پیدا ہوئے۔ ان کے چچا نواب تجمل حسین خاں ابن نواب شوکت جنگ والئی فرخ آباد تھے۔ نواب تجمل حسین خاں علم دوست تھے ــــــ علما، فضلاء اور اہل کمال حضرات ان کے دربار سے فیضیاب ہوتے تھے۔ مرزا غالب بھی ان کی دعوت پر فرخ آباد آئے تھے۔ انہوں نے غالبؔ کی قدردانی کی۔ ان کے متعلق غالبؔ نے ایک شعر میں کہا ہے ؎

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

نواب اقبال مند خاں

جنہیں سنہ ۱۸۶۲ء کو گورنمنٹ سکول کے پیپل کے درخت پر سور کی چربی جسم پر ملکر پھانسی دیگئی

سنہ ۱۸۴۶ء میں نواب تجمل حسین خاں اس دنیا سے سدھار گئے ان کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ نواب تفضل حسین خاں ابن نواب عنایت حسین ان کے جانشین قرار پائے۔[1] حکومت کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے چلایا۔ گیارہ سال تک حکومت کی۔ حکومت برطانیہ کے زیر سایہ انگریزوں کے حکم کے پابند اور ان کے اشاروں کے محتاج ہوں۔ خوددار انسان اس کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ غدر کے ایام میں انہوں نے غلامی کے طوق کو اتار کر پھینکا۔ بدیسی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا سنہ ۱۸۵۹ء میں ان کے خلاف میجر سیرورڈا سپیشل کمشنر کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ اس نے پھانسی کی سزا دی۔ گورنر جنرل کے سامنے اپیل ہوئی۔[2] اس نے سزائے موت ختم کر کے یہ شرط پیش کی کہ نواب صاحب برطانیہ کا علاقہ خالی کر دیں۔ چنانچہ اسی سال نواب تفضل حسین خاں کو عدن بھیج دیا گیا۔ آپ مکہ معظمہ میں مقیم ہو گئے۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپال والے حج کے دوران میں ان سے ملے۔ یہ فقیری لباس میں مست تھے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں اسی مقدس پاک زمین میں فوت ہوئے قابل رشک موت ہے۔ ہزاروں حکومتیں قربان اس موت پہ اور ایسی زندگی پر۔

نواب تجمل حسین خاں کے صاحبزادے نواب محمد اصغر حسین خاں صاحب ناطق تھے فرخ آباد کے مشہور شعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

---

[1] تاریخ نوابان بنگش فرخ آباد صفحہ ۱۴۲ [2] گزیٹیر فرخ آباد صفحہ ۱۸۰

آپ شیخ امداد حسین صفیر خلف واحد بخش فرخ آبادی کے شاگرد تھے
نواب ناطق نے "تاریخ نوابان بنگش فرخ آباد" کے لئے حسب ذیل
تاریخی قطعہ کہا تھا۔ ؎

ہے مشرح طور پر تالیف مسٹر آردین | حالِ نوابین بنگش کو کیا ہے خوب صاف
ہاتفِ غیبی نے ناطق یہ کہی تاریخ طبع | ترجمہ اردو زباں میں بھی لکھا ہے خوب صاف

نواب ناطق کے خلف نواب فطنت حسین خاں صاحب بحمد اللہ
حیات ہیں۔ ان کو موجودہ حکومت پنشن دیتی ہے۔ تنگ نظری کہئے
یا ستم ظریفی سے تعبیر کیجئے، یہ پنشن صرف ان کو ملے گی۔ ان کی اولاد
اس کی مستحق نہ ہوگی۔

نسیم۔ مولوی نسیم اللہ صاحب کولوی

مولوی نسیم اللہ قصبہ کول ضلع علی گڈھ کے رہنے والے تھے
ان کے بزرگ بنی اسرائیل کی نسل سے تعلق رکھتے تھے چھ سو ہجری میں
مصر سے ہندوستان آئے اور یہیں مقیم ہو گئے۔ اہل کمال سے علوم
باطنی و ظاہری کا استفادہ کیا۔

آپ کے جد امجد محمد امین الدین مرحوم درویش صفت بزرگ تھے
اپنے وقت کے بہترین طبیب مانے جاتے تھے۔ کچھ ابتدائی علوم
دینی حاصل کرنے کے بعد حضرت مولانا عبد العزیز محدث دہلویؒ
کی خدمت میں دہلی آئے اور علوم حدیث و فقہ ان سے تحصیل کئے۔
انہوں نے طبیعت موزوں پائی تھی۔ فارسی میں اشعار کہا کرتے تھے

مولوی نسیم اللہ نسیم قصبہ کول

نمونہ میں ایک شعر تحریر کیا جاتا ہے۔ ؎

ہر طفل سرشک در نگاہم لخت جگری و نور چشم است

مولانا نسیم اللہ صاحب کے والد ماجد حکیم محمد علیم اللہ صاحب بھی طب میں کمال کی مہارت رکھتے تھے۔ شہرۂ آفاق شخصیت تھی۔ آپ بھی کبھی کبھی فکر سخن کیا کرتے تھے۔ ؎

نقد دشنام بدہ جنس دعائے بستاں کہ ازیں بیع و شرا رونق بازار من است

مولوی نسیم اللہ صاحب نے انیس برس کی عمر میں مولوی عبد الجلیل صاحب مرحوم و مغفور کی خدمت میں کتب درسیہ کی تحصیل کی۔ فارغ ہونے کے بعد فن طب کو حاصل کرنے اور قوانین علاج کی تکمیل کرنے کے واسطے دہلی آئے۔ اور دہلی کیا ہندوستان بھر کے مشہور و معروف حکیم امام الدین صاحب سے حکمت سیکھی۔ علوم نقلی و عقلی کے لئے مفتی محمد صدر الدین صاحب آزردہ دہلوی کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے۔ جب ان علوم کی تکمیل فرمالی۔ تو حکام وقت سے قوانین میں مہارت تامہ بہنچا کر منصفی کی سندلی اور قصبوں میں وکالت شروع کردی۔[1]

بارہویں مئی ۱۸۵۷ء شنبہ کو سہ پہر کے وقت علی گڈھ میں شہرت ہوئی کہ دسویں مئی یکشنبہ کو میرٹھ میں پلٹن کے سپاہیوں اور رسالہ میرٹھ نے بغاوت کی اور دہلی گئے ہیں۔ مسٹر واٹسن مجسٹریٹ ضلع کو جب اس بات کی اطلاع ہوئی تو اس نے تحصیلدار اور کوتوال کو ناکہ بندی کا حکم دیا۔

---

[1] گلستان سخن صفحہ ۲۶

۱۹ مئی سہ شنبہ کو نرائن برہمن اور عظیم بیگ نے پلٹن کے سپاہیوں سے کہا کہ تم انگریزوں کے خلاف بغاوت کیوں نہیں کرتے۔ اگر ذرا سا آمادہ و تیار ہو جاؤ تو ہم سب گاؤں کے آدمی تمہارے ساتھ ہیں۔ اور خزانہ لوٹنے کے لیے پانچسو آدمی آئیں گے تم ہوشیار رہنا۔

مجسٹریٹ کو اس گفتگو کی اطلاع مخبر نے دی۔ مجسٹریٹ نے نرائن کو گرفتار کرایا۔ مخبر کی شہادت اور نرائن کا بیان قلمبند کیا اور بیسویں مئی کی شام کو چار بجے نرائن کو پھانسی دے دی گئی جس سے سپاہیوں میں انتقام کی آگ لگ گئی۔ انہوں نے بغاوت اختیار کی، اور انگریزی افسروں پر حملہ آور ہوئے۔ کلکٹری کی کوٹھی کے خزانہ میں سات لاکھ روپے تھے۔ خزانہ کو توڑ کر جس قدر اٹھا کر لے جا سکے لے گئے چھاؤنی اور کوٹھیوں میں آگ لگائی۔ دفتروں کا سامان خاکستر کیا۔ اور رات کو مجاہدین دہلی کی طرف روانہ ہو گئے اور اسی کے ساتھ تمام انگریزی حاکم آگرہ سے فرار ہو گئے۔ مجاہدین کو اور ہمت ہوئی اور انہوں نے سرکاری ڈاک گھر کو لوٹنا شروع کیا۔

اکیسویں مئی پنجشنبہ کو صبح ہوتے ہی مجاہدین کے ساتھ شہر کے تمام لوگ ہو گئے اور چھاؤنی میں پہنچ گئے۔ جس مکان، کوٹھی اور ڈاک گھر سے جو چیز بھی ملی وہ اٹھالی۔ دوپہر کے قریب عدالت دیوانی اور صدر الصدوری کے دفتر کو جلایا۔ جیل خانہ پر گئے اس کو توڑا۔ قیدی رہا ہوئے۔ جیل کے سامان پر قبضہ کیا۔ شام کو انگریزی افسران نے کوتوال سے

شہر کے انتظام کرنے کے لئے کہا اس نے کوئی توجہ نہیں کی۔ ۲۸ رمئی تک یہی حال رہا۔ جو انگریز ملا اس کو قتل کیا۔ ۲۹ رمئی جمعہ کو انگریزی افسران صبح نو بجے علی گڈھ میں داخل ہوئے اور منادی کرائی، جو لوگ سرکاری سامان اور ڈاک گھر کا روپیہ لے گئے ہیں واپس کردیں سپاہیوں کی بھرتی ہوئی۔ قیدیوں کے حاضر ہونے کا اشتہار دیا گیا۔ ڈاک کا سلسلہ از سر نو شروع ہوا۔

یکم جون شنبہ کو مجاہدین کے زور کو ختم کرنے کیلئے ڈاکٹر الارک مجسٹریٹ کھیر گئے۔ جہاں راؤ بھوپال سنگھ نے سرکاری تحصیلدار کو برطرف کرکے اپنی عملداری قائم کی تھی ان کو گرفتار کرکے پھانسی دی گئی اور ان کے ساتھیوں کو تازیانہ کی سزا دی۔ ۴ رجون تک انگریزی افسران مجاہدین اور ان کے ہمراہیوں سے انتقام لیتے رہے اور لوٹ کا مال نکالا۔ لیکن جب پانچ جون کو ساتویں رسالہ کے سوار علی گڈھ پہنچے جتنا اسباب انگریزی افسران نے نکلوایا تھا سب کو جلا کر راکھ کر دیا اور جو مال و اسباب اور روپیہ ملا اس کو لے کر دہلی روانہ ہو گئے[1]

اسی اثناء میں رسالہ گوالیار میجر برٹن کی کمان میں ہاتھرس ہوتا ہوا سانسی انگریزوں کی حفاظت کے لئے پہنچا۔ ۲۶ رجون کو علاقہ لگسمہ میں انگریزی فوج مجاہدین کی قوت کو توڑنے کے لئے پہنچی مقابلہ ہوا۔ طرفین میں سے مجروح اور مقتول ہوئے۔

---

[1] رسالہ تاریخ بغاوت ہند آگرہ۔ جنوری ۱۸۶۲ء

۳۰ جون کو علی گڈھ کے شہریوں نے جہاد کی تیاری کی اور ہزار پندرہ سو کے قریب جمع ہو کر "مدارک" میں جہاں انگریزی افسران مقیم تھے پہنچے۔ مقابلہ ہوا۔ پچیس کے قریب مجاہد شہید ہوئے اس سے زیادہ انگریزی سپاہی کام میں آئے۔ اس جنگ کی خبر سانسی پہنچی تو رسالہ گوالیار نے علم بغاوت بلند کیا۔ جس کی وجہ سے تیسری جولائی جمعہ کے روز تمام انگریز آگرے چلے گئے اور انگریزوں سے علی گڈھ خالی ہو گیا۔

اب تک انفرادی طور پر علی گڈھ کے لوگ انگریزوں کے خلاف نبرد آزما تھے لیکن ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو مسلمان اور ہندو معززین نے شہر کے انتظام کے لیئے کوتوالی میں میٹنگ کی اور ایک مشترکہ پنچایت قائم کی منشی دیا شنکر ڈپٹی کلکٹر تھا نیسر، لالہ چھوٹے لال، نند کشور جانی اسا شنکر لالہ تلسی پرشاد، منشی محمد داؤد، حکیم تفضل حسین، شیخ ضیاء اللہ اور خواجہ نجف علی صاحب پنچ مقرر ہوئے۔ اور سر پنچ منشی محمد داؤد، منشی دیا شنکر بنائے گئے۔ ۶ جولائی کو ڈاکٹر کریم بخش جنھوں نے نویں پلٹن میں بغاوت پیدا کی تھی وہ کوتوال شہر مقرر ہوئے۔ دسویں جولائی کی صبح کو سوار و پیادہ پلٹن چھاؤنی جھانسی مع تین توپوں کے علی گڈھ میں داخل ہوئیں۔ پنچوں نے ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا پلٹن کے سپاہیوں نے مسٹر جان میش، بابو تارنی چرن اور محمد علی تحصیلدار کول کے مکانات منہدم کیئے اور مال و اسباب پر قبضہ کیا اور گیارہویں تاریخ کو علی گڈھ سے کوچ کر گئے۔ چودھویں جولائی کو

قریب چار سو سوار رسالہ ۱۴ بنارس سے شہر میں آیا اور رفعت گنج کی سرائے اور دکانوں میں مقیم ہوا۔ شام کو مولوی نسیم اللہ اور غوث خاں کالا محل میں ٹھیرے۔ حالات کا معائنہ کرکے مالا گڈھ روانہ ہو گئے۔ سترھویں تاریخ کو بنارس کے سوار دہلی چلے گئے۔

۲۸ جولائی کی شام کو مولوی نسیم اللہ اور غوث خاں مالا گڈھ سے آئے اور احاطۂ نسیم اللہ ڈپٹی کلکٹر میں ٹھیرے۔ ۳۱ جولائی کو غوث خاں نے سوار و پیادوں کی بھرتی کا اعلان کیا۔ کافی لوگ بھرتی ہونے کے لئے آئے۔ منالال پسر چینی لال کو خزانچی گیری کی خدمت عطا ہوئی۔ بلا، صاحب آباد، سندہولی، عیسن پور اور اودن وغیرہ مواضعوں کے ملکانی میواتی اور برہمن نوکر ہوئے اور انتظام رحلہ جات اور دروازوں کی دیکھ بھال کی ذمّہ داری ان کو دی گئی۔ شہر کے کوتوال حسن خاں میواتی بنائے گئے۔ غوث خاں کے مشیر خاص مولوی نسیم اللہ صاحب ہوئے اور کل سلطنت کے کرتا دھرتا بنائے گئے۔ انگریزوں نے اور ان کے حامیوں نے شہریوں کو خوفزدہ کیا اور شہر سے باہر جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن مولوی نسیم اللہ صاحب کے سمجھانے پر ایک بھی آدمی شہر سے باہر نہیں گیا۔ محبوب خاں جو سررشتہ داری انگریزی میں اور در سیر تھے شہر کے تحصیلدار، حسین خاں پیشکار، ظفرالدین پسر کریم الدین غوث خاں کے دفتر کے میر منشی متعین ہوئے اور ہمت خاں کو فصل ربیع کا لگان وصول کرنے کے لئے لگایا گیا۔

۱۳ر اگست کو سوا سو سوار چھاؤنی ساگر سے آئے۔ غوث خاں نے ان کو ملازم رکھ لیا۔ غوث خاں نے قسم کھائی تھی کہ وہ رعیت کی بھلائی کرے گا۔ اس نے اسی پر عمل کیا اور رعیت کو آسانیاں بہم پہنچائیں۔
۲۱ر اگست کو خبر ملی کہ انگریزی فوج آگرہ سے غوث خاں کے اقتدار کو ختم کرنے کے لئے آئے گی۔ اسی دن بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں مولوی عبدالجلیل صاحب نے مسلمانوں کو جہاد کی تلقین کی۔ چنانچہ مقررہ مقام پر لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ ۲۲ر اگست کو غوث خاں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے منادی کرادی کہ وہ جہاد کیلئے تیار ہو جائیں چنانچہ ۲۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو تیاری شروع ہوگئی۔ چوبیسویں اگست دوشنبہ کو ہاتھرس سے انگریزی فوج نے حملہ کیا اور چاہ حجام سے گولہ مارا۔ اس وقت مولانا عبدالجلیل صاحب جنگ کرنے کی ہدایت فرمارہے تھے کہ سب لوگ بہادروں کی طرح مقابلہ کریں۔ گولہ آنے کے بعد ہی مولانا عبدالجلیل معہ غوث محمد، پسر عزت علی، اور محمد یوسف خاں رام پور کے پٹھانوں کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھے اور انگریزی توپ پر جا پہنچے توپ پر قبضہ کرلیا۔ انگریزی فوج بھاگی۔ سخت مقابلہ ہوا۔ مجاہدین خوب لڑے[1] مولانا عبدالجلیل صاحب نے وہ معرکہ گرم کیا کہ انگریزی فوج حیران و ششدر ہوگئی۔ جس طرف تلوار کا وار کرتے بیسیوں کو جہنم واصل کر دیتے تھے۔ آخر لڑتے لڑتے مولوی عبدالجلیل صاحب نے جام شہادت نوش فرمایا۔ مسٹر ٹانڈے اور کافی انگریز افسر کام آئے۔

---

[1] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۸۱۶

غداروں میں ٹھاکر کمر ڈک سنگھ، ٹھاکر جیوا رام سنگھ مجروح ہوئے۔ ٹھاکر گوبند سنگھ مع اپنے ساتھیوں کے انگریزی فوج کی مدد کر رہے تھے۔ رائے درگا پرشاد اور چوبے جے کشن اس لڑائی میں شریک تھے۔ سواران ساگر غوث خاں مولوی نسیم اللہ ان کے والد ماجد اور بھائی اور میناللال خزانچی دانائی کے ساتھ مورچے سے ہٹ گئے اور غوث خاں مالاگڑھ پہنچ گئے اور حبیب خاں پیشکار شہید ہوئے۔

۲۵ر اور ۲۶ر اگست کو انگریزوں نے سانس لیا۔ بازار کھلوائے اٹھائیسویں اگست جمعہ کو مسٹر کاکس کمشنر مع گورے سپاہیوں کے شہر میں آئے۔ مجاہدین کے گھروں کی تلاشیاں لیں۔ مکانات اور باغ قرق کیے۔ دکانیں لوٹیں۔ ۲۹ر اگست کو مولوی نسیم اللہ اور مولوی عبد الجلیل صاحب، نیاز احمد خاں اور محمد یوسف کا مال و اسباب قرق کرکے سرکاری مال خانہ میں داخل کیا۔

۱۵ر ستمبر کو سنا گیا کہ مولوی نسیم اللہ اور نیاز احمد اتر ولی آئے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ فوج ہے۔ ۲۲ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی کی فتح کا اشتہار شائع ہوا۔ اور یہ خبر متواتر آتی رہی کہ مولوی نسیم اللہ مع فوج کے آگرے میں مقیم ہیں اور کول میں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اور تعلقدار دتاولی ان کے معین و مددگار ہیں۔ اور روپے پیسے سے بھی مدد کی ہے۔

۲۴ر ستمبر کو مولوی نسیم اللہ کے حکم سے ملکانوں جو اود ھ کے

رہنے والے تھے انگریز قنداز چوکی پینٹھ پر شبخون مار کر قتل کیا۔ جتنے انگریزوں کے حامی تھے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑا۔

۲۵ ستمبر ۱۸۵۷ء جمعہ کے روز مولوی نسیم اللہ صاحب نے قصبہ اکبر آباد، بھیکن پور، دتاولی، ایٹہ، اترولی اور چاند پور وغیرہ سے فوج بھرتی کی اور کول کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں بہت سے لوگ ان کے ہمراہ ہو گئے۔ جب فوج شہر کے قریب آگئی تو اس نے گولہ مارا جہاں کچہری تھی۔ وہاں گرا۔ گولے کی آواز سے اہلکار اور حکام بھاگے ٹھاکر گوبند سنگھ جو انگریزی پنچایت کا ممبر تھا اس نے انگریزی فوج کو مجاہدوں سے مقابلہ کرنے کا حکم دیا اور گولی بارود تقسیم کی۔ اتنے میں مجاہدین دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک حصہ شہر میں داخل ہوا۔ غدار قوم بھاگی انگریزی پولیس رفو چکر ہوئی۔ دوسرا گروپ سڑک کے راستے کوٹھی ٹھاکر گوبند سنگھ کے قریب جا پہنچا اور طرفین سے مقابلہ ہوا۔ توپ کے گولوں اور بندوق کی گولیوں کی خوب بارش ہوئی مولوی نسیم اللہ، نیاز احمد نے انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دیئے۔ ٹھاکر گوبند سنگھ کی انگریزی فوج بری طرح بھاگی۔ مجاہدین نے ٹھاکر کی کوٹھی، اور مال خانہ میں جو مال و متاع تھا اس پر اور دو توپوں پر قبضہ کیا۔ فتح کی خبر پاکر اہل شہر مجاہدین کے ساتھ ہو گئے خوشی کے شادیانے بجے اور مولوی نسیم اللہ صاحب نے اپنے ڈیرہ میں قیام کیا۔ تمام شہر میں منادی کرا دی گئی۔ "خلق خدا کی ملک بادشاہ کا

حکم مولوی نسیم اللہ کا" دوسری منادی یہ ہوئی کہ محمد علی امنشی درگا پرشاد ڈپٹی کلکٹر، پنڈت آفتاب رائے، چوبے گھنشام داس، اندر لال صدر امین اور منشی جمعیت رائے کا جو سر لائیگا ہزار روپے انعام پائے گا۔ چنانچہ اتروی میں محمد علی قتل ہوئے۔ دس روز تک علی گڈھ میں مجاہدین کا پرچم لہرایا۔ شہر کا معقول انتظام ہوا۔ ہر ایک شخص مولوی نسیم اللہ صاحب کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔

۱۴؍ اکتوبر کو معلوم ہوا کہ انگریزی فوج دہلی کو فتح کرکے مجاہدین کا تعاقب کرتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ سوہنہ پر خیمہ زن ہے اور صبح کو علی گڈھ میں داخل ہو جائے گی۔ مولوی نسیم اللہ کو جب یہ خبر ملی تو بنا ہلی اور سرائے حکیم پر مورچہ لگانے کا ارادہ کیا اور مقابلہ کرنے کی تیاریاں کرنی شروع کر دیں۔

۱۵؍ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو جب انگریزی فوج نے شہر میں گھسنے کی کوشش کی اور شہر کا معمولی سا فاصلہ رہ گیا تو مجاہدین نے گولے مارنے شروع کئے۔ سخت مقابلہ ہوا۔ انگریزی فوج مسلح اور تجربہ کار تھی اور مجاہدین کے پاس اسلحات کی بہت کمی تھی شکست کھا گئے اور انگریزی فوج علی گڈھ میں داخل ہو گئی اور مکمل طور پر ۱۹؍ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو علی گڈھ پر قابض ہو گئی۔[۱] مولوی نسیم اللہ صاحب کو گرفتار کیا اور گولی کا نشانہ بنایا۔

---

[۱] تاریخ بغاوت ہند صـ ۳۲

مولانا نسیم فارسی اور اُردو میں شعر کہتے تھے لیکن شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں تھی۔ اس کے باوجود اپنی شاعری کے کمال کا سکہ اپنے ہم عصروں میں منوالیا تھا۔ چنانچہ صاحب "گلستانِ سخن" لکھتے ہیں۔

"کمالاتِ علمی کی قوت سے اشعار ریختہ اور فارسی کو نہایت متانت اور غایت اتانت کے ساتھ کہتا ہے جو کہ نظر ہمت ان مقاصد عالیہ پر مقصود ہے۔ تدوین سخن کی طرف اصلا التفات نہیں ہے ورنہ ہر صنف شعر سے کئی دفتر مدون ہو جاتے"

زبان میں سادگی لطافت اور شستگی ہے۔ نمونہ کلام ؎

بے سبب ہر کس و ناکس سے لڑا کرتی ہیں
اپنی آنکھوں کو ذرا او بتِ پُرفن سمجھا

گن گن کے روز کرتے ہیں وہ عاشقوں کو قتل
ہر روز ان کے کوچہ میں روزِ شمار ہے

جو لذتیں ہیں قناعت میں حرص میں کب ہیں
نشہ جو کم ہو اسی کو سرود کہتے ہیں

پھرتا ہے چشم تر میں ہماری قدِ نگار
یہ قد ہے یا کہ سرو لبِ جو یبار ہے

زمانے کو بندہ کیا چاہتے ہو
بتو کیا خدا تم بنا چاہتے ہو

نسیم اس سے کہتا ہوں کہ بات کوئی
تو کہتے ہیں کیا کچھ سُنا چاہتے ہو

نفیس مولوی اشرف علی بدایونی

مولوی اشرف علی صاحب بدایوں کے مشہور اہلِ علم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت عبداللہ المعروف ابوبکر تک پہنچتا ہے۔ شجرہ خاندانی حسب ذیل درج کیا جاتا ہے۔

مولوی محمد اشرف علی نفیس بن مولوی نجف علی تحصیلدار ممتاز؛

بن مولوی علی داؤد اللہ زآر، بن مولوی علی ارشد بن اشرف العلماء مولوی علی اشرف بن قاضی علی مرتضیٰ بن قاضی علی امجد بن مولانا قاضی عبدالمجید، بن قاضی عبدالوہاب بن قاضی فضل اللہ بن سید الفقہاء مفتی محمد دانیال بن قاضی عبداللطیف بن شیخ الاسلام مولٰنا صدر العلماء قاضی صدر الدین بن مولانا فخر العلماء دیوان انشا ملک حمید الدین گنا آبادی سبزواری بن شیخ بدرالدین، بن شیخ شرف الدین الآمر، بن شیخ شرف الدین اللہ بن شیخ احمد الآمر بن شیخ عثمان الآمر، بن عمر الآمر بن محمود الآمر، بن علی المدنی الآمر، بن امیر عسکر الاسلام محمد الثانی بن حضرت محمد بن حضرت عبداللہ المعروف ابوبکر۔

مولانا اشرف علی کے دادا مولوی علی داؤد اللہ، تاریخ گوئی اور تاریخ دانی میں بے مثل تھے۔ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ سو برس کی عمر پائی تھی۔ نمونہ کلام ؎

آلودہ خاک سے کیا دامن نگار کا | کیا تنگ حوصلہ تھا ہمارے غبار کا
مدفن پہ اپنے شمع کی کب احتیاج ہے | ہے داغِ دل چراغ ہمارے مزار کا

مولوی اشرف علی صاحب کے والد ماجد مولوی نجف علی اپنے عہد کے بڑے ادیب، متبحر عالم اور صاحب تصنیف تھے۔ پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی میں تحصیلداری کے فرائض انجام دئے۔ اس کے بعد نواب محمد سعید صاحب والئی رام پور کے ہاں تحصیلداری پر مامور ہوئے۔ نواب ظہور اللہ نور بدایونی کے شاگرد تھے۔ آپ کی شادی آپ کے

حقیقی چچا کی بیٹی مسماۃ شمس النساء بنت مولوی علی صدیق اللہ بن مولوی علی راشد سے ہوئی آپ کے چار صاحبزادے مولوی محمد اشرف علی، محمد آصف علی، دولت علی، علی ابراہیم اور ایک دختر طاہر النساء ہوئیں تین صاحبزادے آصف علی، دولت علی، علی ابراہیم اوائل عمری میں فوت ہو گئے تھے۔ مولوی نجف علی صاحب رمضان المبارک ۱۲۷۱ھ کورام پور میں فوت ہوئے وہیں مدفون ہوئے۔ نمونہ کلام سے

جس کو میری طرح سے ہو کھینچنا مقصود رنج ٭ دل اسے دے جبکہ ہو دیر آشنا اور زود رنج
یاد آتا ہے جو وہ طرز طرار مجھے ٭ پیچ پر پیچ دکھاتی ہے شب تار مجھے

مولوی اشرف علی صاحب نے مولوی فضل رسول مست بدایونی سے علوم مروجہ حاصل کئے۔ عربی و فارسی کے ماہر تھے اور صاحب تصنیف بھی تھے۔ بیسیوں کتابیں رسالے عربی، فارسی اور اردو میں لکھے جو کچھ ایام غدر میں تلف ہوئے کچھ باقی رہ گئے۔ جو ان کے صاحبزادے مولوی محمد راشد علی مرحوم کے پاس رہے۔ راشد علی صاحب کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ ایک صاحبزادی تھیں یہ کتب کا ذخیرہ ان کے داماد مولوی علی اکبر حسین صاحب کے قبضہ و تصرف میں آئے۔ آپ کا ایک قلمی دیوان اور ایک قلمی مثنوی "خوان نعمت" منشی سلمان احمد صاحب صبا صبائی نواسہ مولوی اشرف علی صاحب کے پاس موجود ہے۔ مولانا اشرف علی صاحب نے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی میں تحصیلداری کی اور پنشن پائی۔ آپ نواب محمد سعید صاحب والئی رام پور

کے اساتذہ میں سے تھے۔ علم طب، حدیث کی تعلیم ان کو آپ نے دی نواب موصوف کی سرکار سے آپ کو خطابات اشرف العلماء، افضل العلماء عطا ہوئے۔

۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کے قریب ضلع بدایوں علاقہ روہیل کھنڈ میں بغاوت کی ابتداء ہوگئی تھی۔ یہ بغاوت گنگا کے داہنے کنارے کے نواحی علاقے سے پھیلی۔ محب وطن حضرات کے گروہ کے گروہ ایسے نکل پڑے جیسے کوئی چیز جادو کے زور سے پھیل جاتی ہے۔ سڑکوں پر لوٹ مار کرنا دیہات کو جلانا شروع کردیا تھا۔[۱] موضع بھٹہ گوشائیں میں ایک خربوزہ کی گاڑی کو دن دہاڑے لوٹ لیا۔ جب پولیس تفتیش کے لئے گئی تو اسے خوب زدوکوب کیا پولیس خوفزدہ ہوکر بھاگ آئی۔ موضع کنور پور کے ٹھاکروں نے ایک سرکاری سوار کو قتل کیا۔ موضع پیتر یا کے اہیروں نے دو سرکاری ٹھاکر زمینداروں کو جو موضع اسد پور کے باشندے تھے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان حالات کا اثر سارے دیہاتی علاقوں میں ہوا۔

شہر میں پھر بھی فضا پُرامن تھی اگرچہ دوسرے مقامات سے خبریں آرہی تھیں۔ ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو عید الفطر تھی۔ سرکاری فوجوں نے ولیم رودارڈس مجسٹریٹ بدایوں کو یہ اطلاع دی کہ مسلمان عید کی نماز پڑھ کر بلوہ کریں گے۔ وہ اس خبر سے متاثر ہوا۔ اس نے اثر لینے کے بعد کیا کارروائی کی۔ وہ اس مجسٹریٹ کی زبانی سنیئے۔ لکھتا ہے:۔

---

[۱] روزنامچہ مصائب غدر ص۱

"پیر کے دن مئی کی چھبیسویں تاریخ کو مجھ کو خبر ملی کہ شہر بدایوں کے مسلمان جو بتقریب نماز عید آج جمع ہوئے ہیں، دن ڈھلے ہنگامہ برپا کرانے والے ہیں اور اس کا انجام غالباً یہ ہوگا کہ شہر لوٹا اور تباہ کیا جائے۔ جتنے رئیس اور معتقدہ مسلمان اس شہر میں تھے میں نے جھٹ پٹ ان کو اپنے بنگلے پر ملاقات کے لئے بلوایا وہ لوگ فوراً چلے آئے۔ ان میں اکثر تو بہت درشت اور گستاخ اور سب کے سب نہایت برافروختہ حالت میں تھے۔ جب یہ لوگ بیٹھے اور میں نے ان سے بات کرنی شروع کی بتدریج وہ ٹھنڈے ہوئے اور میں نے ان کو باتوں میں لگا لیا اور ان کے ساتھ مباحثہ کرنے لگا۔ اور سب سے بڑھ کر تو یہ کیا کہ ان کو ایک دوسرے سے توڑ لیا کیونکہ یہ تو مجھ کو معلوم تھا کہ ان میں سے بہتیروں میں باہمی عداوت ہے۔ الغرض میں نے ایسا بندوبست کیا کہ ان کا خیال بانٹ دیا۔ یہاں تک کہ جو وقت ہنگامہ پردازی کے لئے مقرر تھا ٹل گیا۔ جو منصوبے ان لوگوں نے پہلے سے باندھ رکھے تھے اس وقت توڑ گئے اور مجھکو انتہائی خوشی ہوئی کہ وہ دن (وہ کتنا لمبا تھا) چپ چاپ گذر گیا۔"

مجسٹریٹ کی اس نازیبا حرکت سے کہ اس نے نماز عید پڑھنے نہیں دی اور "مداخلت فی الدین کا مرتکب ہوا"۔ انگریز کے خلاف نفرتی اور انتقامی

جذبہ کو اور شہ ملی۔ امراء اور معززین نے مصلحت کے پیش نظر سکوت اختیار کیا لیکن عوام میں ایک جوش و خروش پیدا ہوا۔

۲۷ مئی کو اس انتقامی جذبہ نے اپنا رنگ دکھایا۔ جس قدر انگریز شہر اور اطراف شہر میں تھے سب خوف و ہراس کی وجہ سے مجسٹریٹ کے بنگلہ میں جمع ہو گئے۔ ۲ جون کو بریلی سے ایک جماعت جو مجاہدوں کی تھی وہ بدایوں آئی۔ نمبر ۶۸ پلٹن جو خزانہ بدایوں پر متعین تھی اس نے خزانہ لوٹ لیا۔ جیل خانہ توڑا۔ پولیس والے وردیاں بدن سے اتار کر بھاگ گئے۔ چندھری سرائے۔ میراں سرائے، نئی سرائے، ناہر خاں سرائے، محلہ ابراہیم پور، محلہ شرقی اور موضع رسول پور کے لوگ بریلی سے آنے والی فوج کے ساتھ ہو گئے۔ مرزا منصور بیگ کی رہنمائی میں محلہ شرقی، محلہ ابراہیم پور وغیرہ کے لوگوں نے منصفی اور کوتوالی کے دفتر جلا دئیے۔ مرزا منصور بیگ رسالدار تھے۔

بریلی کی فوج نے انگریزوں کی تلاش کی۔ خالی بنگلوں کو نذر آتش کیا۔ ان کو معلوم ہوا کہ انگریز شیخو پورے میں ہیں وہاں پہنچے گوہر مقصود کو نہ پا کر بغیر کسی نقصان کئے لوٹ آئے۔

۱۷ جون ۱۸۵۷ء کو خان بہادر خاں نے عبدالرحمٰن خاں کو بدایوں کا ناظم مقرر کیا۔ اور شیخ فصاحت اللہ نائب ناظم بنائے گئے عبدالرحمٰن نے بدایوں میں آ کر ملازمان سابقہ کو ان کی جگہ پر بحال کیا مولوی تفضل حسین تحصیلدار، مولوی اشرف علی نفیس پیشتر تحصیلدار کو

ڈپٹی کلکٹر مقرر کیا۔ منشی ذوالفقار الدین سررشتہ دار فوجداری کو ڈپٹی مجسٹریٹ مولوی ریاض اللہ تحصیلدار بدایوں کو تحصیلدار بسولی پر مامور کیا اور محمود حسین کو جو نائب سررشتہ دار تھے سررشتہ داری پر ترقی دیگئی سیف اللہ خاں تحصیلدار کو فوجی افسر لگایا گیا۔ یاد اللہ خاں نے کوتوال شہر بننا منظور کیا اور ولی داد خاں نے رسالداری کی ذمہ داری قبول کی۔ چودھری تفضل حسین رئیس و محلہ چودھری اور صفت علی کمیدان لچھمن سنگھ او جھیانی کے تحصیلدار، بدایوں کے سپہ سالار فوج جنرل نیاز محمد خاں اور عظمت اللہ بخشی مقرر ہوئے۔

جولائی میں وصول مالگذاری کا کام شروع ہوا۔ سوائے موضع کہنک اور رفیع کے ٹھاکروں کے سب جگہ سے تقریباً مالگذاری وصول ہوئی خان بہادر خاں نے موضع ٹھیولی کے امراؤ سنگھ ٹھاکر کو داتا گنج کا تحصیلدار مامور کیا۔ مگر تحصیل کے ٹھاکروں نے خاندانی رقابت کی وجہ سے اس کی تحصیلداری قبول نہیں کی۔ اور متوازی حکومت قائم کر کے ہرلال سنگھ ساکن بلکیسا کو اپنا سردار مقرر کیا۔ اس نے اپنا نام "دھپو دھام" رکھا اور اپنی مُہر میں یہ سجع کندہ کرایا[1]

نیچے دھرتی اوپر رام مُہر کچہری دھپو دھام

ہرلال سنگھ راجپوتوں کو لے کر بدایوں کی غارتگری کیلئے فصیل شہر تک آیا۔ شہر کی سرحد پر لڑائی ہوئی۔ اور اس نے شکست کھائی جولائی اگست میں مال گذاری وصول کی گئی۔ اس میں کہیں کہیں جھگڑے

---

[1] کنز التاریخ صـ ۳۲۳

بھی ہوئے۔ جنرل نیاز محمد خاں نے ان کی سرکوبی کی۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۳۱ اکتوبر کو کپتان گول معہ اپنے دوست سرجنٹ میجر بیلکم اور اس کی بیوی بچوں کے پردہ نشین عورتوں کی طرح بیلوں والی گاڑی میں قادر گنج پہنچکر مسٹر ولسن سے ملا۔

یکم نومبر کو عبدالرحمٰن خاں ناظم نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور کچھلا پہنچا۔ ناظم کے پاس اس وقت چار ہزار مجاہدین تھے۔ گنگا کے ایک کنارے ناظم کی فوج اور دوسرے کنارے پر قادر گنج میں انگریزی فوج تھی۔ فریقین میں پندرہ بیس دن تک گولہ باری خوب دل کھول کر ہوئی۔ انگریزوں کی فوج کے قادر گنج کے رہنے والے ایک جمعدار غلام محمد خاں کی معرفت کسی طرح ولایت خاں اور شیخ جمال الدین خاں جو ناظم کی فوج کے آدمی تھے باہمی ملاقات ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ جمعدار صاحب دوسو آدمی لے کر ناظم کی فوج میں شامل ہو گئے۔ نہ معلوم ان لوگوں نے ناظم کی فوج پر کیا جادو کیا کہ وہ اودیہانی کی طرف لوٹ آئی ـــــ

خان بہادر خاں نے ۱۰ نومبر کو عبدالرحمٰن خاں کو معزول کر کے ان کی جگہ مبارک شاہ کا تقرر کیا۔ اور احمد شاہ خاں کو نائب مقرر کیا۔ جنرل نیاز محمد خاں نے انگریزوں کے حامی تحصیل گنور کے اہیروں کی سرکوبی کے لئے چڑھائی کی۔ ضلع مرادآباد کے ٹھاکروں کی اعانت سے موضع بہرائیوئی جو اہیروں کا گڑھ تھا سرہو گیا۔

تحصیل کے اہلکاران مال و پولیس انگریز کے ایجنٹ جواب تک موجود تھے وہ سب جنرل نیاز محمد خاں کے خوف و ہیبت سے بھاگ گئے۔ اب سارا ضلع بدایوں نواب خان بہادر خاں کے زیر نگیں تھا۔

جنرل نے اب غداروں کی طرف توجہ دی۔ شروع فروری ۱۸۵۸ء میں ایک سب انسپکٹر پولیس کو کپتان گون کی اعانت کرنے کی پاداش میں سزائے موت دی۔ فروری اور مارچ کا زیادہ وقت انگریزوں کے مخبروں کی تلاش اور سزادہی میں صرف ہوا۔ مخبروں اور دشمنوں کے پناہ دینے کے سلسلے میں قادر گنج کے ایک حصہ میں آگ لگانی پڑی جہاں ایسے غدار ملک و قوم چھپے ہوئے تھے۔[1]

اس قابل رشک حالت کو دیکھ کر اور مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خاں کی بدایوں میں آمد کے بعد جبکہ ککرالہ مجاہدوں کا مرکز بن گیا تھا سے متاثر ہو کر انگریز نے ککرالہ پر حملہ کیا۔ اس کی پوری روداد مولانا فیض احمد رسوا بدایونی کے حالات میں پڑھیئے۔ بدایوں میں قبضہ ہونے کے بعد ککرالہ اور مقامات پر جو حشر برپا ہوا۔ اس کی مختصر داستان یہ ہے:۔

بدایوں کی شکست سے ان کے موضع کے لوگوں پر اثر پڑا جس سے متاثر ہو کر قصبہ اسلام نگر کے باشندے بابو رام نرائن وکیل اور مخدوم بخش قریشی کی قیادت میں اپنے رفقاء کار شہامت علی، ناصر علی، منیر خاں اور دھن سنگھ کے ساتھ مجتمع ہوئے۔ ان لوگوں کا وقت انگریزوں کے کاسہ برداروں سے مقابلہ میں زیادہ صرف ہوا۔ جن کا سرگروہ دارا سنگھ ٹھاکر

---

[1] مضمون محمد سلیمان صاحب سابق آنریری مجسٹریٹ بدایونی۔ الجمعیۃ ۲۴ ستمبر ۱۹۵۶ء

ساکن بیرول تھا۔ ان لوگوں نے متعدد حملے رام نرائن اور ان کے ساتھیوں پر کئے مگر سب ناکام ہوئے۔ انگریزوں کو فکر ہوئی ان کی فوج دوسری طرف مصروف تھی۔ کمشنر صاحب نے نواب رام پور سے خواہش ظاہر کی کہ آپ اپنے ملازموں سے وہاں کا بندوبست کرائیں۔ چنانچہ نواب صاحب نے ایک فوج حکیم سعادت علی خاں کی کمانڈ میں اسلام نگر کے لئے مراد آباد سے روانہ کی۔

۲۹ رمئی ۱۸۵۸ء کو رام پور کی فوجوں نے حملہ کیا۔ لڑائی ہوئی رام نرائن کے پاس توپیں تھیں۔ فریقین میں خوب گولہ باری ہوئی۔ وکیل صاحب میدان جنگ میں گولیوں کا نشانہ بنے۔ تین توپیں اور بہت سامیگزین حکیم صاحب کے ہاتھ آیا۔ وصول مالگذاری اور دوسرے انتظامات حکیم صاحب کے سپرد ہوئے۔[۱]

۳ر جون کو بریگیڈ کلک نے مع ایک دستہ فوج کے لکرالہ پہنچکر پھانسیاں دیں۔ وہاں اناج وغیرہ جلایا۔ لکرالہ بالکل ویران ہو گیا۔ دوست آشنا اہل لکرالہ سے باتیں کرتے گھبراتے اور کسی اعانت وامداد کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ تین مہینے دربدر کے دھکے کھا کر پھر لوگ لکرالہ میں جا بسے ایشری پرشاد مخبر کی اطلاع دہی پر فوج دوبارہ لکرالہ آئی اور دار وگیر شروع ہوئی۔ تیسری مرتبہ بھی انتقامی کارروائی کی۔ چوتھی مرتبہ جنرل بینی کی مہیم آئی اس نے لکرالہ کو کانگڑہ باد کہہ کر سارے قصبہ کو کھدوا کر تالاب کرا دینے کی خواہش کی مگر ایسا نہیں ہوا ۱۹۱۴ء تک لکرالہ کے

---

[۱] اخبار الصنادید سوم صفحہ ۹۴

لوگوں کو انگریزی ملازمت نہیں دی جاتی تھی۔ قصبہ کے سربرآوردہ اشخاص جنھوں نے اس تحریک آزادی میں حصہ لیا پہلوان منگل خاں رستم خاں، غلامی خاں، سردار خاں، محمد خاں، امان خاں، جہانگیر خاں دلاور خاں، واصل خاں، فوجدار خاں وغیرہ وغیرہ تھے۔

دوسرے دن فوج کے دستے مراد آباد سے ہوتے ہوئے گاؤں کو تباہ کرتے ہوئے سہسوان پہنچے۔ وہاں پر بہت سی گرفتاریاں کی گئیں مولانا سید نیاز احمد ولد سید آل احمد مودودی جنھوں نے مولانا سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی اور ان کے ساتھ شریک جہاد تھے۔ وہ سہسوان کی تحریک آزادی میں شریک ہوئے انکو گولی کا نشانہ بنایا۔

جنرل کلارک اسلام نگر بھی پہنچا جس پر بابو رام زائن کے ساتھی ہونے کا شبہ ہوا اس کو انتہائی سخت سزائیں دی گئیں۔ اسلام نگر میں چند گھر سادات اور کمبوہوں کے تھے۔ سادات کا ایک امام باڑہ تھا کسی مخبر نے کہہ دیا کہ سید محب علی متولی امام باڑہ نے مشہور فتوے جہاد پر دستخط کئے تھے۔ امام باڑہ کھدوا دیا گیا۔ سید صاحب کو گولی مار دی گئی۔

بدایوں کے ضلع کے اکیس اشخاص کے گولیاں ماری گئیں ان میں مولوی تفضل حسین تحصیلدار، مولوی اشرف علی تحصیلدار، النفیس بدایونی مولوی ماجد علی تحصیلدار، مولوی رضی اللہ تحصیلدار، منشی ذوالفقار الدین سررشتہ دار اور بدر الاسلام صاحب مشہور عباسی بدایونی بھی تھے۔

سید محمد شاہ اور ان کے داماد شیخ بچا پنجابی سوداگر ساکن محلہ چاہ میر

کے ساتھ ایک سو سترہ اشخاص کو پھانسیاں دی گئیں۔

چار اشخاص کو بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ یہ چاروں ایک ہی گھر کے تھے۔ شیخ فصاحت اللہ نائب ناظم، شیخ سلیم اللہ وکیل، شیخ آیت اللہ وکیل تینوں بھائی تھے۔ شیخ فضل احمد بھتیجے تھے۔ کسی عام معافی کی بنا پر یہ لوگ انڈمان سے واپس ہوئے مگر شیخ فصاحت اللہ کو وطن دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ راستہ میں انتقال ہو گیا تھا۔

ایک سو چھبیس اشخاص کو قید اور دو سو ستر اشخاص کو بید کی سزا دی گئی۔ جو میں مسلم مواضعات اور چار سو پانچ قطعات اراضی ضبط ہوئے پانچسو چھتیس مکانات اور دس ہزار پانچسو چھبیس روپے کا زیور ضبط کیا گیا۔[۵]

نفیس صاحب قادر الکلام شاعر تھے۔ اردو، فارسی، عربی میں ان کے دیوان تھے۔ ایک تذکرہ شعراء اردو "انتخاب دہر" ان کی یادگار ہے۔ طبیعت عالی رکھتے تھے۔ نواب ظہور خاں نوا بدایونی سے مشورۂ سخن کیا تھا۔

تم اگر جنبشِ ابرو کی دکھا دو گے ادا — ایک بے جرم پہ چل جائینگی شمشیریں دو

دونوں نقشوں میں تری ہے دلِ وحشی میرا — ایک دیوانے کی گردن میں ہیں زنجیریں دو

چاہنے والے کو رسوا کرو یا قتل کرو — ہے گنہگار جو چاہے وہ تعزیریں دو

غیروں سے تمہیں پیار جتانا نہیں اچھا — ہنس ہنس کے ہمیں یاد دلانا نہیں اچھا

دیوار تلے بیٹھے ہیں مت گالیاں دو تم — اس طرح فقیروں کا اٹھانا نہیں اچھا

دل گھر ہے خدا کا نہ اسے توڑیو ہرگز
واللہ کہ کعبہ کا گرانا نہیں اچھا

۵؎ [illegible] ۳۵۳ [illegible] ۲۴۳

مدتوں آپ میں آنا ہوا مشکل اس کو
جس نے اس آفتِ دوراں کو مچلتے دیکھا

زلف برہم تری مجموعِ پریشانی ہے
جس پہ بکھرے وہ پھر اسکو نہ سنبھلتے دیکھا

باغ میں اب رہا نہیں جاتا
گل کا ہنسنا سہا نہیں جاتا

ہوا جاتا ہے دل قلم کا چاک
غمِ ہجراں کہا نہیں جاتا

رحم اس کو ذرا نہیں آتا
اب تو صبر اے خدا نہیں آتا

عاشق و معشوق کے ملنے پہ جب پیار آگیا
سینۂ گل، دیدۂ بلبل بہم چومیں گے ہم

حضرتِ دل کعبہ سے بہکا کے لائے دیر میں
پیرِ مرشد آپکے اب تو قدم چومیں گے ہم

مر رہا ہوں غمِ جدائی سے
اب تو باز آؤ بے وفائی سے

مزا اے درد دکھلایا تو ہوتا
ارے بے درد تڑپایا تو ہوتا

مبارک مرغِ دل وہ آبِ خنجر
تڑپنے میں مزا پایا تو ہوتا

گیا ہے آپ سے باہر نفیس آج
کوئی اس کو بلا لایا تو ہوتا

ساقیا ہم نے مے عشق کا سب جام لیا
لبِ ساغر سے ترا بوسہ بہ پیغام لیا

دل مرا قطرۂ خوں ہو کے بہا جاتا تھا
چشم نے پنجۂ مژگاں سے اسے تھام لیا

عشق خوباں سے ہوئے خلق میں بدنام نفیس
ہم نے ناحق نہیں دل دیکے یہ الزام لیا

شامِ غربت میں نہیں صبحِ وطن کی امید
جیتے جی دیکھیے کب وقتِ سحر آئے گا

یہاں تلک پہنچا ہے حال اب ترے سودائی کا
غم نہ بدنامی کا ہے، پاس نہ رسوائی کا

اے آہِ جگر سوز نہ آیا وہ نہ ہے، تف
عاشق ہوں میں واللہ تری بے اثری کا

گل کھلے تختۂ دل پر تو میں سمجھا ہی بہار
بلغ امید خزاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

اے شمع رو جلانہ ہمیں سُن غم فراق
یہ عاشقانِ زار کا سوز و گداز ہے

عشق بتاں سے ان دنوں دل سیر ہی نفیس
اس خاکسار پر کرم کارساز ہے

رات دن ہجر میں ہم خاک بسر کرتے ہیں
زندگی کیا ہی مصیبت میں بسر کرتے ہیں

جب تصور ترا اے رشکِ قمر کرتے ہیں
کیا ہی حسرت سے سوئے چرخ نظر کرتے ہیں

مولوی اشرف علی صاحب کی شادی آپ کی حقیقی پھوپی کی بیٹی مسماۃ اختر النساء بنت مولوی تفضل حسین صاحب بن مولوی علی خلیل اللہ سے ہوئی۔ ان کے پانچ صاحبزادے مولوی محمد ارشد علی، مولوی محمد راشد علی، محمد رشید علی، مشرف علی اور محمد اکرام علی اور دو صاحبزادیاں مسماۃ وحیدہ خاتون، سعیدہ خاتون ہوئیں۔

مولوی راشد علی ضیاؔ تقریباً ۱۲۶۶ھ میں پیدا ہوئے۔ بڑے جید عالم، معقولات و منقولات پر حاوی تھے۔ جناب میر خورشید علی صاحب نفیسؔ لکھنوی اور جناب سید اسمٰعیل صاحب منیرؔ شکوہ آبادی کے تلامذہ میں تھے۔ فرماتے ہیں ؎

شعر دل میں کیوں نہ جلوۂ فیضِ منیرؔ ہو
کس مہر باصفا سے ضیاؔ مستفید ہے

آپ ۲۱ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ مطابق ۲ فروری ۱۸۹۱ء کو فوت ہوئے۔ مسجد المومنین قاضی ٹولہ بدایوں میں آپ کی قبر ہے۔ آپ کا قلمی دیوان بھی منشی سلمان احمد کے پاس ہے جو میری نظر سے

گزرا۔ مولوی راشد علی کا تخلص ضیا تھا۔ کلام میں بلاغت پائی جاتی ہے
فصاحت کے بھی جوہر کہیں کہیں دیکھنے میں آتے ہیں۔ کلام میں اثر ہے۔ زبان
سلیس، صاف ہے۔ نمونہ کلام ؎

یہی ہم ہوں یہی تم ہو یہی دلشادی ہو
جان بن کسکو دلہن کہتے ہیں دولہا کیسا

کھڑے ہو گور غریباں میں کس گمان سے دور
یہ سب تمہیں پہ مرے ہیں تمہاری جان دور

فرقت قبول ہے انہیں لیکن نہ آئے غیر
اچھا تو ہے جو موت کا وعدہ وفا نہ ہو

غیروں میں خوب لٹتی ہے دولت شباب کی
دیکھو کسی فقیر کی یہ بددعا نہ ہو

منظور ہے کہ دیکھیں ترے منہ کو دیر تک
محشر میں سب کے بعد ہمارا حساب ہو

خلوت کا ہے یہ لطف کہ ہم تم ہوں جس جگہ
غمزہ نہ ہو، اشارہ نہ ہو گفتگو نہ ہو

جفا نہ کیجئے گا صرف بوسہ دیجئے گا
سمجھ تو لیجئے گا آرزو ہے کیا میری

بدایوں کی تحریک آزادی ۱۸۵۷ء میں مولوی اشرف علی صاحب
نفیس کے ساتھ جو حضرات بدایوں، اسلام نگر، ککرالہ اور سہسوان میں
شہید ہوئے تھے ان کے بھی مختصر حالات ملاحظہ کیجئے۔

(۱) **مولوی رضی اللہ** بدایوں کے شیخ صدیقی تھے۔ مولوی صاحب
نے کارمیکل کو پڑھایا تھا۔ جب وہ گرفتار ہو کر ان کے سامنے پیش ہوئے تو
مولوی صاحب سے تحریک آزادی میں حصہ لینے کے بارے میں دریافت کیا
انہوں نے صاف الفاظ میں شرکت تحریک کا اقبال کیا۔ کارمیکل کو اپنے
استاد سے ہمدردی بھی تھی اس لئے انہوں نے مقدمہ ملتوی کر کے [illegible] جب

کو کہلا کر بھیجا کہ وہ جرم سے انکار کر دیں تو رہا کر دئے جائیں گے مگر دوسرے روز پیشی میں پھر مولوی صاحب نے اقبال جرم کیا اس پر کلکٹر صاحب کو مجبوراً سزائے موت کا حکم دینا پڑا۔ پھر جبکہ اس حکم کی تعمیل میں بندوق سے گولی مارنے کا وقت آیا تو کارمیکل صاحب اپنے جذبات کو ضبط نہ کر سکے اور مولوی صاحب سے رو کر کہا کہ اب بھی تحریک کی شرکت سے انکار فرما دیں تو آپ موت سے بچ جائیں گے۔ اس کا جواب مولوی صاحب نے بڑی ترش روئی کے ساتھ دیا۔ کہ میں تمہاری وجہ سے اپنا ایمان اور اپنی عاقبت خراب کر لوں اور یہ کہہ کر خندہ پیشانی سے جان دے دی[1]

(۲) **منشی ذوالفقار الدین** کے والد وہاب الدین تھے یہ بدایوں کے متولیوں کے خاندان سے تھے۔ یہ بھی کارمیکل کے سامنے جوابدہی کے لئے پیش ہوئے۔ انہوں نے تحریک آزادی کے دوران میں خان بہادر خاں کی اعانت کی تھی۔ منشی صاحب نے کارمیکل کے سامنے خان بہادر خاں کی اعانت کرنے کا اقرار کیا۔ اس پر کارمیکل نے ان سے ہر چند کہا کہ تم اس سے انکار کر دو۔ مگر منشی صاحب نے صاف الفاظ میں کہا۔ انگریزوں کی عملداری اٹھ گئی تھی اس لئے خان بہادر خاں کی اعانت کی تھی۔ اس واقعے سے کیسے انکار کر سکتا ہوں چنانچہ وہ بھی گولی سے مار دئے گئے۔

آپ کی تاریخ شہادت حسب ذیل ہے ؎

کی بغاوت ہوئے قتل آہ　　　　شہادت کا رتبہ ملا بالیقین

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۳۲

مجھے فکر تھی ان کی تاریخ کی | کہ ہاتف نے مجھ سے کہا اے ذہیں
یہ مظلوم و بیکس کی تاریخ ہے | ہوا مسند آرائے خلد بریں
۱۲۷۴ھ

(۳) سید محمد شاہ ولد سید حیدر علی سرائے کی سادات میں سے تھے۔ یہ محلہ بدایوں کا ہے مگر حدود میونسپل کمیٹی سے باہر ہے۔ سادات کے دو گروہ ہیں ایک مذیدی سید، دوسرے خضر خانی۔ سید محمد شاہ کا تعلق خضر خانی سادات سے ہے۔ یہ لوگ سید علاء الدین جو آخری سید بادشاہ تھا وہ بدایوں میں سکونت پذیر ہو گیا تھا اسکی نسل سے ہیں۔

سید محمد شاہ بریلی کے مفتی محمد عوض کے نواسے تھے جن کی شہرت علاوہ ان کی علمی قابلیت ولیاقت، اپریل ۱۸۱۶ء کے ہنگامے کی وجہ سے ہوئی تھی جو ۱۸۱۴ء کے ریگولیشن ہاؤس ٹیکس پر حکومت سے ہوا تھا۔

سید صاحب کی صرف ایک لڑکی حسینہ نامی تھی۔ شام کو اس کا نکاح ہوا۔ صبح کو محمد شاہ مع داماد کے گرفتار ہو کر گولی سے اڑا دیئے گئے۔ سید صاحب نے عین نماز میں جان دی۔

(۴) مولوی شاہ سید نیاز احمد کی پیدائش ۱۲۳۳ھ میں ہوئی۔ آپکے والد ماجد خواجہ سید آل احمد شاہ بن حضرت ہزبر بیشہ ولایت تھے۔ آپ اپنے منجھلے بھائی مولانا سراج احمد سے تین سال عمر میں چھوٹے تھے اور اپنی دو بہنوں اور ایک بھائی سے بڑے تھے زہد و تقویٰ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اس لئے بڑے بھائی

تک آپ کا ادب کرتے تھے اور آپ کی صائب رائے اور ہر مشورہ کو قابل عمل سمجھتے تھے۔ تحصیل علوم درسیہ لکھنؤ و دہلی میں کیا اور طلبہ علم کو درس دیا۔ فنون سپہ گری ومشق تیر اندازی، شمشیر زنی اور شہسواری میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ حضرت مولانا سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی اور شریک جہاد ہوئے۔ پھر وطن تشریف لے آئے۔ حضرت والد ماجد کے دست مبارک پر بطریق صوفیہ بیعت کر کے مشغول طاعت وذکر وفکر مجاہدہ نفس وتزکیہ قلب ہوئے۔ اتقاء و ورع میں عالی درجہ رکھتے تھے نفاست پسندی وخودداری میں بے مثل تھے۔ تحریک آزادی میں ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں ۳۹ سال کی عمر میں شربتِ شہادت نوش فرمایا۔ دست مبارک میں تسبیح اور لب پر کلمہ شہادت تھا۔ تاریخ شہادت یہ لکھی گئی۔ یہ رباعی تھی [1]

شہادت یافت چوں سبط پیمبر — نیاز احمد کہ بود از آل احمد
چوں روح پاک او در جنت آسود — دخولِ خلد، تاریخش بر آمد

مزار مقدس خطیب محلہ میں کنکر کا بنایا گیا تھا۔ آپ کے خلف مولوی سید غفور احمد صاحب نہایت لائق فن ریاضی کے ماہر خوش نویس تھے۔ ریاست بھوپال میں تحصیلدار بلقیس گنج رہے اور وہیں ۱۲۹۶ھ میں ۳۷ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

(۵) جنرلِ نیاز محمد خاں نہایت بہادر اور دلیر شخصیت کے آدمی تھے۔ ۱۹؍ اپریل کی شکست کے بعد بدایوں چھوڑ کر بریلی چلے

---

[1] حیوۃ العلماء صـ ۵۳

گئے تھے وہیں کچھ دنوں رہے۔

جنرل نے اپنے زمانہ قیام بدایوں میں ایک مقامی شخص سے ایک گھوڑا خریدا تھا۔ اس کو خیال ہوا کہ انگریز کا دور دورہ ہو گیا ہے پکڑ دھکڑ جاری ہے۔ لوگ پرانی دشمنیاں نکال رہے ہیں، اور گرفتار کرا رہے ہیں۔ خدا جانے میں بھی دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے مصیبت میں گرفتار نہ ہو جاؤں وہ غریب شہر چھوڑ کر جانے لگا جنرل کو معلوم ہوا تو اس نے اس کو اس کا گھوڑا واپس کر دیا۔ اور قیمت کے متعلق اس سے ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لایا۔

جنرل بریلی سے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں نواب جوناگڑھ کی ملازمت کی۔ بمبئی کسی ضرورت سے چلے گئے تھے۔ گورنر جنرل کا قیام تھا وہاں پہچان لئے گئے۔ انگریز کے پنجہ میں آئے۔ مقدمہ بدایوں میں چلا۔ مسٹر ایم ڈبلیو سنڈس کلکٹر بدایوں جو سنہ ۱۸۷۳ء سے سنہ ۱۸۸۱ء تک رہا اس نے مقدمہ چلایا۔ حکومت کی جانب سے مقدمہ کی پیروی مسٹر کارمیکل نے کی جو اس وقت بورڈ آف ریونیو کے ممبر تھے۔ صفائی کی طرف سے مولوی طفیل احمد وکیل خلف مولوی رضی اللہ صاحب شہید فرنگ نے پیروی کی۔

جنرل نیاز محمد خاں کو عدالتِ ماتحت سے سزائے موت کا حکم ہوا۔ عدالت عالیہ میں اپیل ہوئی۔ سزائے موت کا حکم حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل ہو گیا۔ انڈمان بھیج دئے گئے۔

وہیں پیوند خاک ہوئے [1]

(۶) **مولوی تفضل حسین قاضی ٹولہ**، حکیم تفضل حسین صاحب مولوی ٹولہ اور چودھری تفضل حسین صاحب سرائے بدایوں پر مقدمات چلے۔ تینوں پر بغاوت کا الزام تھا۔

چودھری تفضل حسین ولد چودھری محمد عظیم فاروقی، انگریز کے تسلط ہونے پر، روپوش ہو گئے۔ ایک گھوڑے پر سوار جنگلوں میں گھومتے پھرتے، آبادی میں جاکر کھانے کا بندوبست کراتے۔ گھر، جائداد وغیرہ سب نیلام ہو گئی۔ عام معافی میں ظاہر ہوئے کچھ پوچھ گچھ نہیں ہوئی۔ ۱۸۹۲ء میں انتقال ہوا۔ اس خاندان کی بڑی ریاست تھی وہ ختم ہوئی۔

حکیم تفضل حسین پر مقدمہ چلا۔ انھوں نے رہائی پائی۔ مولوی تفضل حسین بغاوت کے جرم میں گولی کی ضرب سے شہید کئے گئے۔

(۷) بید کی سزا میں صرف ایک نام شیخ مسیح الدین ولد شیخ غلام محمد کا نام معلوم ہوا ہے۔ غدر سے قبل مختاری کرتے تھے۔ الزام بغاوت میں گرفتار ہوئے۔ ساٹھ بید لگے۔ آخری ضرب بید پر الا اللہ کہا۔ اس پر بدبخت نے دس بید اور لگوائے، بیہوش ہو گئے۔ ۱۹۱۲ء میں انتقال ہوا۔

ہادی مولانا امام الدین سنبھلی

مولوی منشی امام الدین ہادی ابن شیخ بدرالدین ابن شیخ حیات الدین

---

[1] [illegible]

سنبھل کی شیخوں کی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نسلی سلسلہ شیخ ابو الفضل فیضی سے ملتا ہے۔ منشی امام الدین صاحب مرحوم نے دہلی کے لال قلعہ میں منشی فرحت اللہ صاحب سے تربیت حاصل کی تھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل دہلی سے سنبھل چلے گئے تھے اور مراد آباد میں وکالت شروع کر دی تھی۔ ان کا مکان و دفتر محلہ لوہا گڑھ میں تھا۔

جناب ہادی انتہائی ذہین وکیل تھے۔ ان کا ایک مشہور واقعہ ہے جو سنبھل کے پرانے لوگوں کی زبانوں پر اب تک ہے:- ایک مقدمہ کسی عدالت میں پیش ہوا۔ آپ نے اپنے موکل کی طرف سے وکالت کرنے کی بجائے دوسرے فریق کی طرف سے بحث کرنی شروع کر دی۔ ان کا موکل متعجب ہوا۔ اس نے ان کے کان میں کہا کہ آپ میرے وکیل ہیں مجھ سے فیس لی ہے اور میری مخالفت میں بول رہے ہیں۔ یہ فقرہ سن کر جناب ہادی چونکے ہوئے اور تھوڑی دیر کے بعد بحث کا رُخ پلٹتے ہوئے عدالت سے مخاطب ہوئے کہ جناب یہ تمام دلائل مخالف کا وکیل پیش کر سکتا ہے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں۔ جن کا جواب یہ ہے۔ چنانچہ انہی دلائل کا جواب معقول دیا۔ اور عدالت سے اپنے موکل کے حق میں فیصلہ کرایا۔

تمام ہندوستان میں جہاں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی

چنگاری پھیل چکی تھی وہاں روہیل کھنڈ کا علاقہ بھی اس کی زد میں آیا۔ مراد آباد میں مجاہدوں نے علمِ بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ سنبھل کیسے بچ سکتا تھا۔

۱۵ جون ۱۸۵۷ء کو مجاہدوں کی ایک جماعت نے تحصیل بلاری کو لوٹ لیا تھا اور گاؤں کے رہنے والوں نے اُن کا ساتھ دیا۔ اور چند دیسی و سنبھل میں لوٹ مار کی گرم بازاری کی اور انگریزوں کا قلع قمع کیا۔ انگریز کے پٹھو نواب یوسف علی خاں والئی رام پور نے اپنی فوجیں سنبھل بھیجیں۔ جو بے اثر رہیں۔ لیکن صاحب اخبار الصنادید کی تحریر کے مطابق نواب رام پور کی فوج مجاہدوں کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوئی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"۱۵ جون کو سنبھل میں فساد شروع ہوا۔ موضع لکھوری کے جاٹ جن کے سرغنہ صاحب سنگھ اور چھدو تھے۔ اور ہیرا پور کے میواتی اور بلال پور کے مولویوں نے مل کر سنبھل کا بڑا حصہ لوٹ لیا۔ مولوی حامد علی تحصیلدار سنبھل اور ابن علی کوتوال بخوفِ جان مراد آباد چلے آئے تھے۔ خانساماں وزیر علی سنبھل کے ناظم مقرر ہوئے۔ ان کا وطن سنبھل تھا اس لئے ذاتی واقفیت اس جگہ کی ان کو زیادہ تھی۔ جو لٹیروں اور رہزنوں نے وہاں طوفانِ بے تمیزی

برپا کر رکھا تھا، خانساماں وزیر علی کی حکمتِ عملی نے اس کو دفع کیا۔ صاحب سنگھ وغیرہ ذلت کے ساتھ پسپا ہوئے اور اس کے مسکن کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ سنبھل کے علاقہ میں ہر جانب فوج وغیرہ بھیجکر انتظامی حالت درست ہو گئی۔ جن لوگوں پر لوٹ مار کا ثبوت ہوا ان کو سخت سزائیں دی گئیں۔ جن پہ جُرم قتل ثابت ہوا وہ عبرت کے واسطے توپ سے اُڑائے گئے۔"[1]

اخبار الصنادید کے مؤلف حکیم نجم الغنی رام پوری نواب رام پور کے نمک خوار اور انگریزوں کے بہی خواہ تھے۔ انہوں نے مجاہدوں کی شان میں جو الفاظِ نازیبا استعمال کئے ہیں ان کو انکی خوشامد سمجھئے۔ خوشامدیوں کا انداز تحریر ایسا ہی ہوتا ہے۔

اپریل ۱۸۵۸ء میں فیروز شاہ نے خان بہادر خاں کی امداد و اعانت سے سنبھل پر حملہ کیا۔ اور سنبھل اپنے زیر نگیں کر لیا۔[2] اس وقت منشی مولوی امام الدین صاحب نے شاہزادہ فیروز شاہ کا ساتھ دیا۔ ان کی تمام فوج کی دعوت کی۔ فیروز شاہ ۲۱ر اپریل کو مراد آباد چلے گئے اور نواب رام پور کی فوج کو شکست دیدی۔ اور شہر پر کچھ دنوں قبضہ کیا۔ اس کے بعد وہاں سے چلے گئے۔ انگریزوں کا جب پورے مراد آباد پر قبضہ ہو گیا تو اس وقت

---

[1] اخبار الصنادید دوم صفحہ ۵۵ [2] گزیٹر مراد آباد صفحہ ۱۲۵

مولوی امام الدین صاحب ہادیؔ کو انگریزوں کی فوج نے گرفتار کیا اور پھانسی دی۔

جناب ہادیؔ علوم دینیہ سے پوری طرح واقف تھے اور اپنے دَور کے مشہور عالموں میں سے تھے۔ فن شعر میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ہادیؔ تخلص تھا۔ بقول منشی معین الدین صاحب سنبھلی نبیرۂ مولوی امام الدین صاحب ہادیؔ، حسب ذیل شعر جناب ہادیؔ کا ہے۔ ؎

جو رحمت کی ہے آدم پر تو ہادیؔ کو بھی بخشے گا
وہ تیری شانِ غفاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

جناب ہادیؔ کے تین صاحبزادے منشی حمید الدین، منشی عنایت اللہ اور حمایت اللہ صاحبان تھے۔ منشی حمید الدین صاحب کے پانچ صاحبزادے منشی معین الدین، منشی وحید الدین، منشی فرید الدین، منشی نورالدین اور منشی ظہور الدین ہوئے۔ جن میں منشی نورالدین اور وحید الدین صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ بقایا تینوں صاحبزادے سنبھل میں حیات ہیں اور باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں گڈھ مکتیشر کے فرقہ وارانہ فسادات میں مولوی نورالدین صاحب جو پرانے کانگریسی اور کانگریس کے صدر اور جمعیتی تھے معہ خاندان کے شہید ہوئے۔

(ضمیمہ)

"۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" کی کتابت ختم ہونے کے بعد میرے والد ماجد حضرت مولانا شرف الحق صاحب صدیقی مرحوم کے کتب خانہ میں سے ایک قلمی کتاب مصنفہ حبیب اللہ ولی اللہی جس میں مرزا غالب، مومن، ذوق اور حضرت مولانا امام بخش صہبائی شہید فرنگ کے حالاتِ زندگی اور کلام درج ہے اس میں فردوس علی خلش، محمد یعقوب نسیم، حافظ غلام احمد نگہت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ تینوں مولانا امام بخش صہبائی مرحوم اور انکے ساتھیوں کے ہمراہ شہید ہوئے۔ اس لئے ان تینوں شہیدوں کے حالات پیش کئے جا رہے ہیں۔ صابری

خلش۔ حافظ فردوس علی۔ دہلوی

حافظ فردوس علی صاحب عبد الحکیم بسمل برادر زادہ حقیقی مولٰنا امام بخش صہبائی شہید فرنگ کے ماموں کے لڑکے تھے[1] دس برس کی عمر میں قرآن مجید ختم کر لیا تھا۔ انتہائی ذہین تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں کتب نظم و نثر کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تھے۔ شعر گوئی شروع کی تھی۔ ابتدائی مشق کا زمانہ تھا۔ کلام مولانا امام بخش صہبائی مرحوم کے صاحبزادے مولوی عبد الکریم سوز کو دکھاتے تھے[2] بقول صاحب خم خانہ جاوید کہ جناب خلش ایام غدر میں زندہ تھے صحیح نہیں ہے[3] بلکہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولٰنا امام بخش صہبائی کے ساتھ آپ بھی جمنا کے کنارے فرنگیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے (۱۹) نمونہ کلام ہے

---

[1] گلستان سخن صفحہ ۲۱۶ [2] سخن شعراء صفحہ ۱۵۰ [3] خم خانہ جاوید سوم صفحہ ۳۰

کیوں نہ چھوڑا بہار میں صیاد | میری منظور گر رہائی تھی
ضعف سے لب پہ تھم گئے نالے | ورنہ آفت فلک پہ آئی تھی
کچھ اثر تھا نہ آہ سے منظور | یہ بھی اک طبع آزمائی تھی

کیا مزے سے خلش گذرتی تھی
جب کہ اس بت سے آشنائی تھی

نسیم۔ محمد یعقوب۔ دہلوی

محمد یعقوب حافظ غلام احمد کے فرزند اور عبد الحکیم بسمل کے خواہر زادے تھے۔ سترہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے[1] جبکہ فارسی کی تحصیل کر رہے تھے مولانا امام بخش صہبائی کے صاحبزادے مولوی عبد الکریم سوزؔ دہلوی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ بیس برس کی عمر میں مولانا صہبائی کے ساتھ شہید ہوئے۔[2] نمونہ کلام سے

چرخ رہتا ہے گردشوں میں مدا | یہ بھی گویا غبار ہے اپنا
عشق کس طرح چھوڑ دوں ناصح | یہ کوئی اختیار ہے اپنا
نہ اٹھاؤ نسیم کو در سے | جانیو خاکسار ہے اپنا
جو چرخ سے آفت کوئی آئی سو مجھی پر | جو درد اٹھا سو وہ مرے دل کے قریں تھا
عشاق پہ تو نے جو کئے ہیں ستم ایجاد | انصاف سے کہہ لو کہ یہ ظلم کہیں تھا
کوئی بنتی ہے اس طرح کی سدا | ایک نہ ایک پر لڑائی ہے
ہو گئے خاک ہم ولے ظالم | دل میں تیرے غبار ہے اب تک
جاں بہ لب ہے نسیم دل خستہ | پر ترا انتظار ہے اب تک

---

[1] گلستان سخن صہ۱۶۱ [2] سخن شعراء صہ۵۲۱

نکہت ۔ حافظ غلام احمد دہلوی

حافظ غلام احمد صاحب مولانا امام بخش صہبائی کے قریبی رشتہ دار تھے۔ کتب درسیہ فارسی عروض اور قوافی مولٰنا صہبائی سے پڑھیں[1] فارسی اور اردو میں کلام کہتے تھے۔ جناب مرزا قادر بخش صابر دہلوی صاحب گلستانِ سخن جناب نکہت کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں[2]

"اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے کلام حلاوت سے اور طرز نمک سے خالی نہیں ہے معنی بلند ہے اور استعارہ دل فریب۔ الفاظ پاک ہیں اور تشبیہ غریب"

جناب نکہت کا کلام موثر ہے۔ زبان شستہ اور صاف ہے

نمونہ کلام[3]

اچھا ہوا کہ آنکھوں سے خوں ہو کے بہ گیا — مدت سے ایک آفتِ جاں تھی بلائے دل
جھگڑا ہی مٹ چکا تھا فلک کا پہ ضعف سے — اب تک مری پہنچنے نہ پائی صدائے دل
نگہت کی جستجو کی یہ الجھن سے ہے یقیں — آئے کسی طرف سے ہیں اپنا لٹائے دل
رخصت آہی اگر بخشی من بیجد را — می کنم تعلیم افغا نہا صدائے صور را
ظرف می باید کہ در مستی حریف من شوی — این می پر زور از جامی برد منصور را
محتسب در خلوت او دخت رز نابالغ است — گر شکستی شیشہ مشکن دانہ انگور را

چہ باشد گر فتد بر دامن خاکم اے گردوں
بدستِ بادہ دہ یک دم عنانِ اختیار من

۱؎ سخن شعرا ص ۵۳۲ ۲؎ گلستانِ سخن ص ۲۶۱ ۳؎ سراپا سخن ص ۲۶۱